عصری ادب



اختر انصاری اکبرآبادی

عصری ادب

ترتیب

اختر انصاری اکبر آبادی

مرتب .... اختر انصاری اکبر آبادی

طابع .... دبیر پرنٹنگ پریس حیدرآباد سندھ

ناشر

ادارہ نئی قدریں

پوسٹ بکس نمبر ۸۵۰ حیدرآباد سندھ

کتابت .... صابر بن ذوقی

قیمت .... [illegible] روپیہ

(علاوہ محصول ڈاک)

مندرجات

نظمیں

افسانے

غزلیں

انتخاب

نئی قدریں، چھبیس (۲۶) سال سے شایع ہو رہا ہے، ملک کے تمام ہی پرانے اور نئے لکھنے والوں کی نگارشات نئی قدریں، کی زینت ہوئی ہیں، خیال ہوا کہ نئی قدریں، کا انتخاب کتابی صورت میں شایع کیا جائے مگر ایک کتاب میں مکمل انتخاب ممکن ہی نہ تھا، چنانچہ ابتدائی چند سالوں اور ادھر چار پانچ سال کا ایک انتخاب "عصری ادب" کے نام سے پیش کیا جارہا ہے ہماری یہ کوشش اگر مشکور ہوئی اور حالات نے اجازت دی تو درمیانی سالوں کے انتخاب کا کام شروع کر دیا جائے گا اور آیندہ دو تین سال میں

اس کے تکملہ کی کوشش کی جائے گی۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ یہ انتخاب اعلیٰ ترین انتخاب ہے، ہم کسی سخت سے سخت کسوٹی کے حق میں بھی نہیں ہیں ہم نے معروف ترین اور کم معروف لکھنے والوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اس لیے ضروری ہے کہ مستقبل کی خوشگوار توقعات ان کی ذہانت اور ریاضت سے عبارت ہیں ہمیں یقین ہے کہ ہم نے جس جذبۂ خلوص کے ساتھ یہ اقدام کیا ہے اس کی قدر افزائی ہوگی یہ قدر افزائی اور پسندیدگی ہمارے دوسرے اقدام کی محرک ثابت ہو سکتی ہے۔

اختر اللہ زادہ احمد

مجنوں گورکھپوری

حسرت ۔ شخصیت اور شاعری

حسرت موہانی برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسی شخصیت ہیں جو اگر شاعر نہ بھی ہوتے تو بہت بڑی شخصیت ہوتے۔ کئی اعتبار سے ان کی شخصیت بہت بڑی ہے ۔ میں اپنے لڑکپن میں جس باہری شخص سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں وہ حسرت موہانی ہیں۔ حسرت موہانی کا ذکر میں اپنے گھر میں سنا کرتا تھا۔ ان کی سرفروشانہ صداقت ان کے جانباز جذبۂ آزادی کے چرچے میرے گھر میں ہوا ہوا کرتے تھے۔ وہ میرے والد اور میرے ایک چچا کے ساتھی تھے علی گڑھ میں۔ جب میں سنتا تھا تو ایک غائبانہ کشش محسوس کرتا تھا۔ ان کی طرف اس کے بعد جب مجھے ان سے ملنے کا اتفاق

ہوا اور ان کی صورت سیرت اور ان کی شاعری پر غور کرنے کا موقع ملا تو مجھے ایسا احساس ہوا کہ شاید اس کردار اور اس کھری شخصیت کا انسان کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ ذرا غور کیجیے کہ حسرت موہانی کا زمانہ کیا تھا۔ ان کا زمانہ وہ تھا جب کہ برطانوی قیصریت اپنے شباب پر تھی اور آزادی کا نام لینا جرم تھا۔ تعزیراتی جرم تھا۔ لیکن ان کے بیباک طبیعت ان کا آزاد مزاج اور ان کے اندر جو آزادی اور حریت کا جذبہ کام کر رہا تھا وہ نچلے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ ان کے دل اور ان کی زبان میں کوئی منافقت نہیں تھی وہ جو سوچتے تھے جو حق بات سمجھتے تھے۔ اس کا بے دریغ اظہار کرتے تھے۔ شاعری میں ان کی ایک حیثیت یہ تھی۔

حسرت کو شاعری نے نہیں بنایا۔ یہ اور بات ہے کہ حسرت نے اپنی شخصیت اور اپنے مزاج کے اظہار کے لیے ایک ذریعہ شاعری کو بھی بنایا۔ اردو غزل کو بنایا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اردو شاعری میں جدید رجحانات پیدا ہو چکے تھے۔ اور حالی اور آزاد کی سرکردگی میں غزل سے زیادہ نظم نگاری کی طرف نوجوان طبقہ مائل تھا۔ اردو نظم میں مسلسل کوشش ہو رہی تھیں۔ لیکن اردو غزل کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ اس کو جہاں کا تہاں چھوڑ دیا گیا تھا اور کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس میں آیا ترقی کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اس میں بھی کچھ اصلاح کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کو بھی پستی سے نکالا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اردو غزل کو جس نے نئی زندگی دی۔ نئی روح دی اس کا پرانا ناموس جو

واپس لائے۔ وہ حسرت موہانی تھے۔ ان کی شاعری کا آپ مطالعہ کریں تو ان کی شخصیت بہت اجاگر معلوم ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں وہ خصوصیت ہے جس کو انگریزی میں ایک آئیڈن کہا گیا ہے ایک متغزلانہ سپردگی لیکن یہ سپردگی غلامانہ سپردگی نہیں تھی۔ یہ سپردگی خود اپنے اندر بڑی توانائی رکھتی تھی۔ اردو غزل میں اس کی کھوئی معصومیت اور اس کی شرافت واپس لانے والے حسرت موہانی ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ اس کے اندر جوہری توانائی پیدا کرنے والے بھی وہی ہیں۔ ان کے تمام کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ فکری گہرائی میں جاتے ہیں اور نہ وہ اسلوبی تکلفات میں الجھتے ہیں جیسا کہ ان کے دور میں عام طور پر ہو رہا تھا۔ وہ سیدھی بات سیدھے طریقے سے کہہ جاتے تھے اور عشق کے مضامین کے پردے میں انھوں نے ہم کو جو سبق دیا اس کو ہم وائلنٹ قسم کی نان وائلنس کہیں گے۔ برطانوی حکومت یعنی حکومت برطانیہ کے خلاف کوئی شعر ان کا ایسا نہیں ہے جو بیک وقت ایک جابر محبوب اور حکومت برطانیہ کے ایک جابر حاکم پر صادق نہ آتا ہو۔ میرا مقصد اس وقت ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ میں تقریر میں اور تحریر میں ایک سے زائد بار حسرت پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ میں اس وقت ان کی شخصیت سے بحث کرنا چاہتا ہوں اور شخصیت ہی کے سلسلے میں، میں نے شاعری پر اتنا کچھ کہا ہے۔ شاید آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حسرت کی عمر کا بیشتر حصہ یعنی بالغ عمر کا بیشتر حصہ قید فرنگ میں کٹا۔ اور یہ بھی شاید آپ کو معلوم ہو

کہ ان کی بہترین غزلیں قید فرنگ میں کہی گئی ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں ان کا دیوان جو نکلتا تھا اس میں غزلوں پر تاریخ دی ہوتی تھی اور مقام بھی دیا ہوتا تھا کہ کس جگہ کے جیل خانے میں یہ غزل کہی گئی۔ تو وہ چکّی بھی پیستے تھے اور چکّی کی مشقت بھی جاری رکھتے تھے ع

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی

وہ چکّی بھی پیستے جاتے تھے۔ پیٹھ پہ کوڑے بھی کھاتے جاتے تھے اور غزل کے شعر بھی کہتے جاتے تھے۔ میرا دعویٰ یہ ہے کہ حسرت کی شخصیت اور حسرت کی شاعری دونوں کی تربیت میں چکّی کی مشقت اور پیٹھ پر کوڑے کھانے کی اذیت بھی شامل ہے۔ حسرت جیسا کہ میں نے کہا نہایت بیدریغ قسم کے انسان تھے۔ مگر نہایت معصوم قسم کے انسان تھے۔ ان کو ایک دھن تھی اور وہ یہ کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جا سکے۔ وہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ حکومت برطانیہ کو ملک سے نکالنے کے لیے۔ اور یہ دھن آخر عمر تک ان کے اندر کام کرتی رہی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۴ء تک کا نصابی سال تھا۔ حسرت کو علی گڑھ بڑے ارمانوں سے ڈاکٹر ضیاء الدین نے بلایا تھا۔ فتح پور ہسوہ سے جب انھوں نے ہائی اسکول پاس کیا اور آپ لوگوں کو شاید تعجب ہو یہ سن کر کہ حسرت میتھمیٹکس میں ہمیشہ اچھے نمبر لاتے تھے۔ میتھمیٹکس میں وہ بہت تیز تھے۔ تو ڈاکٹر ضیاء الدین جو اس وقت محض ٹیچر تھے۔ انھوں نے بہت خوشامد اور محبت کے ساتھ ان کو بلایا کہ تم آ کر علی گڑھ میں

داخلہ لو۔ اور انہیں ہر طرح کی رعایت دی۔ لیکن یہی سنہ ۱۹۰۳ء سنہ ۱۹۰۴ء کا زمانہ ہے حسرت بی اے فائنل میں تھے۔ مارین پرنسپل تھے۔ مارلن برٹش امپریلزم یعنی برطانوی سامراج کا ایک مجسمہ تھا حسرت کی قابلیت اور فضیلت کے بہت سے لوگ قائل ہو گئے تھے یہاں تک کہ خود سیکریٹری ایم او کالج نواب محسن الملک بھی ان کے قائل تھے۔ اسی زمانے میں اردوئے معلےٰ کا ایک مشاعرہ ہوا۔ یادگار مشاعرہ ـــ یہ ایسی باتیں ہیں جن سے حسرت کے کردار کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اسوقت میر مہدی مجروح جو غالب کے بڑے چہیتے شاگرد تھے۔ بہت بڈھے ہو چکے تھے۔ ان کو بلایا گیا تھا۔ وہ اس مشاعرے میں شامل تھے۔ اور امیر مینائی کے ایک مشہور شاگرد گستاخ رامپوری اس وقت علی گڑھ میں جیلر تھے۔ یہ وہی گستاخ ہیں جن کے بعض اشعار ضرب المثل ہو گئے۔ آدمی بالواسطہ قسم کے تھے۔

"دل ہے گستاخ دلربا گستاخ ایک سے ایک ہے سوا گستاخ

ان کا مشہور شعر ہے۔ ان کا یہ شعر بھی مشہور ہے کہ ؎

نجانے کس نے بگاڑا اسے علی گڑھ میں
کہ رام پور میں گستاخ یوں خراب نہ تھا

گستاخ چنچل قسم کے شاعر تھے۔ امیر مینائی کے شاگرد ہو کر اور بھی چنچل ہو گئے تھے وہ بھی شریک مشاعرہ تھے تو انہوں نے ایک شعر پڑھا ؎

یہ مرض گستاخ ایسا تجھ کو پیدا ہو گیا
جس کی دیکھی اچھی صورت اس پہ شیدا ہو گیا

یہ شعر انھوں نے پڑھا تو حسرت سے جلنے والے بھی یعنی ادبرد جلنے والے نہیں بلکہ بیٹھے پیچھے منافقانہ انداز میں جلنے والے اور مخبری کرنے والے کم نہیں تھے۔ کچھ لوگ پہنچے مارسن کے پاس کہ مشاعرہ میں نہایت گندے اور نہایت پست قسم کے اشعار پڑھے گئے ہیں جو ہماری تہذیب کے خلاف تھے۔ اور یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ ڈیلی گیشن گیا۔ حسرت کے خلاف مارسین کے پاس اس کی امامت ہمارے مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ جو اس وقت خالص قسم کے مسٹر تھے مولانا نہیں ہوئے تھے۔ دوسرے دن حسرت کو بلایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ تمھارا مشاعرہ نہایت گندہ تھا اور اس میں پست معیار کے اشعار سنائے گئے۔ حسرت نے کہا کہ ہم لوگوں کو تو نہیں یاد آتا کہ اس میں کوئی پست شعر سنایا گیا ہو۔ انھوں نے کہا ممکن ہے آپ کے معیار سے وہ اشعار پست رہے ہوں۔ معیاری اخلاق سے، معیاری تہذیب سے ہمارے معیار، تہذیب اور اخلاق سے وہ پست اشعار نہیں تھے۔ اس پر مارسین آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے کہا یہ ممکن ہے کہ دنیا میں اخلاق اور تہذیب کے دو معیار ہوں۔ اور اسی وقت ٹرسٹیز کا ایک ایمرجنسی جلسہ بلایا گیا۔ مارسن نے کہا کہ حسرت کو رسٹیکیٹ کر دیا جائے۔ نکال دیا جائے۔ کسی کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ بڑی مشکل سے نواب محسن الملک نے یہ کہا کہ دیکھیے حسرت کو کالج سے تو ضرور نکال دیجیے لیکن امتحان سے نہ روکیے۔ لہٰذا ان کو نکال دیا

گیا، اور وہ (کرسل وہیں جاکر) چھوٹا سا مکان لیکر رہنے لگے اور انہوں نے وہاں اپنا اردوئے معلّٰی اور پریس بھی قائم کیا۔ اور برابر اسی استقامت کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں وہ اردوئے معلّٰی نکالتے رہے ان کی دوسری حیثیت جو بھولنے والی نہیں ہے اسی سلسلے کی کڑی ہے کہ آج اگر حسرتؔ نہ ہوتے تو تمام متقدمین اور متاخرین کے کلام کا جو انتخاب ہم کو ملتا ہے اردوئے معلّٰی کے ذریعہ وہ آج دفن ہوتا۔ مولوی عبدالحق نے بہت بعد میں اس کام کو شروع کیا۔ حسرتؔ نے بہت پہلے شروع کیا تھا۔ چنانچہ اردوئے معلّٰی کی جلدیں آپ اٹھا کر پڑھیے تو ولی سے لیکر خود ان کے معاصرین تک بیشتر جو صاحب دیوان شعراء ہیں ان کا انتخاب ملے گا۔ یہ دوسری حیثیت تھی۔ تیسری حیثیت میں میں نے بتلایا کہ وہ ایک وطن پرست تھے۔ ایک آزادی کے سودائی تھے۔ اور آزادی کے لیے ہر مناسب اور نامناسب طریقہ اختیار کرنا وہ جائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ کانگریس کے ممبر وہ اسی لیے ہوئے تھے تلک سے وہ بہت مرعوب تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم ان کی ہر بات سے اتفاق کریں۔ تلک سے وہ مرعوب تھے۔ لیکن ایک بات پر مولانا کی توجہ نہیں گئی۔ ادھر کانگریس کے جلسے ہونے لگے اُدھر اسی زمانے میں اسی سلسلے میں گنپت پوجا شروع ہوئی، شیواجی کا دن منایا جانے لگا۔ ایک میلہ ہونے لگا جس کا نام ہندو میلہ تھا لیکن عام میلہ نہیں۔ تو مسلمان جو کانگریس میں نہیں گیا اس کے اور بہت سے اسباب ہیں لیکن ایک سبب

یہ بھی ہاہے کہ شیواجی کا نہایت ٹکلیجی پرابلم ہے۔ ہسٹری میں اسی کو اٹھادیا۔ دوبارہ زندہ کردیا۔ ان لوگوں نے خیر تو یہ تھی بات تھی مگر تلک کو وہ اپنا استاد مانتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ۱۹۰۷ء میں جو کانگریس کا اجلاس ہوا ہے۔ تو اس وقت بڑا شدید اختلاف ہوا۔

انتہاپسندوں میں اور اعتدال پسندوں میں۔ یعنی فیروز شاہ مہتہ کا گروپ تھا۔ جو اعتدال پسند تھا۔ تلک اروند گھوش اور لالہ لاجپت رائے وغیرہ ان لوگوں کا گروپ جو شدت پسند تھا۔ انتہاپسند تھا۔ ہندوؤں میں سخت اختلاف ہوا۔ یہاں تک کہ یہ لوگ بالکل الگ ہوگئے اور پھر ۱۹۱۶ء میں ایک ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ٹیسٹ موومنٹ چل رہی تھی اور اس میں چار آدمیوں کے نام تھے۔ سرفہرست تلک، اروند گھوش، لالہ لاجپت رائے اور مولانا حسرت موہانی۔

جب اروند گھوش پانڈیچری چلے گئے تو حسرت تیسرے نمبر پر تھے۔ آپ کو یہ سن کر لطف آئے گا کہ جب ایک جگہ کی پولیس دوسری جگہ کی پولیس کو ان لوگوں کی حرکات و سکنات کی اطلاع دیتی تھی کہ یہ تمھارے حلقے میں گئے ہیں۔ تو نام نہیں لیتے تھے۔ نمبر ا پہنچا ہے تمھارے وہاں، نمبر ۲ پہنچا ہے، نمبر ۳ پہنچا ہے۔ تو حسرت نمبر ۳ کہلاتے تھے۔ حسرت حسرت نہیں کہلاتے تھے۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں یا سی آئی ڈی کے ڈپارٹمنٹ میں۔ اس سے اندازہ کرلیجیے کہ وہ کیسی سچی طبیعت رکھتے تھے۔ کیسی

جانبازانہ طبیعت رکھتے تھے - وہی جانبازانہ لہجہ وہی والہانہ لہجہ ان کی غزلوں میں ہے - تو ایک طرف تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باغی تھے لیکن دوسری ہم کو حیرت ہوتی ہے - کہ وہ بہت بڑے مقلّد معلوم ہوتے ہیں - تقلید پرست معلوم ہوتے ہیں - مثلاً وہ نماز، روزے کے سخت پابند تھے - ہر سال حج کرنے جاتے تھے - مگر اس میں بھی جابجا اجتہاد تھا -

نماز کی صف کھڑی ہوتی تھی تو ایک رکعت تکبیر سے لیکر اور سلام تک، جتنی دیر میں کوئی پڑھتا تھا تو اتنی دیر میں مولانا پوری نماز پڑھ ڈالتے اور چلے آتے تھے - یہ کئی بار دیکھا گیا - اور مولانا سے پوچھا گیا کہ یہ آپ کیا کرتے ہیں کس طرح سے نماز پڑھتے ہیں - تو انھوں نے کہا کہ بھئی ابجد کے قاعدے سے، ہم لوگوں نے بسم اللہ کے ۷۸۶ اعداد نکال لیے ہیں - ہم نے یہ کیا ہے کہ جتنی دعائیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں ان سب کے ابجد کے قاعدے سے اعداد نکال لیے ہیں انھیں کو پڑھ دیتا ہوں - اور میری نماز پوری ہو جاتی ہے - دوسرے یہ کہ وہ خود کہتے تھے کہ میں حنفی المذہب ہوں اور قادری المشرب اور میرا مسلک تصوّف :- یہ ان کا قول تھا - یہ خود ان کے لکھے ہوئے الفاظ ہیں - تو حنفی مذہب رکھتے تھے - صوفی تھے - لیکن قادری المشرب بھی تھے اور مولانا عبدالرزاق فرنگی محلی کے ہاتھ پر بیعت کیے ہوئے تھے تو ایک طرف یہ روایت کا احترام اور دوسری طرف یہ بغاوت کی لگن - یہ بغاوت کا جذبہ اور یہی نہیں بلکہ بغاوت اور روایت تقلید اور اجتہاد کے درمیان وہ ایک بار بھی ایک آہنگ پیدا کیے ہوئے تھے - مولانا کا سیاست میں پہلا جذبہ یہ تھا کہ

انگریز کو نکالو ـــــ انگریز نکل جائے تو خلق اللہ اور ملک کے بندگانِ خدا کی بھلائی کی تدبیریں سوچو یہ ان کا جذبہ تھا۔ تو غالباً ۱۹۳۷ء میں یا ۱۹۳۶ء میں وہ حج کو جب گئے تو مسلم لیگ کے ممبر ہو چکے تھے۔ پہلے بھی وہ دونوں پلیٹ فارموں سے تقریریں کرتے تھے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھی اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے بھی۔

لیکن ۳۸ء میں وہ باقاعدہ ممبر ہو چکے تھے۔ مسلم لیگ کے۔ تو حج کرنے گئے۔ عین حرم میں ہمارے برصغیر کا بہت بڑا برطانوی حکومت سے باغی جو جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ عبیداللہ سندھی ۔ یہ حرم میں ملے۔ اور بغیر کچھ کہے سنے حسرت کا گلا دبا دیا اور کہنے لگے۔ عین حرم میں تمھارا خون کروں گا۔ تم اپنے مسلک سے ہٹے کیوں؟ تم اپنے راستے سے ہٹے کیوں؟ انھوں نے کہا "یار گلا چھوڑ اور بات سن" تو خیر انھوں نے گلا چھوڑ دیا۔ اور کہا "کہو کیا کہتے ہو"؟ تو انھوں نے کہا "دیکھو بھائی ہم راستے سے ہٹے ہوئے نہیں۔ شیر اپنے راستے پر چلا جا رہا ہے۔ اب اس کے راستے پر کچھ لوگ آجائیں تو ہم روکتے نہیں اور نہیں آئے تو وہ اپنے راستے جائے۔ شیر نے اپنا راستہ نہیں چھوڑا

تو اس طرح سے ان کی جان چھوٹی ہیں نے کہا ہے کہ وہ نان وائلنس کے قائل تھے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ حکومت برطانیہ کو جتنا ستا سکو ستاؤ اس کے علاوہ ان کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

فراق گھورکھپوری

کچھ پریم چند کے بارے میں

ٹالسٹائی کی یاد میں لینن نے کہا تھا کہ اُن کی تصانیف انقلاب رُوس کی قوتوں اور کمزوریوں کا آئینہ ہیں۔ جب پریم چند کی تصانیف روس میں پہنچیں تو وہاں کے ایک بڑے نقاد نے لینن کے مندرجہ بالا قول کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح انقلاب روس کی قوتوں اور کمزوریوں کا آئینہ ٹالسٹائی کی تصانیف ہیں اسی طرح انقلاب ہند کی توانائیوں اور کمزوریوں کا آئینہ پریم چند کی تصنیفیں ہیں۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں جب اس سرزمین پر پہلی جنگ آزادی لڑی گئی تو ہمیں اس جنگ میں شکست ہوئی۔ لیکن اسی وقت سے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ یا دورِ بیداری بھی شروع ہوگیا بنکم چندر چٹرجی کے ناول، ٹیگور کی تصنیفیں

بنگال کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کی تصنیفیں، راجہ رام موہن کی تحریک اور مان کی تحریریں، سوامی دیویکانند کے کارنامے، سرسید حالی، شبلی، اکبر، چکبست کے علمی اور ادبی کارنامے، اقبال کی شاعری کی پکار اور للکار، ۱۸۵۷ء کے آگے پیچھے صدہا اردو تحریریں، بہادر شاہ ظفر کی غم انگیز غزل گوئی ہندوستان کے نئے شعور زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اسی فضا میں پریم چند کی آواز ابھرتی ہے۔ تہذیبی اور ذہنی طور پہ ہاری ہوئی جنگ آزادی کے بعد اس دوسری جنگ آزادی کی تیاری منظم طور پر شروع ہو جاتی ہے۔ جو ۱۹۴۷ء میں کامیاب ہوئی۔ اس ذہنی اور تہذیبی انقلاب کی تنظیم اور تیاری میں پریم چند کے ادب کی اہمیت قدر اول کی چیز ہے۔ پریم چند نے اپنی تصنیفوں میں ہماری سیاسی اور سماجی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچی ہیں اس کشمکش میں ہماری قومی جدوجہد کی توانائیاں بھی نظر آتی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ ہندوستان جو کچھ ہونا یا کرنا چاہتا تھا اس کو صرف آدھا سمجھتا تھا اور آدھا نہیں سمجھتا تھا۔ پریم چند کی تصنیفیں اسی یقین اور اسی شبہے کی عکاسی کرتی ہیں۔ آج بھی ہندوستان یقین اور شک، توانائی اور کمزوری کے دور سے گزر رہا ہے۔ ہماری تاریخ کی غیبی مصلحت روس اور چین کے انقلابوں سے ہمارے انقلاب کو مختلف رکھنا چاہتی ہے۔ ہم قومی اور بین الاقوامی لحاظوں سے امیدوں اور خطروں کے ایک دور سے گزر رہے ہیں۔ انہیں امیدوں اور خطروں کے دور سے پریم چند کی تصنیفیں بھی گزرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ یقین اور تشکیک سے پریم چند کی ہر اہم تصنیف مرکب ہے مسائل کے پیش کرنے میں سارے ہندوستان میں پریم چند اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

لیکن مسائل کا حل، سوالوں کا جواب وہ اپنی تصنیفوں میں پیش نہیں کر پاتے۔ یہ حل اور یہ جواب ہمارے قومی شعور کو آہستہ آہستہ حاصل ہوگا۔ پریم چند دوسری جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے مر چکے تھے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو قومی شعور کو نئی روشنی دیتے اور قومی زندگی کو صاف اور شفاف طریقے پر ایکس رے کرتے۔ لیکن اپنے دور میں قومی شعور کو جہاں تک وہ پہنچا گئے تھے وہ ایک اہم ترین تاریخی کارنامہ ہے۔

اس بحث کو زیادہ طول نہ دیکر اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ خود میرے ذہن پر پریم چند اور ان کی تصنیفیں پہلے پہل کس طرح اثر انداز ہوئیں۔

غالباً سنہ ۱۹۱۰ء کا زمانہ تھا۔

جاڑوں کے دن تھے۔ ہمارے یہاں گھر پر "زمانہ" کا نیا شمارہ آیا تھا جو بزرگوں کے دیکھنے کے بعد میرے ہاتھ بھی لگا۔ اس میں پریم چند کی ایک کہانی چھپی تھی "بڑے گھر کی بیٹی" جیسے جیسے وہ کہانی میں پڑھتا گیا میرے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی رفتار بڑھتی گئی اور میری پلکیں بھیگتی گئیں پریم چند سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ آج تک کسی کہانی کا وہ اثر مجھ پر نہ ہوا جیسا کہ اس کہانی کا ہوا تھا۔ اس کے بعد "زمانہ" میں قریب قریب ہر ماہ پریم چند کی کہانی چھپتی اور میں اسے کلیجے سے لگا کر پڑھتا۔ ہر ماہ پریم چند کی نئی کہانی کا زمانہ میں چھپنا ادبی دنیا کا ایک واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ کہانیاں لڑکے لڑکیوں سب کو متاثر کرتی تھیں۔ پریم چند کے قلم کی موہنی لاکھوں دلوں کو موہ لیتی تھی۔ مولانا شبلی جیسا جید عالم اور اہل نظر ان کہانیوں کو پڑھ کر آبدیدہ ہو جاتا تھا اور کہہ اٹھتا تھا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا جادو نگار

نہیں لوگ سوچتے تھے کہ پریم چند آدمی ہے یا دیوتا۔

کچھ سال بیت گئے۔ میں امتحان پاس کرتا کراتا اب بی لے میں آچکا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں الہ آباد سے اپنے وطن گورکھپور گیا۔ ایکدن شام کو گورکھپور میں ایک بڑے بنک کی بلڈنگ میں سیر کرنے نکل گیا۔ وہاں میرے ایک دوست مہابیر پرشاد پوردار ملے جن کے ساتھ ایک اور صاحب تھے اور بظاہر ایک نہایت معمولی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ گھٹنوں سے کچھ ہی نیچے تک معمولی دھوتی اور عام کرتوں سے بہت چھوٹا کٹا ہوا کرتا اور پاؤں میں معمولی جوتا پہنے ہوئے تھے۔ میں پوردار سے کچھ نئی کتابوں کے متعلق باتیں کرنے لگا ان کے ساتھی بھی باتوں میں شریک ہو گئے اور بات پریم چند کی آپڑی۔ پوردار نے مجھ سے پوچھا کہ پریم چند سے ملنا چاہتے ہو؟ گویا وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں ..... کہ دنیا بھر کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ اپنی اس خوش قسمتی کا یقین ہی نہیں آتا تھا کہ پریم چند کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا۔ میں نے ان کے سوال کا بالکل یقین نہ کرنے کے لہجہ میں پوچھا۔ پریم چند سے ملنا کیسے؟ کہاں اور کب؟ دونوں آدمی ہنسنے لگے اور پوردار نے بتایا کہ ان کے ساتھ جو صاحب ہیں یہی پریم چند ہیں میری سانس اندر کی اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ بلکہ انتہائی خوشی کے ساتھ میری دل شکنی بھی ہوئی اس لیے کہ پریم چند بہت معمولی شکل و صورت کے آدمی نظر آئے۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ اتنا بڑا افنکار معمولی شکل و صورت کا ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر بھی مجھے بیحد خوشی ہوئی اور یہ جان کر تو میں جھوم گیا کہ پریم چند گورکھپور میں میرے مکان سے آدھے فرلانگ پر نارمل اسکول کے ایک بنگلے میں مستقل طور پر رہیں گے ہم دونوں زود

آشنا مزاج کے تھے۔ جلد ہی تیسرے پہر پریم چند کے یہاں جانا میرا معمول ہو گیا۔ وہ وہاں نارمل اسکول میں سکنڈ ماسٹر اور بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اپنے چھوٹے سے بنگلہ کے صحن میں کچھ درختوں کے سایے میں کچھ کرسیاں ڈال لیتے تھے۔ ہماری گفتگو کا موضوع شعر و ادب، فلسفہ، کتابیں اور کتابوں کے مصنف ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ واقعات اور ان لوگوں کے تذکرے چھڑ جاتے تھے جو کسی لحاظ سے دلچسپ قابل توجہ یا نتیجہ خیز ہوتے تھے۔ ایسے بھی مواقع آجاتے تھے جب وہ اپنے بچپن کا حال یا اپنے خاندان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس طرح ان کی پوری سوانح عمری شدہ شدہ میرے سامنے آگئی۔ ان کی باتوں میں بڑی سادگی، بڑی معصومی، بڑی بے تکلفی ہوتی تھی۔

ایسی ہی باتوں کے درمیان انھوں نے بتایا کہ ان کے زمانۂ طفلی میں، جب ان کے والد ڈاک خانے کی ملازمت کے سلسلے سے گورکھپور ہی میں تھے تو اسکول میں پریم چند کی دوستی ایک تمباکو فروش کے لڑکے سے ہو گئی تھی۔ اسکول سے واپسی پر وہ اکثر اس کے ساتھ اس کے گھر جاتے تھے وہاں بزرگوں میں حقے کے کش جاری رہتے تھے اور طلسم ہوشربا روزانہ پڑھا جاتا تھا طلسم ہوش رُبا سنتے سنتے بچپن ہی میں پریم چند کی سوئی ہوئی خیالی دنیا جاگ اٹھی جیسے بچپن میں الف لیلیٰ پڑھ کر ڈکنس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوئی تھیں۔ پھر اُردو نثر کی روانی اور سلاست پریم چند کے اندر گرج اٹھی۔

پریم چند کا بچپن بڑے افلاس اور تنگدستی میں گزرا۔ باپ کی

مختصر سی تنخواہ اور پھر سوتیلی ماں۔ تیرہ چودہ سال کی عمر میں چار پانچ روپے کی ٹیوشن کے لیے تین میل آتا اور تین میل واپس جانا پڑتا تھا۔ ایک بار گھر ایسا ملا کہ اسی گھر کے اصطبل میں سائیس کے ساتھ رہنا پڑتا تھا سیکڑوں ایسے مواقع آتے کہ ایک پیسے کے چنے بھنا کر اسی کو کھا کر دن کاٹ دیا۔ اسی زمانے میں ایک ہیڈ ماسٹر نے انہیں ہونہار دیکھ کر سہولتیں پہنچائیں۔ اسی طرح وہ انٹرنس پاس کر سکے۔ کسی اسکول میں بیس بائیس روپے کے ٹیچر ہو گئے۔ ان کے والد نے اسی زمانے میں ان کی شادی بھی کر دی تھی۔ ایسی شادی کہ دو چار ہفتوں کے اندر بیوی سے جدا ہو جانا پڑا اس کس مپرسی کے عالم میں باپ بھی چل بسے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائیوں کا بوجھ بھی انھیں پر آن پڑا۔ غرض کہ دس بارہ برس کی عمر سے اندازاً تقریباً بائیس برس کی عمر تک جتنی تلخ زندگی پریم چند کی تھی اردو یا کسی زبان کے کسی ادیب کی زندگی شاید ہی اتنی تلخ رہی ہو۔ ہم آپ تو شاید اس امتحان میں مٹ کر رہ جاتے اسی دوران میں پریم چند نے پرائیویٹ طور پہ ایف اے، بی اے اور بی ٹی کے امتحانات پاس کیے اور محکمہ تعلیم میں انھیں سرکاری ملازمت مل گئی۔ وہی زمانہ ان کی اُن امر تصنیفوں کے آغاز کا زمانہ ہے جنہیں لاکھوں آدمی کلیجے سے لگائے پھرتے ہیں۔ پریم چند اپنی اردو تصنیفوں کو ہندی میں بھی شائع کرانے لگے تھے۔ لیکن اسے اردو زبان کا جادو نہ کہیں تو کیا کہیں کہ ہندی میں ان کی پہلی کتاب ابھی چھپی ہی تھی کہ وہ ہندی کے سب سے بڑے ادیب مان لیے گئے۔

اگر وہ اردو نہ جانتے ہوتے بلکہ صرف جانتے ہوتے تو اتنی

شاندار اور رچی بسی زبان کبھی نہ لکھ پاتے یہ زمانہ لگ بھگ قریب ۱۹۱۹ء کا ہے۔ اسی زمانے میں میں آئی۔ سی۔ ایس کی ملازمت چھوڑ دی اور پریم چند نے بھی جن کی ملازمت ایک ہزار ماہانہ تنخواہ تک جاتی ہے ساتھ ہی ترک کر دی۔ ترک موالات کی تحریک کے سلسلے میں اس کے بعد وہ پندرہ سولہ سال اور زندہ رہے اس عرصے میں اندازاً دس ناول اور ڈھائی سو افسانے ان کے قلم سے تخلیق ہوئے۔ مجھے بھی ایک لحاظ سے پریم چند نے ہی مصنف بنایا۔ میرا پہلا مضمون "زمانہ" میں پریم چند نے ہی بھجوایا تھا اور جب میں سیاسی قیدی تھا تو میری کچھ کہانیاں پریم چند نے ہی مشہور رسالوں میں شائع کرائیں تھیں۔ جیل ہی میں میں نے ان کے ناول گوشۂ عافیت پر تبصرہ لکھا تھا جسے پاکر انھوں نے مجھے لکھا کہ ناول پر آپ کا تبصرہ پڑھ کر روح پھڑک گئی۔ آپ نے میرے ناول کو مجھ سے بہتر سمجھا۔

ادب جو درباروں اور رئیسوں کی محفلوں کا چونچلا تھا اسے پریم چند نے کروڑوں بیگھے لہلہاتے کھیتوں اور کسانوں کی جھونپڑیوں میں لا کھڑا کیا۔ ہماری ہزار ہا سال کی تہذیب میں ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی مصوری ایسی حساس نباضی ایسی بصیرت افروز ترجمانی ہندوستان کے کسی ادیب نے نہیں کی تھی۔ پریم چند اردو ادب کی تاریخ میں اس زمانے کے مصنف نہیں تھے جب پونے دو استاد زباں دان لیے جاتے تھے سیکڑوں چھٹ بھیوں کے بیچ میں پریم چند کا وہ زمانہ ہے جب آسمان ادب پر ٹیگور

شرت چندر، چیرجی، اقبال، چکبست، حالی، شبلی، حسرت موہانی جیسے آفتاب و ماہتاب جگمگا رہے تھے۔ پریم چند ہندی و اردو کے تنہا ادیب تھے جن کی تصنیفیں اونچے سے اونچے دماغوں والوں سے لیکر چپراسی، مزدور کسان، شہری دیہاتی، مرد، عورت، بچے، سبھی یکساں اثر لیکر پڑھتے تھے۔ پریم چند کی کتابوں کو پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مادرِ ہند نے گویا ہمیں اپنی گود میں اٹھالیا ہے ہم پریم چند کی آواز میں اپنے دل کی دھڑکن سنتے ہیں۔ ہندوستان کی ہنسی، دکھ، سکھ، اس کی تقدیر، اس کا سہاگ سب کچھ پریم چند کے جادو بھرے صفحات میں ہمیں ملتا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

کاغذی پیرہن

خلیل اعظمی کی نظموں اور غزلوں کا ایک مجموعہ "کاغذی پیرہن" بہت دنوں سے اس انتظار میں میرے پاس پڑا تھا۔ کہ میں اس کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کروں۔ مگر ان کا گریبان چاک کرنے کے لیے فرصت نہ ملی۔ تا آنکہ اختر انصاری اکبر آبادی کے تقاضائے مبرم نے سخت مجبور کیا کہ میں ان کے رسالے کے شاعر نمبر کے لیے کچھ لکھوں اور بہت جلد لکھوں ۔۔ یہ بہت جلد کی تعزیر اس معاملے میں ہی نہیں ہر معاملے میں میرے لیے پریشان کن ہوتی ہے۔ خیر آخر ان کی شکایتوں ۔۔ اور انجام کار دھمکیوں سے تنگ آکر یا خائف ہو کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں کاغذی پیرہن میں چھپے ہوئے تصویری پیکروں پہ ہی نظر ڈالنے کی کچھ کوشش کر دوں ۔۔ یہ کیوں؟

اس لیے کہ میں ان تصویری پیکروں سے خاصا مانوس ہوں۔ اور ان کے خط و خال سے میری نگاہیں اس حد تک ضرور آشنا ہیں کہ میں نہایت مختصر وقت میں جو اختر انصاری اکبر آبادی صاحب نے مجھے دیا ہے آشنایانہ رنگ کی کچھ باتیں کہہ سکوں گا۔

خلیل اعظمی کا، کاغذی پیرہن تو خیر سال کراب آیا ہے، میں تو اس سے بہت پہلے اعظمی کو ان کی چند ایسی نظموں اور غزلوں کی وجہ سے جانتا تھا۔ جن کی دو باتیں مجھے اکثر متوجہ کرتی رہیں۔ اول میر کے انداز دوم بعض نظموں کی نئی نئی اجنبی سی مگر متوجہ کر دینے والی آواز جو یہ سمجھاتی تھی رکہ یہ کوئی ایسا شاعر پیدا ہو رہا ہے جو کچھ نئی نئی باتیں کہنا چاہتا ہے۔ اور اس کے لیے نئے انداز تلاش کر رہا ہے۔ یہ انداز ایسا تھا جو نئے دور کے مشہور شاعروں کے انداز سے کچھ کچھ الگ الگ سا معلوم ہوتا تھا۔ بعض جگہ آواز پھٹی پھٹی تھی۔ مگر اس میں بھی کچھ لہریں ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ جو جذبے کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔

اعظمی کی وہ نظم جس نے مجھے خاص طور سے متوجہ کیا وہ تھی جس کا عنوان ہے۔ "گنج محبت" میں اس نظم کے آخری شعر کو مدتوں گنگناتا رہا۔ بلکہ جذباتی حوادث کے پرشور لمحات میں اب تک گنگناتا ہوں۔

جو گنج محبت میں پیڑوں کی چھنتی ہوئی چاندنی کی زباں سے کہتا

کہو آج کی رات کیسے گزاری؟ کوئی آج کی رات ملنے بھی آیا؟

تنقید کی معلوم نہیں کیا رائے ہے۔ مگر میرے تاثر کو یہ شعر ہمیشہ اچھا لگا۔ جانے اس شعر میں کس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کہ

مدھ کر دل کے کان اس کو سن کر بے اختیار متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بہرصورت یہی وہ نظم ہے جس نے اعظمی کے مضامین کے بعد خاص طور سے مجھے ان کے شعر سے روشناس کیا اور میں نے انہیں اپنے شاعروں کی فہرست میں شامل کر لیا۔

یہ تو خیر ہوئی بات میرے تاثر کی ؛ مگر نقد و نظر کا مطالبہ یہ ہے کہ کنج محبت کی خلوتوں میں چھپی ہوئی لطافتوں کی کچھ تشریح بھی ضروری ہے، ورنہ یہ تمام حکایت ایک ذاتی تاثر کی حد پر پہنچ کر ختم ہو جائے گی۔

نظم کے متعلق میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اس میں بنیادی طور پر تین چار چیزیں ضرور ہونی چاہئیں۔ اول یہ کہ بہ حیثیت مجموعی نظم میں سے کوئی واحد مرکزی تجربہ یا جذبہ پڑھنے والا ہر شعر سے یا ہر مصرعہ سے الگ الگ لطف نہ بھی اٹھا سکے تب بھی پوری نظم میں سے کوئی نظم پڑھنے کے بعد تجربے کی شکل میں اس کے سامنے پوری طرح آجائے۔ دوسری چیز نظم میں، غزل کے برعکس ایسی ایمجری ہے جو تجربے کی فضا کو زیادہ سے زیادہ محسوس پیکروں کے ذریعہ خیال کے لیے متشکل کر سکے جو نظم محسوس پیکر نہیں ابھارتی اور جذبے کی مجرد صورتوں کو ابھارتی رہتی ہے۔ یا ذہنیات تک اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے۔ یہ خود کلامی کے استدلالی تار و پود تک منحصر رہتی ہے۔ وہ موثر ثابت نہیں ہوتی۔

ازبسکہ نظم، غزل یا ایمائی شاعری سے مختلف حدود و فرائض رکھتی ہے اس لیے ایما اور اشارات کی بجائے نظم میں ماحول کے جزئیات کا مرقع ضرور آنا چاہیے۔ ورنہ تجربہ مجرد خیال کی قیود

میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔

کنج محبت ایک مقفیٰ نظم ہے اس میں بعض خاص لمحات سے پیدا شدہ تاثرات کی تصویر کشی کی گئی ہے اور محسوس پیکروں سے ایسی فضا تیار کی گئی ہے جس نے شاعر کے تجربے کو زندہ و پائندہ بنا دیا ہے اور ایک ایسی دنیا سے قاری کو روشناس کر دیا ہے جو قاری کے ذاتی تجربے سے متعلق نہ ہونے کے باوجود گویا اس کا ذاتی تجربہ ہی بن گیا ہے۔

یہ سنسان راتیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں، ان میں چپ چاپ پیڑ۔ یہ غسم کے سائے۔ ان میں کسی کی یادوں کی پھیلی ہوئی خوشبو۔ ان میں محبت کی کسک اور محبت کے جادو۔

اس تمہید کی باتیں خیالی پیکروں کا ایک سلسلہ ہے جو ہر نئے شعر میں ایک نیا تماشا چشم خیال کو دکھایا جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر کے تجربے کی گہرائی ہے مگر اسی قدر اس میں امیجری کی رنگین صنعت گری بھی جلوے بکھیر رہی ہے ۔ اور آخر میں ان پر اسرار فضاؤں سے ایک ایسی آواز بھی اٹھی ہے جو شوق کی بے کراں وسعتوں میں یوں پھیل جاتی ہے گویا یہ ہر جذبۂ دلی کی ترجمان ہے!

اعظمی کی نظم "نذرانے" ۔ اور "میرے اداس دل نہ رو" "آدمیوں کے میلے" اور "آپ بیتی" بھی شاعر کے گہرے احساسات کرب کی آئینہ دار ہے۔ مگر ان نظموں میں ذہنی استدلال اور خود کلامی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ جو ڈراماتی نظموں میں کرداروں کے نقوش باطن تیار کرنے کے لیے مفید ہوتا ہے۔ مگر شخصی تجربات کی عکاسی میں نظم کو بے مزہ بنا دیتا ہے اور فضا پھیکی پڑ جاتی ہے۔

میں شروع میں کہہ چکا ہوں۔ کہ اعظمی کی بعض نظموں میں شاعر کی آواز بھٹی بھٹی ہے۔ شاعر اپنے تجربے سے دست گریباں ہے۔ ذہنی احساس کی محض بیانیہ نگاری کر رہا ہے۔ خیال کا بے ربط یا غیر مربوط سلسلہ ہے جو ہوا کی لہروں پر کبھی نظم و ربط سے کبھی نظم و نظام ہر سو تیرتا نظر آتا ہے ۔ ان نظموں میں شعر کی روح جلوہ گر نہیں ہوئی۔ منظوم بیانیہ نگاری معلوم ہوتی ہے۔ بن لکھی کہانی پڑھ کر شاعر سے اس کی مسافرت کی وجہ سے ہمدردی ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مگر شاعر کے تجربے میں قاری بے اختیار ہو کر شریک ہو جانا نہیں چاہتا۔ اپنی تصویر سے "کاغذی پیرہن" اور دوری کو پڑھ کر کچھ ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے ان کو نظم کرنے سے پہلے کوئی سخت کربناک جذباتی حادثہ دیکھا ہے۔ اس کی تکلیف ان نظموں کے انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان شعلوں کی پوری آگ قاری تک نہیں پہنچتی۔ قاری کے نزدیک احساس کے یہ دعوے بے دلیل ہی رہ جاتے ہیں۔ کیوں کہ آگ کے شعلوں کی پکار تو زیادہ ہے۔ مگر قاری کو معمولی دھوئیں سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا۔

ان نظموں میں اعظمی کی نارسائی کے اسباب پر میں نے بہت غور کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اعظمی اپنے تجربات کے اظہار میں بعض اوقات عجلت سے کام لیتے ہیں۔ ہر تجربہ نہ اظہار کا مقتضی ہوتا ہے نہ اظہار کا متمنی ہوتا ہے۔ تجربات بھی بعض اور چیزوں کی طرح پختگی چاہتے ہیں۔ وہ جو ورڈز ورتھ نے concentrated in tranquility کی شرط لگائی تھی۔ وہ بے محل نہ تھی۔

تجربہ جب تک صبر و تحمل اور انتظار و سکون کی بھٹی میں پختہ نہ ہو جائے۔ اس میں آب و تاب اور رنگ و روغن نمودار نہیں ہوتا۔ تجربات کی بیانیہ نگاری شاعری کا ایک حصّہ ہے۔ پوری شاعری تجربات کی پختگی اور محکمی کا نام ہے جو دل کی گہرائیوں میں مدتوں تک تخلیق کے لیے خیال کو آمادہ اور تیار کرتی رہتی ہے۔ اسی لیے اعظمی کے تجربات ان نظموں میں جذبے سے پیدا شدہ ذہنی استدلات کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال "نیا جنم" ہے؟

مگر ایک خاص بات ان نظموں میں یہ بھی ہے۔ کہ شاعر کسی نئے دیس کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے لیے گویا پھڑپھڑا رہا ہے۔ وہ نئے راستوں اور نئے اسلوبوں کی تلاش میں ہے۔ اس کی اس آویزش پر میرا دل خاصا دکھتا ہے۔ اس کے اس خلوص کے لیے شاعری کی روح بھی اس کی طرف کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شاعری کے نئے پھول اگانے کے لیے کچھ ایسے خاکے تیار کر رہا ہے جن میں نئے شعر کے پھول چمن در چمن لگیں گے۔

اعظمی کی شاعری کا دوسرا رُخ میرؔ کے دیوان کی طرف ہے۔! غزل یا نظم؟؟ کیونکہ میں تو اب کچھ اس خیال کا ہوتا جاتا ہوں کہ میرؔ کا تجربۂ شاعری کچھ ایسا تھا۔ کہ اس کی غزل نظم سے اور نظم غزل سے ہمرشتہ معلوم ہوتی ہے۔۔۔! اور میرؔ کے تتبع کی جتنی کوشش ہو رہی ہیں۔ ان میں شاید ابن انشاء اور اعظمی ہی تو وہ دو آدمی ہیں جو میرؔ کے لہجے کا کچھ حصّہ اپنے اشعار میں جذب کر سکے

ہیں۔ اور بعض اوقات تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ یہ ابنِ انشاء اور یہ خلیل اعظمی ہر طرف ہاتھ پاؤں مار کر۔ اور سولہ آنے "نئے شاعر" بننے کی سعی لاحاصل کر کے اپنا بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ یہ دونوں صاحب پکے میرؔ ہی کیوں نہیں بن جاتے۔ کیوں کہ ان کے مزاج میں میرؔ کی طبیعت کی کچھ خصلتیں مجھے ضرور نظر آتی ہیں ؎

خوار ہوئے بدنام ہوئے بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے
تجھ سے کم کم واقف تھے تو روز کا ملنا ہوتا تھا
تجھ کو جانا، تجھکو چاہا، وقفِ شبِ دیجور ہوئے

گلی گلی کی ٹھوکر کھاتی کب سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں کس کو چاہ کے ارماں ہیں

یہ ساری غزل میرؔ کے عکس کی حامل ہے۔ مگر معاملہ پھر وہیں آپہنچتا ہے۔ یعنی یہ کہ میرؔ کے قلم کی رو پر یہ جو دستبرد بلکہ یلغار سی ہو رہی ہے اس کے لیے میرؔ کا سا دل بھی تو چاہیے۔ عجلت تو ہر معاملے میں بری ہے، اور شعری تجربے میں تو عجلت بڑی ہی خطرناک شے ہے۔ اعظمی اردو کے اچھے نقادوں میں شامل ہیں (اگرچہ ان کی اپنی رائے یہ ہے کہ وہ تنقید کے آدمی نہیں شاعری کے آدمی ہیں) سو اگر ان کی رائے یہی ہے۔ تو میرا ان کو مشورہ یہ ہے کہ وہ بس میرؔ کے ہو رہیں۔ کیونکہ یہ راستہ وہ ہے جو میرے اپنے خیال میں ان کی اپنی اصل منزل کی

رہنمائی کرتا ہے -اور یہ ان کی نظم نگاری کے لیے مفید بھی ہے اور اس کے عیوب کو ڈھانکنے والا بھی-!

میں نے اس مطالعہ میں مروجہ تنقیدی رنگ دانستہ اختیار نہیں کیا یعنی ان کے شخصی تجربات اور سماجی تحرکات کی بحث، عرفان نفس اور احتساب نفس، ہمہ گیر انسانی اقدار- یہ اور وہ - غرض اونچی اونچی باتیں ــــ میں نے اس سے احتراز کیا ہے کیوں کہ مجھے اعظمی کی شاعری کی طرح اس کی ذات سے بھی دلچسپی ہے اس لیے میں نے اس تبصرہ میں بے تکلف سا رنگ اختیار کیا ہے- میں نے ان کی شاعری کو اردو کی اعلیٰ شاعری کے نقطۂ نظر سے ناپنے کی کوشش کی ہے- تاکہ میں یہ جان سکوں کہ اردو کی بلند شاعری میں وہ کہاں کھڑے ہیں-!

اسی جذبے سے میں یہ کہتا ہوں کہ اعظمی کی جگہ کاوی کو کاغذی پیراہن تک محدود نہیں رہنا چاہیے، ابھی ان کے جذباتی نقوش کو اور بھی فریادی بننے کی ضرورت ہے

وقار عظیم

حسرت کی غزل

کوئی حسرت کی ذات اور اس ذات کے رنگ و بو میں ڈوبی اور بسی ہوئی غزل کا تجزیہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو حسرت کا مشق سخن اور چکی کی مشقت والا شعر چیلنج بن کر سامنے آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طرفہ تماشا طبیعت کا تجزیہ کچھ ایسا آسان کام نہیں، لیکن چیلنج کو قبول کیجیے اور آگے بڑھیے تو پتا چلتا ہے کہ حسرت کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک آئینہ ہے کہ اس میں حسرت کی بے لوث زندگی کا عکس موجود ہے۔ قید تنہائی کی صعوبتوں میں بے خوفی، حق گوئی، مستقل مزاجی، صبر و رضا، توکل و استغنا کے سہارے زنداں کو گلستاں بنا لینے کا حوصلہ رکھنے والا حسرت اور محبت کی نازک اور لطیف دنیا میں انھیں عادتوں کو آرزو مندی، رضا جوئی، سپردگی، شیفتگی، وارفتگی، پاس وضع اور وضع احتیاط بنا لینے والا حسرت ایک ہی حسرت ہے جو قیدِ بند کی سختی اور عشق و محبت کی دل سوزی اور دل گدازی میں یکساں

لذّت ونشاط کا سرمایہ بہم پہنچانے کا عادی ہے۔

حسرت نے زندگی کے دو مختلف گوشوں میں دونوں کے اپنے اپنے مخصوص تقاضے اور طلب کے مطابق جو رویّہ اختیار کیا ہے اُس میں کسی طرح کا تضاد نہیں۔ چکّی کی مشقّت کو گوارہ اپنا لینا حسرت کے لیے اس لیے آسان ہے کہ یہ مشقّت سدا سے حق جوئی، حق طلبی اور حریّت پسندی کا انعام رہی ہے اور اس مشقت میں بھی مشق سخن کا معمول اس لیے نشاط انگیز ہے کہ اس کی بدولت واردات محبت کی یادوں کا وہ دل نواز سلسلہ قائم رہتا ہے جس کی دنیا خوشبوئے دلبری اور شوخیٔ پیرہن سے رنگین ہے۔ اور حسرت کو آزادی بھی عزیز ہے اور محبت بھی، اس لیے ان کی عمر عزیز کا تمام تر سرمایہ انھیں دونوں کی پابنی وخدمت گزاری میں صرف ہوا۔

حسرت کی پوری زندگی شخصیت کے تغافل کی ایسی حیرت انگیز مثال ہے۔ جو حیاتِ انسانی میں صرف کبھی کبھی اور کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ یہاں شخصیت کے تمام عناصر و اجزا میں ایسی یک جائی اور پیوستگی اور ایسا توافق و انضباط ظہور میں آتا ہے کہ سخت سے سخت حادثہ بھی نہ ان میں رخنہ ڈال سکتا ہے نہ انتشار پیدا کر سکتا ہے۔ طوفان اور حادثے ان شخصیتوں کے لیے وجہ حیات ہیں کہ اُنھیں سے ارادوں میں مضبوطی اور عزائم میں پختگی آتی ہے سختیوں اور صعوبتوں میں ان کے جوہر اُبھرتے، نکھرتے اور اجاگر ہوتے ہیں۔ مقصد کی لگن انھیں جس راہ پر ڈال دے۔ یہ شخصیتیں سچّائی اور اخلاص مندی کا توشہ ساتھ لیے بے تامّل اسی راہ پر

چلتی رہتی ہیں۔ وسوسے اُن کے دلوں کو نہیں ستاتے ۔ خوف وہراس ان کے پیروں کی زنجیر نہیں بنتے اور مصلحت اندیشی اُن کی زبانوں پہ مہر نہیں لگاتی۔ دل جو کچھ محسوس کرتا ہے زبان اس کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے اور اس ترجمانی میں نہ کھوٹ ہوتا ہے نہ بناوٹ ۔ حسرت کی شخصیت اسی طرح کی شخصیت ہے حسرت کی زندگی کے دو رُخ ہمارے سامنے ہیں ۔ سیاست اور شاعری۔ ان کی سیاست سر تا سر سرفروشانہ ایثار اور حق کی خاطر جفائیں جھیلتے رہنے کی ولولہ انگیز داستان ہے۔ اس داستان کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ حسرت نے ظلم سہے اور زبان نہیں کھولی کہ یہ مسلک سرفروشی کی توہین و رسوائی ہے ۔ حسرت کی شاعری والہانہ محبت، شیفتگی کی نشاط انگیز کہانی ہے اور سیاست کی طرح اس کی بنیاد بھی سچائی اور خلوص ہے ۔ سیاست میں جس سرفروشانہ ایثار کو حسرت نے اپنا وطیرہ بنایا تھا محبت کی کہانی میں اسی کا نام تسلیم و رضا ہے۔ تسلیم و رضا کی عادت نے یہاں بھی دل کی بات لبوں تک نہ آنے دی کہ اس سے عشق کی احتیاط پسندی میں فرق آتا۔ حسنِ محبوب و رسوا ہوتا۔ حسرت کا احسان سیاست پر بھی ہے کہ انہوں نے ایک ایسے دور میں جب لوگ سیاست کی تعزیروں کے مفہوم سے ناآشنا تھے طوق وسلاسل کی روایت کی طرح ڈالی اور محبت پر بھی کہ اُسے اس رُسوائی سے باہر نکالا جسے شاعری نے (یا یوں کہیے کہ غزل کی شاعری نے) اُس کے گلے کا طوق بنا دیا تھا۔ سیاست نے بہت جلدی حسرت کے احسان بھلا دیے ۔ اس لیے کہ خلوص ، صداقت ، جاں بازی و سر

فروشی اس کی دنیا کی قدریں نہیں لیکن شاعری کے لیے حسرت کے احسان کو بھلا دینا آسان نہیں کہ ہم جب بھی غزل کی رسوائیوں کے افسانے دہرائیں گے ہمیں اس جگہ ٹھٹک جانا پڑے گا۔ جہاں حسرت کے خلوص اور صداقت کی بدولت اُسے نئی زندگی ملی۔

حسرت کی شاعری کے نقاد کو اور اردو کے غزل گو کو حسرت کی کئی باتیں گرہ سے باندھ کر رکھنی پڑیں گی کہ یہ باتیں ہماری غزل کی روایت کا وہ سرمایہ ہیں کہ اگر یہ سرمایہ اس کے ہاتھ نہ آتا تو آج ہم اُس کی مغفرت کی دعائیں مانگتے ہوتے۔ لیکن ایک خاص طرح کے مزاج، ایک مخصوص رویے اور مخصوص طرزِ عمل نے غزل کو نئی زندگی دی۔ غالب اور مومن کے عہد کے بعد جس میں غزل اپنی فکری اور جذباتی معراج کو پہنچی اور اپنے مخصوص ایمائی اسلوب اظہار کی بدولت اس نے ذاتی تجربے اور احساس کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا اور اجتماعی کشمکش، اضطراب، پیچ و تاب تذبذب اور بے یقینی کو ایک ایسی علامتی زبان عطا کی جس میں گہری معنویت اور اثر انگیزی موجود ہے، لیکن غالب اور مومن میں داخلی و خارجی اضطراب اور بے یقینی کی کیفیتوں کو پوری طرح اپنی طرف کھینچنے اپنی ذاتوں کی گہرائیوں میں جذب و حل کرتے اور اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لیکر بیان کا خارجی پیکر ادا کرنے کی جو غیر معمولی استعداد تھی اُس سے اُن کے فوراً بعد آنے والے شاعر محروم تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل افراتفری کا شکار ہوتے ہوتے ایک بے جان اور بے معنی صنف رہ گئی۔ اس کا رشتہ یا تو زندگی سے بالکل کٹ گیا یا اس رشتے کی نوعیت محض رسمی اور خیالی ہو کر رہ گئی۔ غزل گو شاعر کا

خیال اور بیان دونوں کشمکش کے اسیر تھے۔ خانقاہوں کے دروازے اس نے اپنے اوپر بند کر لیے تھے کہ فکر و تخیل کو یہاں کی فضا میں فرسودگی محسوس ہوتی تھی اور رنجانے پر دستک دے کر اب تشفی کا سامان میسر نہ آتا تھا۔ اس حالت میں زندگی سے قریب تر رہنے کی آرزو نے اسے کوچۂ ہوس میں لا ڈالا۔ ارباب نشاط کی محفلیں اس کی توجہ کا مرکز بن گئیں۔ جہاں الفت کے رشتے کی نوعیت عامیانہ اور سوقیانہ تھی۔ حُسن و عشق دونوں خلوص اور پاس وضع سے عاری تھے۔ اُن کے تعلق کی اساس غرض مندی اور دنیا داری پر قائم تھی۔ بیان کی کشمکش یہ تھی کہ اسے فارسی اور ہندی دونوں کے سوتے خشک اور خالی نظر آرہے تھے۔ اس لیے اس سے دامن بچا کر نکل جانے کی خواہش میں وہ جو اسلوب بھی اختیار کرتا تھا اس میں تکلّف اور تصنّع پیدا ہو جاتا تھا۔ یہی وقت تھا کہ حسرت نے غزل کو ہر طرح کی کشمکش سے رہائی دلائی۔

حسرت کے ہاتھوں غزل ایک بار پھر ایک سیدھے سادے معمولی انسان کے سچے واردات کی روداد بنی اور محسوس ہوا کہ کوئی یہ سمجھ کر کہ محبت کا آغاز و انجام کی فطری اور ازلی خواہش کا تقاضا ہے کہ وہ ایک جسمانی اور حیاتی حقیقت ہے اور اس حقیقت سے دوچار ہونے والے کو ان گنت نازک اور نامحسوس مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شعر کو ان نازک مرحلوں کے اظہار کا وسیلہ بنا رہا ہے۔ اس منزلے تک حسرت کی رسائی کا جو انداز ہے اُس کی تفسیر ان کا یہ شعر ہے سہ

عشاق کے دل نازک، اس شوخ کی خو نازک
نازک اسی نسبت سے ہے کارِ محبت بھی

حسرت کے سیدھے اور بے تکلّف بیان نے شعر کو حقائق کی سطح پہ لا کر محبت کے نازک نفسیاتی مرحلوں کا اور اس کی مجازی رنگینیوں کا مرقع بنا دیا۔ محبت آسمان سے اتر کر زمین پہ آئی اور اس کے جسمانی لمس سے آشنا اور اس کی حرارت سے لذت یاب ہو کر معصوم اور پاکبازانہ رہی۔ حسرت نے محبت کی اس پاکبازی کا ذکر ایک شعر میں کیا ہے ؎

دیارِ عشق میں برپا ہے ماتم مرگ حسرت کا
وہ وضع پارسا اُسکی، وہ عشقِ پاکباز اُس کا

یہاں عشقِ پاکبازانہ کی ترکیب میں ایک طرف تو اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حسرت نے نفسیاتی تجزیے اور تزکیے کے اس عمل سے جس سے عموماً ہماری غزل خالی ہے جنسی جذبے کی تطہیر کی اور دوسرا اس نکتے کی طرف کہ ہر شاعر کی غزل اگر وہ اُس کے اپنے مخصوص تجربے، رویّے اور مزاج کا عکس ہو تو ایک مخصوص اور منفرد قسم کی تازگی اور رعنائی کی حامل بن جاتی ہے۔

حسرت کے اس واردات، تجزیاتی اور پاکبازانہ اندازِ فکر اندازِ تخیّل اور اندازِ احساس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ غزل ایک وقیع اور مہذّب فکری اور نفسیاتی سطح پر ہر طرح کے خیال، جذبے اور احساس کی مظہر اور ترجمان بن گئی اور ایک مسلسل تواتر سے فانی، جگر، اصغر یگانہ، اقبال، فراق، فیض اور ناصر جیسے غزل گو کا آنا ممکن ہو گیا۔

بیان کے نقطہ نظر سے بھی حسرت کی غزل کا کرشمہ یہ ہے کہ اس نے داستانِ محبت کو ایک بار پھر دہ موثر، لطیف، پاکیزہ اور مہذب لہجہ اور انداز عطا کیا جو خیال سے پوری طرح ہم آہنگ بھی ہے اور اپنی ایک علیحدہ معنویت اور رعنائی بھی رکھتا ہے۔ اس کے لیے حسرت نے ایک سرفروش مہم جو کے انداز میں غزل کی پوری روایت کا طویل سفر طے کیا اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر ہر جگہ سے وہ چیز چن لی جو کام کی نظر آئی اور ان سب کو جوڑ کر ایسا پیرہن تیار کیا جس سے غزل کے پیکر لطیف کو نئی پھبن ملی۔ اور یوں فقر و درویشی کی سادہ راہوں پر چلنے والا یہ انسان سیاست کو سرفروشی اور جان بازی کا سبق سکھاتا ہوا ہمارے غزل گو کو بہت سی کام کی باتیں سکھا گیا۔ یہ وہ باتیں نہ سکھاتا تو محبت کو اس کا سلیقہ نہ آتا۔ محبوب اپنی محبوبی کے رکھ رکھاؤ سے نا آشنا رہتے اور غزل گو کو شاید اب بھی یہ بات یاد نہ آتی کہ غزل انسان کی اپنی محبت کی سیدھی سچی اور بے لوث روداد ہے۔ یہ روداد انسانی فطرت کے رموز سے آشنا ہوئے بغیر مرتب نہیں ہوتی اور اس روداد میں دلکشی اور دل نشینی صرف اس وقت آتی ہے جب غزل گو پوری روایت میں ڈوب کر اور غزل کے اسلوب کا صحیح مزاج داں بن کر اسے معزز و محترم بنائے اس طرح کہ ہم اس کے مرنے کے بعد بھی اسے یاد کر کے کہہ سکیں ؎

توڑنے کی حسرت عیاں تہذیب رسم عاشقی
اس سے پہلے اعتبار شان رسوائی نہ تھا

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مرزا ظاہر دار بیگ

(مولوی نذیر احمد کا ایک اہم کردار)

"اب چاہے آپ اسے پسند کریں یا ناپسند، عیب سمجھیں یا ہنر بہر حال ہے یہ کہ نذیر احمد ان لوگوں میں نہ تھے۔ جو ادب کو برائے ادب پسند کرتے ہوں۔ یا ناول کے لیے قلم اٹھاتے ہوں۔ تو بس اس لیے کہ وہ ناول ہے۔ نذیر احمد مولوی تھے۔ مسلمان تھے۔ مشرقی تھے اور بڑی بات یہ کہ زندگی کے بامعنی ہونے کے قائل تھے۔ زندگی کی ہر سانس معنی لیے ہوئے ہے۔ دل کی ہر دھڑکن ایک غایت و مقصد رکھے ہوئے ہے یہ نہیں کہ بس بولنے کو جی چاہا۔ زبان اٹھائی اور ردے ماری اور جب لکھنے کی موج آئی تو قلم اٹھا کر کاغذ پر گھسیٹنا شروع کر دیا۔ تو اس قسم کا آدمی جب ناول لکھے گا تو سوچ سمجھ کر منزل و نشانِ منزل کی طرف آنکھیں گڑا کر"

ان الفاظ میں مولانا عبدالماجد دریا بادی نے مولوی نذیر احمد

کے فن اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ نذیر احمد اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اپنے عہد کے سچے ترجمان ہیں۔ اور ان کا فن اس زمانے کے افادی رجحانات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس مقصد سے انھوں نے ناول لکھے ہیں۔ اور ان ناولوں میں ایسے کرداروں کی تخلیق کی ہے۔ جن کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، افکار و خیالات زندگی کے کسی خاص مقصدی اور افادی پہلو کو پیش کرتے ہیں۔

مراۃ العروس ایا می۔ رویائے صادقہ۔ ابن الوقت اور توبتہ النصوح سب میں نہ صرف بنیادی اور مرکزی کردار معمولی اور ذیلی کردار سبھی کسی نہ کسی اہم مقصد کے پیش نظر افادیت کے خیال سے تخلیق کیے گئے ہیں۔ نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ ان ذیلی کرداروں میں جگہ جگہ انھوں نے طنز و مزاح کا رنگ دیکر ایسی تصویریں بنائی ہیں جن سے محظوظ ہونے کا سامان بھی پیدا ہوتا ہے اور عبرت بھی حاصل کی جا سکتی ہے ــــ توبتہ النصوح ان کا مشہور ناول ہے۔ اس کا مرکزی کردار تو خود نصوح ہے۔ جو افادیت اور مقصدیت کا مجسّمہ ہے کلیم اس کا دوسرا اہم کردار ہے۔ نذیر احمد نے اس کو لا ابالی، ضدی اور ایک بے راہرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے لیکن اس کردار کی ہر بات یہ احساس دلاتی ہے کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں۔ تہذیب کے نام پر لا ابالی بن جانیوالے کو وہ کبھی معاف نہیں کرتی۔ ان دونوں کرداروں کے ذریعہ نذیر احمد نے زندگی کے متضاد پہلوؤں کو ابھار کر مقصدیت اور افادیت کو بڑے سلیقے سے ذہن نشین کرایا ہے۔

یہ توبتہ النصوح کے بڑے بھرپور کردار ہیں۔ لیکن ایک کردار

اس ناول میں ایسا ہے جو اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے سامنے آتا ہے لیکن افادیت کے اعتبار سے ایسے گہرے نقوش دل و دماغ پر چھوڑ جاتا ہے کہ اس کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ کردار مرزا ظاہر دار بیگ ہے، ظاہر دار بیگ اسم با مسمیٰ ہے وہ اپنے آپ کو دلّی کا رئیس ظاہر کرتا ہے۔ کلیم کی دوستی کا دم بھرتا ہے اس کے شطرنج اور گنجفہ میں وقت گزارتا ہے۔ شاعری سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ مشاعروں میں شعر بھی پڑھتا ہے۔ غرض معلوم ہوتا ہے جیسے وہ دلّی کا کوئی شہزادہ یا رئیس زادہ ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کی یہ تھی کہ شاید اس کا نانا۔ وہ بھی حقیقی نہیں۔ ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو امیں عالی جاہ سرکار، دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار، تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی، اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا یہاں تک کہ اس کا شمار دلّی کے اہم لوگوں میں ہونے لگا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار سے باوجود یہ کہ دور کی قرابت تھی۔ اس کا تکفل اپنے ذمے لیا۔ جب تک جمعدار زندہ رہا مرزا اور اس کی ماں کی گزر بسر ہوتی رہی۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد حال خراب ہو گیا۔ اس کی جائیداد بے شمار بیٹوں، پوتوں اور نواسوں میں تقسیم ہو گئی۔ ان لوگوں نے ایک معمولی سی جگہ مرزا کی ماں کو رہنے کے لیے دی اور سات سات روپے مہینے کی دو دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ بس یہ کل کائنات تھی۔ جس پر مرزا پھولا نہیں سماتا تھا۔ اپنے آپ کو دلّی کا رئیس سمجھتا تھا۔ اور جمعدار کے بیٹوں

کا مقابلہ کرتا تھا۔ اپنے آپ کو ان کا قریبی عزیز ظاہر کرتا تھا۔ حالانکہ وہ لوگ اس کو منھ نہیں لگاتے تھے۔ اس نے ان کے خاندان میں سے کسی کو بھائی جان کسی کو خالو جان کسی کو ماموں جان بنا لیا تھا۔ غرض ہر طرح اپنے آپ کو ایک اعلیٰ خاندان کا فرد اور رئیس زادہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس کی یہ حرکتیں مضحکہ خیز بن جاتی تھیں۔

نذیر احمد نے اس کی اس ظاہر داری اور مضحکہ خیز انداز کی جو تصویر کھینچی ہے وہ اس کی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیے کی جوتی۔ سر پر دوہری لبخل کی بھاری کام دار ٹوپی۔ بدن میں ایک جھوڑ دو انگرکھے اور شبنم یا ہلکی سی تن زیب نیچے کوئی طرح دار سا ڈھاکے کا نیو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپے گز سے کم کی نہیں خیر۔ یہ تو صبح و شام اور تیسرے پہر کا شانی مخمل کی آصف خانی جس پر خود نیر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کم خواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سرخ نیفہ۔ پائجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو کلی دار اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ مہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں اور اوپر جلد بدن کی طرح ویڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا اس میں سے بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھا تو مرزا صاحب اس ہیئت کدائی سے چھیلا بنے ہوئے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ ایک شخص کی تصویر ہے جو بظاہر سجا بنا نظر آتا ہے جو اپنے آپ کو امیر زادہ ثابت کرنے کے لیے یہ سوانگ بھرتا ہے۔ لیکن وہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اس کی بنیاد کوئی نہیں اس کے پاس کنجیاں تو ہیں جن کو کمر میں باندھ کر چلتا ہے لیکن خزانہ نہیں۔ انیسویں صدی کے مسلم معاشرے میں ایسے سوانگ بھرنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ نذیر احمد نے ایسے لوگوں کو دیکھا تھا اور ان کو مسلمانوں کے معاشرے کے لیے ایک مرض تصور کیا تھا۔ اسی احساس کو عام کرنے کے لیے انھوں نے ظاہر دار بیگ کی ایسی تصویر کھینچی ہے۔

اس تصویر میں ظاہر دار بیگ کی شخصیت کے تضاد کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ تضاد اور بھی شدت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جب نذیر احمد اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ جب کلیم اپنے باپ نصوح سے ناراض ہو کر قطع تعلق کر کے وقتی طور پر قیام کے لیے مرزا ظاہر دار بیگ کے گھر پہنچتا ہے۔ مرزا دن دن بھر اس کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی امارت کے قصے سناتا تھا۔ کلیم نے بھی یہی خیال قائم کر رکھا تھا کہ وہ امیر زادہ ہے اسی خیال کو لیے وہ مرزا کے گھر پہنچ گیا۔ جو جمعدار کے مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی منڈیر پہ چھوٹا سا کچا مکان تھا یہاں جس صورت حال سے اس کو دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل نذیر احمد کی زبانی سنیے۔

"کلیم نے وہاں جا کر آواز دی۔ تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ، دھڑنگ، جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے کہ "اہا آپ ہیں؟ معاف کیجیے گا میں نے سمجھا کوئی اور صاحب

ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہم رکاب چلوں"۔

کلیم :۔ "چلیے گا کہاں ؟ میں تو آپ کے پاس آیا تھا"۔

مرزا :۔ "پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا ہو تو میں اندر پردہ کرا دوں"۔

کلیم :۔ "میں آج شب کو آپ ہی کے ہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں"

مرزا :۔ "بسم اللہ۔ تو چلیے اس مسجد میں تشریف رکھیے بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا"۔ کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ مسجد ضرار کی طرح وحشت ناک نہ کوئی حافظ ہے نہ مُلا۔ نہ طالب علم ہے نہ مسافر، ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیع بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑے ہیں کہ بجائے خود کھڑنجے کا فرش بن گیا ہے"۔

غرض مرزا نے کلیم کو مسجد میں ٹھہرایا۔ چند لمحوں کے لیے کلیم کو وہاں چھوڑ کر گھر گئے تھے لیکن خاصی دیر کے بعد واپس آئے وجہ یہ بتائی کہ گھر میں علیل ہیں۔ خفقان کا عارضہ اور اختلاج قلب کا روگ ہے جا کر دیکھا تو ان پر غشی طاری تھی۔ اس وجہ سے تاخیر ہوئی۔

اب کلیم کو بھوک لگنے لگی تھی۔ چنانچہ اس نے بے غیرت بن کر خود کہا۔ کہ "سنو یار میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

لیکن مرزا نے جواب دیا "سچ کہو نہیں جھوٹ بہکاتے ہو"۔

کلیم نے کہا "تمھارے سر کی قسم بھوکا ہوں"۔

مرزا نے اس پر یہ کہا کہ اب تو بہت رات جا چکی ہے۔ اس وقت کھانے کا انتظام ممکن نہیں، دکانیں بند ہو چکی ہیں۔ اب تو صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔ کہ چھدامی بھڑبھونجے کے ہاں سے گرم خستہ چنے بنوا لاؤں بس ایک دھیلے کے کافی ہونگے۔

چنانچہ وہ چنے بھنوا کر لاتا ہے ۔ اور کلیم کو پیش کرتا ہے۔ کلیم بھوک سے بیتاب ہو رہا ہے اس لیے چنے کھاتا ہے لیکن وہ بھی پڑ جاتے ہیں۔

مرزا ان چنوں کی تعریف میں اس طرح گفتگو کا آغاز کرتا ہے۔

"یار ہم تو بڑے خوش قسمت ہیں کہ اس وقت مل گیا۔ ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ دیکھو تو کیسے جھلس رہے ہیں اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس کا عطر نکالا مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے دیکھیے اتنی رات ہو گئی ہے مگر چھدامی کی دکان کا چنا بلا ناغہ تک کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیے کیا کمال کرتا ہے۔ کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔

اور ان چنوں پہ اس کو ختم کر دیتا ہے۔

"سو حضرت یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں۔ کہ فرشتوں کے دندان آج بھی ان پہ تیز ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا۔ ورنہ میر مدد کے کبابوں میں یہ خستگی اور

سوندھاپن کہاں۔

مرزا ظاہر دار بیگ کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ وہ ظاہر تو کرتا ہے کہ اس کے محل اور حویلیاں ہیں۔ لیکن جھونپڑے میں رہتا ہے۔ وہ لباس امیرزادوں کا پہنتا ہے لیکن اس کے پاس ہے کچھ بھی نہیں۔ وہ دوستی کا دم بھرتا ہے۔ لیکن دوستی نباہنے کا مزاج اس کے پاس نہیں۔ وہ نادار ہے غریب اور مفلس ہے۔ لیکن اپنی اس ناداری اور غریبی اور مفلسی کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ اس لیے وہ باتیں کرتا ہے تو زمین کو آسمان اور آسمان کو زمین بنا دیتا ہے۔ اس کی باتیں دلچسپ ہونے کے باوجود مضحکہ خیز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ پڑھنے والا ان پہ ہنستا بھی ہے۔ ان سے حظ بھی اٹھاتا ہے لیکن ان باتوں کی تہ میں اس معاشرے کے کھوکھلے پن کی بھیانک تصویر صاف دکھائی دیتی ہے۔ جو سچائی محبت و دوستی کی اعلیٰ وارفع قدروں کو کھو چکا ہے اور انحطاط و زوال کے باعث جس کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور جس نے بے بنیاد خود پرستی خودنمائی کو افراد میں بیماری کسی حد تک عام کر دیا ہے۔

مرزا ظاہر دار بیگ اسی کی علامت ہے۔ نذیر احمد کے گہرے معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی شعور نے اس کو پورے مسلم معاشرے کا ترجمان بنا دیا ہے۔ جو زوال و انحطاط سے آشنا تھا۔ اور جس نے ظاہر دار بیگ کے کردار کے پردے میں اسی معاشرے کے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے۔ ان کی طبیعت کے

افادی رجحان نے کردار کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار اور اقدار و معیار کے ایک ایک پہلو میں اس حقیقت کو نمایاں کر دیا ہے کہ اجتماعی زندگی کی مجبوریوں اور ناہمواریوں نے اس کو پیدا تو کیا ہے۔ لیکن وہ اس زندگی کے چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔

نذیر احمد نے اس داغ کو تخلیق ہی اس لیے کیا ہے کہ معاشرے میں اس قسم کے افراد کا وجود انہیں گوارا نہیں. وہ اس کو پیش کر کے معاشرے اور زندگی کو اس قسم کے لوگوں سے پاک کرنا چاہتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین

کچھ نثری شاعری کے بارے میں

نثری شاعری اردو میں کیوں آئی، اس کے اسباب کیا تھے، اس کے متعارف کرانے کا جواز کیا ہے۔ مغربی ادب و شعر کے حوالوں سے کس طرح اُسے حق بجانب قرار دیا جا سکتا ہے اس کے موافقین اور مخالفین کے دلائل کیا ہیں۔ میں ان تمام امور پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا۔ اس واسطے کہ بات گھوم پھر کر نظم معریٰ اور نظم آزاد کی آمد یا درآمد اور اس کے قبول کیے جانے تک پہنچ جائے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نثری شاعری آچکی ہے اور لکھی جا رہی ہے۔ اس میں اور روایتی شاعری میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ یہ "کہی" نہیں جاتی "لکھی" جاتی ہے۔ پرانی شاعری میں آزاد نظموں کی بھی کم و بیش یہی کیفیت ہے۔ شکستِ بحور کے باوجود بحور اور قوافی موجود ہیں۔ متعینہ بحور یا اصناف میں لکھنے کے لیے شاعر کو کوئی

خاص کوشش نہیں کرنی پڑتی تھی۔

مدتوں کے تہذیبی اثرات، اردو شاعری کی مجموعی تربیتی فضا، بحور اور قوافی کی گونجتی ہوتی آوازیں اور خود شاعر کے افکار اور جذبات کی بنیادی موسیقی اس کے اشعار کو متعینہ اصناف اور بحور سے کسی خاص کاوش اور سعی کے بغیر ہم آہنگ کر دیتی تھی۔ معاشرے کی تہذیبی اقدار اور شاعر کی فکر میں کوئی فصل نہیں تھا۔ ایک معاشرتی وحدت تھی جو فکر، اسلوب اور طریقۂ اظہار کی کثرت اور اختلاف کے باوجود تاثرات کے انتشار کا باعث نہیں ہوتی تھی۔ اسی لیے شاعری تخلیقات میں شدت کے ساتھ تکمیل کی تلاش کی جاتی تھی۔ دیکھا یہ جاتا تھا کہ شعر مکمل ہوا کہ نہیں ہوا، قوافی درست ہیں یا نہیں، ردیف سے چسپاں ہوئے یا نہیں۔ ردیف اٹھ رہی ہے یا نہیں۔؟

اب اگر ان نکتہ چینیوں اور تقاضوں پر غور کریں گے تو ان کے پیچھے بجز معاشرتی ہم آہنگی کے اور کوئی تقاضا نہیں ملے گا۔ یہ سلسلہ اسوقت تک چلتا رہا جب تک خود معاشرہ دو لخت نہیں ہوا تھا۔ جونہی معاشرہ بکھرنے لگا آزاد اور حالی نے نئے نئے موضوعات کی تلاش شروع کر دی آورد اور آمد کا فرق واضح تر ہونے لگا جبکہ جائے معاشرے میں تمام تر ذہنی توجہات کے باوصف اچھے شعر کی تعریف میں ”آمد“ کی اصطلاح بڑی معنویت رکھتی تھی۔ شعر میں ”آمد“ کا مسئلہ ہمارے قدما کا اہم نہیں ہے بلکہ کہنے والے اور پڑھنے والے کی ذہنی اور تہذیبی شعور کی ہم نوائی ہے۔ کوئی بھی آرٹ

ہو، اس کی تخلیق بہت محنت طلب چیز ہے۔ مگر صرف محنت طلب نہیں ہے۔ یہ تند تیز موج پر کشتی کھینے کا مسئلہ ہے۔ موج کی تندی برقرار رہے اور کشتی بھی ڈوبنے نہ پائے۔ یہ بڑی استادی کا کام ہے۔ تخلیقی موج پر فن کی کشتی کو چلانا شعر میں آرٹ اور وہ چیز ہے جسے "آمد" کہتے ہیں دونوں کو برقرار رکھنا ہے۔ اس کی سب سے مکمل مثالیں میر تقی میر اور انیس کے یہاں مل جائیں گی۔ مگر جہاں صرف کشتی چل رہی ہو اور موجیں غائب ہوں وہاں شاعری شعر گوئی کی تجارت اور دھار بن جاتی ہے۔ ناسخ شاہ نصیر اور ہمارے زمانے میں ن۔م۔ راشد اور حضرت میراجی اس کی بیّن مثالیں ہیں۔ ایک کے یہاں پولی ٹیکنک کی شاعری ہے تو دوسرے کے یہاں اسی سالہ ضعیاسی کا کلینک کھلا ہوا ہے۔ ان دونوں کا کلام بلاغت نظام پڑھ لیجیے۔ آپ کو "آورد" کی جملہ معنویت سمجھ میں آجائے گی۔ یہ دورِ جدید میں اسی طرح کے استاد ہیں جس طرح شاہ نصیر اور امانت وغیرہ ایک دوسرے انداز میں اپنے عہد میں مانے اور جانے جاتے تھے۔ اس ضمن میں ایک بات کی طرف توجہ ضروری ہے۔ "صناعی" اور "آورد" میں فرق ہے۔ اچھی صناعی اپنی جگہ خود تخلیقِ حسن ہے۔ "گلزارِ نسیم" اس صناعی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

بہر حال ۱۸۵۷ء کے بعد قدیم معاشرتی اقدار کی بے حرمتی اور فرسودگی اور جدید اقدار کی جارحانہ یلغار نے معاشرتی شکست و ریخت کے عمل کو تیز کر دیا یہاں تک کہ ہمارے دور میں پہنچتے پہنچتے دو عالمی جنگوں نے آدمی سے حال کا چین مستقبل کی امید اور ذہن کا

سکون چھین لیا۔ اقبال اور جوش تمام تر جدید گفتاری کے باوجود معاشرتی اقدار سے بعض اوقات برگشتہ ضرور نظر آتے ہیں مگر بے خبر نہیں ہیں۔ یہ اردو شاعری کی بہترین اور بزرگ ترین روایات کے حامل ہیں۔ مگر ان کے بعد صرف قدیم روایات پر مبنی شاعری چل نہ سکی زندگی کی بے کیفی، بے ہمتی اور "بے رسمی" نے ہمارے شعراء کو نئی اصطلاحات اور نئے فارم کو اختیار کرنے پر مائل ہی نہیں مجبور بھی کیا۔

چنانچہ نظم آزاد، اور نظم معریٰ کے بعد نثری شاعری کی آمد یا آورد منطقی چیز تھی۔ اس پر چراغ پا یا جزاس باختہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ افسانوں کو دیکھ لیجیے اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان میں کردار اب نہیں ملیں گے۔ کردار کی تلاش البتہ ملے گی۔ بیشتر جدید افسانہ نگار اس راہ پر چلنے کی کوشش میں ہیں جو ابھی بنی نہیں ہے یہ راہ اگر بن بھی گئی تو ان افسانہ نگاروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کہاں جاتی ہے۔ اس کی غالباً انھیں پروا بھی نہیں۔ منزل کی نارسائی اس دور کا مقدر بن چکی ہے۔ لایعنیت بھی ایک معنویت رکھتی ہے۔ اس معنویت کو سنجیدگی سے تلاش کرنا اور سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس معنویت میں بڑی تلخی، تنہائی، بے تعلقی، بے یقینی، بے جہتی، اور "عدمیت" ہے۔

ہمارے جدید ترین شعراء اور افسانہ نویس لایعنیت کی اس ہیبت ناک معنویت کو نہ سمجھ پائے ہیں نہ انگیز کر پائے ہیں۔ وہ "نہ ہونے" کے دکھ سے ناآشنا ہی نہیں ہیں۔ اپنی ذات کی بیلنٹی نے انہیں "نہ ہونے" کی شدید حرص میں مبتلا کر دیا۔

ہماری نثری شاعری میں سب سے بڑی قباحت اور اس کے قائم بالذات ہونے میں رکاوٹ یہی ہے کہ اس کے لکھنے والے اپنی فکر اور جذبے کی شعوری کوشش کی نفی نہیں کر پائے ہیں ورنہ یہ "نہفتہ" کو آشکارا کرنے میں بڑی ممد ہوتی ہے۔ یہ چھوٹے آدمیوں کے ہاتھوں چھوٹی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب تک شعر و ادب میں اشتہاری یا صحافتی رنگ کم آیا تھا۔

ہمارے یہاں جو نثری شاعری لکھی جا رہی ہے وہ اپنا اشتہار بنتی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کے لکھنے والے ہی بے وقار اور غیر معتبر نہیں ہوئے بلکہ خود یہ شاعری بھی یہی کچھ ہو کر رہ گئی ہے۔

روایت شکنی اچھی بات ہے یا بری بات ہے۔ اس سے مجھے بحث نہیں ہے۔ یہ ہوتی چلی آ رہی ہے۔ ہوتی رہیگی۔ مگر روایت شکنی کے لیے ادیبوں اور شاعروں کے قدم کو ذرا بڑا ہونا چاہیئے۔

نثری شاعری کو ابھی کوئی بڑے قد کا شاعر نہیں ملا ہے! اس طرح لکھنے والے بیشتر وہی شاعر ہیں جو ہر صنف میں طبع آزمائی کرنے کے بعد اس کی طرف رجوع ہوتے ہیں یہ تمام حضرات "شعر کہتے" رہے ہیں اب انھیں "شعر لکھنے" کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

نثری شاعری کہنے کی چیز نہیں ہے۔ "لکھنے" کی چیز ہے۔ افسانہ کہا نہیں جاتا لکھا جاتا ہے۔ یہ شاعری بھی ایک نوع کی افسانوی کیفیت رکھتی ہے بے ترتیب زندگی کی بے ترتیب کہانی لکھنے کے لیے "از خود رفتگی" کی ضرورت ہے تاکہ شعوری کوشش کی گرفت نظر نہ آئے۔

تمام ڈھانچوں اور تمام سانچوں کو توڑنے کے بعد از سرِ نو تلازموں استعاروں اور علامتوں کی تلاش بڑی عجیب سی نظر آتی ہے۔ "نہیں" کا حرف لکھ دینا تو بہت آسان ہے مگر اس کی "گونج" کو سننا اور قلم بند کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ یہ ایلیٹ کی نظم ویسٹ لینڈ سے آگے کی منزل ہے۔

نثری نظم اگر لکھے جانے کا جواز نہ بن سکی تو یہ افسوس ناک بات ہوگی نثر میں شعریت اور شعریت میں "نثریت" کو محسوس اور پیدا کرنا تجربہ بھی ہے اور ہمارے دور کا تقاضا بھی۔ تمام متعیّنہ نظریات اور فارم سے انحراف کوئی بے معنی چیز نہیں ہے۔ عالمی سیاسی خلفشار اور اعصاب پر اس کا دباؤ، مسلسل جنگیں، قومیتوں، نسلوں اور ملکوں کے اختلاف اور افتراق پیدا کرتے ہوئے نعرے، اخلاقیات کے مجرب اور تیر بہدف نسخوں کی ناکامی عقیدوں کی پامالی تجارتی منڈیوں میں آفتابوں اور مہتابوں کی خرید و فروخت ذہن کو مفلوج اور فکر کا فقیر بناتی ہوئی معاشی منصوبہ بندیاں۔ ان تمام چیزوں نے آدمی کے زندہ رہنے یا مر جانے کے سارے طریق، تدابیر اور تصورات کو لغو اور متروک بنا دیا ہے۔ ہیملٹ نے انتہائی کرب کے عالم میں سوچا یا پوچھا تھا To be or not to be آج یہ کرب اور یہ سوچ، یہ سوال بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

ایسی صورت میں نثری نظم سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر لے کون؟

—That is the question!

ڈاکٹر وزیر آغا

زبان اور قومی تصوّر

خواتین وحضرات!

پشاور میں اردو کانفرنس کا انعقاد ایک واقعہ ہے حادثہ نہیں! حادثے کی تعریف یہ ہے کہ وہ بالکل اچانک وجود میں آتا ہے اور اس کے عقب میں محرکات کا سلسلہ کسی مرتب اور مدوّن صورت میں موجود نہیں ہوتا۔ مگر واقعہ اس شجر کی طرح ہے جس کا وجود میں آنا تخم کاری کے ایک طویل سلسلے کا لازمی نتیجہ ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ پشاور میں منعقد ہونے والی یہ اردو کانفرنس واقعہ کیوں ہے اور حادثہ کیوں نہیں؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ قصہ کیا ہے!

اگر آپ برصغیر ہند و پاک کو ایک ایسی حویلی قرار دیں جس کی چار دیواری میں سر بفلک پہاڑ اور بے نہایت سمندر شامل

ہیں۔ تو پھر آپ کو اس بند حویلی کا صدر دروازہ درۂ خیبر کے سوا اور کوئی نظر نہیں آئے گا۔ اور شہر پشاور آپ کو اس "محافظ" کی طرح دکھائی دے گا جو ہزاروں برس سے اس صدر دروازے کے پاس کھڑا گزرتے ہوئے کارواں کو دیکھتا چلا گیا ہے۔ آپ چاہیں تو اس گزرتے ہوئے کارواں کو اولمپک کے افتتاحی مارچ پاسٹ، سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں بھی پرنس اور قوم کے نمائندے شامل تھے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اولمپک کے شرکاء تو ایک ضابطے اور تنظیم کے تابع ہوتے ہیں مگر درۂ خیبر سے آنے والے کارواں میں جو لوگ شامل تھے وہ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہی کبھی تو محافظ سے برہم ہوتے اور کبھی سینہ چاکان چمن کی طرح اس سینہ چاک ازلی سے بغلگیر ہوتے اور کبھی اس سے بھڑ جاتے ان میں بھیڑ بکریوں کے رکھوالے بھی تھے اور گرد اڑاتے ہوئے شہسوار بھی اور پیدل سفر کرتے خانہ بدوش بھی، آریا بھی یونانی بھی، سکاتھ بھی، کشان بھی، سامی انسل بھی! یہ لوگ جب درۂ خیبر سے گزر کر اپنے سامنے حد نظر تک لہلہاتی ہوئی فصلوں کا ایک قالین سا بچھا ہوا دیکھتے اور جنگلوں کو سایہ کناں، پرندوں کو پرفشاں اور دریاؤں کو رواں دواں پاتے تو پھر اوڈلیسس کے ساتھیوں کی طرح اس خطۂ جنت نشان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رک جانے کا تہیہ کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں وہ 'محافظ' سے راہ و رسم بڑھانے پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ محافظ کی رہنمائی کے بغیر وہ حویلی کی طویل اور پراسرار غلام گردشوں

اور لوالوں تک باسانی نہیں جا سکتے تھے۔ یوں تہذیبوں کا وہ اختلاط وجود میں آیا جس میں محافظ اور سکے کہنے کی ہزاروں برس پرانی اور ترقی یافتہ تہذیب آنے والے قبائل کی متحرک اور سیماب پا تہذیب سے ہمکنار ہوئی اور اس خطے کی اولین تہذیبی بنیادوں کو مستحکم کرتی چلی گئی۔ جسے آج ساری دنیا پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔

خواتین وحضرات!

تہذیبوں کا ملاپ دراصل زبانوں کا ملاپ ہے۔ زبان وہ مشکیزہ ہے جس میں تہذیب کا سارا آب حیات بند ہوتا ہے۔ اگر مشکیزہ پھٹ جائے تو آب حیات ضائع ہو جائے گا جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تہذیب کی شریانوں سے سارا لہو ہی خارج ہو گیا ہے۔ لہٰذا جب درّۂ خیبر سے طلوع ہونے والے پشاور کے مرغزاروں میں آکر آباد ہوئے تو زبانوں کا اختلاط شروع ہوا اور پانی آپس میں ملتے چلے گئے۔ یوں زبانوں کے اس ریختے کی ابتدا ہوئی، جس میں دراوڑی، ویدک، سامی ترکی اور فارسی الفاظ ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت عرصہ بعد اس ریختہ کو اردو کا نام ملا۔ مبادا کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ میں پشاور کو اردو کی جنم بھومی قرار دینے کی کوشش نہیں کر رہا۔ میں تو ان لوگوں سے بھی متفق نہیں ہوں جو اردو کے آغاز کو پنجاب، سندھ یوپی، دکن یا گونڈوانہ تک محدود کرنے میں اپنی تخلیق کا سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ اردو کی ابتدا حویلی کے اندر ہوئی۔ اور یہ حویلی کوہِ سلیمان سے لیکر گجرات کاٹھیاواڑ

تک اور بحیرہ عرب سے لیکر کوہ ہمالیہ تک پھیلی ہوتی تھی۔ گویا تہذیبوں اور زبان کا اختلاط صدر دروازے کے اس طرف شروع ہوا۔ اس طرف نہیں اور اسی لیے پشاور کو اردو زبان کے سلسلے میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ ریختہ کی عظیم الشان تقریب شادی میں پہلا "نیوندرا" پشاور ہی کے گرد و نواح میں ڈالا گیا۔

خواتین و حضرات!

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا، درۂ خیبر کی راہ سے آنے والے، سیاح نہیں تھے جو سیر و تماشہ کی غرض سے آتے ہیں اور پھر ایک روز تھک ہار کر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ تو بال بچوں گدھوں، گھوڑوں مال اسباب، رسوم و رواج حتیٰ کہ مذہبی اعتقادات سمیت یہاں آئے اور درۂ خیبر میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے وہی کام کیا جو مجاہدین نے کشتیوں کو آگ لگا کر کیا تھا۔ یعنی واپسی کی کوئی صورت باقی نہ رہے یہی وجہ ہے کہ جب وہ برصغیر کی عظیم الشان تقریب میں شامل ہوئے۔ تو ان کی حیثیت مہمانوں کی سی ہرگز نہیں تھی نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ جب وہ اس علاقے کے باسیوں کی تہذیب سے متعارف ہوئے تو آہستہ آہستہ ان کی اپنی تہذیبیں اور زبانیں اس علاقے کی قدیم تہذیب اور زبان میں جذب ہوتی چلی گئیں اور ریختہ کے سلسلے میں تو بالخصوص ایک تہذیبی اشتراک کی صورت ابھر آئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو میں متعدد اقوام کے الفاظ محاوروں اور لہجوں کا جو انضمام وجود میں آیا ہے وہ ایک فطری عمل کا نتیجہ ہے۔ نہ کہ شعوری سطح پہ

مرتب کیے گئے کسی منصوبہ کا۔ مگر ریختہ یعنی اردو کی تاریخ میں ایک حادثہ بھی گزرا ہے جو اس کے طویل فطری عمل کی صریحاً خلاف ورزی نظر آتا ہے میرا اشارہ آج سے تقریباً دوسو برس قبل برصغیر ہند و پاک میں انگریز کی آمد کی طرف ہے۔ اگر آریاؤں، سکاتھوں، عربوں، اور عجمیوں وغیرہ کی طرح انگریز بھی اس برصغیر میں مستقل بود و باش کے لیے آتے تو ان کی تہذیب اور زبان یہاں کی تہذیب اور زبان میں اس حد تک شامل ہوتی جس حد تک آویزش اور آمیزش کا فطری عمل اس کی اجازت دیتا۔ مگر ہوا یہ کہ انگریز یہاں آئے انھوں نے دیکھا، انھوں نے فتح کیا اور پھر لوٹ مار میں مصروف ہو گئے۔ پھر جب جی بھر کر لوٹ چکے تو ایک روز اپنی تہذیب کے جوتے یہاں چھوڑ کر جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس چلے گئے۔ ویسے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس برصغیر میں باقی جملہ اقوام اور گروہ تو صدر دروازے سے داخل ہوئے تھے لیکن انگریز چور دروازے سے داخل ہوئے اور پھر چور دروازے ہی سے رخصت ہو گئے۔ چونکہ اس برصغیر کی ہزاروں برس پھیلی ہوئی تاریخ میں انگریزوں کے قیام کا عرصہ بحد قلیل تھا لہٰذا اصولی طور پر یہ لازم تھا کہ یہاں کی تہذیب اور زبان پر اس کے اثرات بھی بالکل معمولی نوعیت کے ہوتے۔ اتنے معمولی کہ آج وہ ہمیں نظر بھی نہ آتے لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ یہ اثرات اتنے زیادہ اور اس تیزی سے بڑھ رہے ہیں کہ بہت جلد ان کے سوا شاید اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ حالانکہ یہ بات علم اللسان

کے جملہ اصولوں کی صریحاً خلاف ورزی ہے کیوں کہ جب تک کوئی قوم کسی خطے میں منتقل بود وباش نہ اختیار کرے اس کی تہذیب اور زبان کم از کم اس خطے میں باقی نہیں رہنی چاہیے لہٰذا سوچنے کی بات ہے کہ ہم سے کیا غلطی سرزد ہوئی کہ جن کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہمارا گھر اسی طرح آسیب زدہ ہے اور جن کی نشانیاں روز بروز زیادہ بڑی تعداد میں ظاہر ہو رہی ہیں کہ خطرہ ہے کہیں وہ ہماری تہذیب اور زبان پر پوری طرح مسلط نہ ہو جائیں۔ اور ہماری تہذیبی شخصیت ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ آج صورت یہ ہے کہ انگریزی الفاظ جب اوپر سے لڑھکتے ہیں تو گاؤں کی سطح تک فتح کے شادیانے بجاتے اتراتے چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے اس سفر میں وہ دیسی الفاظ کو دھکے دے کر ہٹاتے اور ان کی مسندوں پر قابض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ کیا استحصال اور دھاندلی کی بدترین صورت نہیں؟ پھر اس کا ایک بہت بڑا نقصان تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے بھی ہے۔ ہر لفظ کی ایک اپنی شخصیت، اپنا مذہب، اپنا زاویۂ نگاہ اور تہذیبی سمت ہوتی ہے اور اسی لیے جب کسی ایک زبان کے الفاظ کو کسی دوسری زبان کے ایوان میں داخل ہونے کی کھلی چھٹی مل جائے تو وہ زود یا بدیر اس زبان کے تہذیبی مزاج ہی کو بدل کر رکھ دیتے ہیں کیا یہی کچھ ہمارے وطن عزیز میں نہیں ہو رہا؟ کیوں کہ یہاں انگریزی زبان کے الفاظ اپنے ساتھ ایک اجنبی تہذیب بھی لا رہے ہیں درآنحالیکہ اس زبان اور اس کی تہذیب کے نام لیوا خود یہاں سے ہزاروں کوس دور اپنے دیس کی چار دیواری

میں سمٹے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک بالکل مصنوعی صورت حال ہے جسے اگر بروقت نہ روکا گیا تو اس سے ہماری قومی زبان ہی نہیں ہماری علاقائی زبانیں حتیٰ کہ ہماری تہذیب بلکہ قومی شخصیت تک کے مسخ ہو جانے کا خطرہ ہے۔

خواتین و حضرات!

اردو کی بے بضاعتی، مفلسی اور تنگ دامانی کے طعنے سنتے سنتے ہمارے کان پک چکے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پچھلے ۲۸ برس میں اردو زبان بالخصوص اردو نثر نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ وہ اب مغرب کے مشکل سے مشکل علوم تک کو نحوٌن کی سی سادا زبان میں بیان کرنے پر پوری طرح قادر ہو چکی ہے۔

کسی زبان کا امتحان لینا مقصود ہو تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ باہر کی کسی ترقی یافتہ زبان میں لکھے گئے مضامین نظم و نثر کو اس زبان میں منتقل کیا جائے۔ اور پھر دیکھا جائے کہ کیا اس زبان میں اتنی سکت ہے کہ وہ باہر کی زبان میں لکھے گئے مضامین کے انتہائی لطیف مطالب کو گرفت میں لے آئے

اردو زبان اس امتحان سے بار بار گزری ہے اور کئی بار تو اس خوبی سے گزری ہے کہ ترجمے نے اصل کی جاذبیت اور دقار میں اضافہ کر دیا ہے۔ اگر یہ بات ہے (اور یقیناً ہے) تو پھر اردو کی تنگ دامانی اور بے بضاعتی کا خیال جس قدر جلد اذہان

سے محو ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

خواتین و حضرات!

میں اس روز کے انتظار میں ہوں جب میں صبح سویرے اٹھوں اور میرا بیٹا اخبار لیے بھاگتا ہوا میرے پاس آئے اور کہے کہ تمام تعلیمی اداروں میں انگریزی کو لازمی کے بجائے اختیاری مضمون کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ اور تمام سرکاری شعبوں میں انگریزی کے بجائے اردو کو فوری طور پر رائج کر دیا گیا ہے۔ جس روز یہ خبر مجھ تک پہنچی میں سمجھوں گا کہ آج ہم نے قومی اور ملکی اتحاد کی طرف اپنا پہلا قدم اٹھایا ہے اور قومی تشخص کے لیے زمین پوری طرح ہموار کر دی ہے! شکریہ!

(قومی زبان کانفرنس پشاور میں پڑھا گیا)

الیاس عشقی

حقیقتِ زمان

(بحوالہ زمان و مکان)

مسئلہ زمان و مکان ہمیشہ سے فلسفیوں اور فلسفے سے دلچسپی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ خاص طور سے مسئلہ زمان اپنی اہمیت کی وجہ سے اکثر زیرِبحث رہا ہے۔ کچھ دن سے لوگ یہ سوال بھی اٹھانے لگے ہیں کہ مسلمان فلسفیوں نے اس موضوع پر کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کیا وہ صرف یونانی فلسفیوں کے خیالات کا اعادہ کرتے رہے ہیں یا انھوں نے اس سلسلے میں خود بھی غور و فکر کیا ہے اور اگر کیا ہے تو ان کے خیالات کیا ہیں۔ اس باب میں علیحدہ علیحدہ فلسفیوں کے خیالات پیش کرنا تو اس وقت

دشوار نظر آتا ہے اور شاید عام طور پر لوگوں کو اس سے دلچسپی بھی نہ ہو لیکن کچھ لوگ مسلمان مفکرین کے خیالات معلوم کرنے کے خواہش مند ضرور ہیں۔ زمان کا مسئلہ مکان سے جو تعلق رکھتا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اس لیے زمان و مکان کے بارے میں چند باتیں تمہید کے طور پر عرض کر دینا شاید بے محل نہ ہوگا۔

زمان و مکان کے تعلق کو واضح کرنے کی کوشش ہمیشہ کی جاتی رہی ہے۔ مسلمان مفکرین نے بھی اس سلسلے میں کافی غور و فکر کیا ہے انھوں نے زمان و مکان کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے تخم اور درخت کی تمثیل پیدا کی اور جو کچھ بتایا اس کا ماحصل یہ ہے کہ تخم جب پھل سے علیحدہ ہوتا ہے تو اس کی ایک جداگانہ حیثیت متعیّن ہوتی ہے اور زمان و مکان کی ایک صورت بنتی ہے۔

اب تخم کی حیثیت سے اس کا زمان شروع ہوتا ہے۔ اور جہاں وہ موجود ہوتا ہے وہی اس کا مکان ہوتا ہے۔ زمان اور مکان کی ایک اور صورت بھی ممکن ہے۔ اگر اسی تخم کو زمین میں بو دیا جاتا ہے اور آبیاری کی جاتی ہے تو اس کی روئیدگی کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور چوں کہ تخم میں پودا، درخت اپنی ساری تفصیلات کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور یہ بھی پہلے سے قدرتی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پودے کے درخت بن جانے کے بعد اس کی اونچائی کتنی ہوگی۔ اس کے تنے کا قطر کتنا ہوگا اس کی شاخیں کتنی ہوں گی ہر شاخ میں کتنی ٹہنیاں ہوں گی ہر ہر ٹہنی میں کتنے پتّے ہوں گے، ہر موسم میں اس میں کتنے پھول کھلیں گے، ان سے کتنے پھل پیدا ہوں گے اور

ہر پھل میں کتنے بیج ہوں گے وغیرہ وغیرہ ۔

ابھی وہ درخت ایک چھوٹا سا پودا ہے جس میں ایک تناور اور گنجان درخت بننے کی صلاحیت موجود ہے لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اس کی شاخوں، ٹہنیوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں وغیرہ کیلیے ابھی سے فضا میں مکان مقرر ہو چکا ہے جہاں ہر چیز کو ایک دن پہنچ کر قیام کرنا ہے۔ اور اس مکان کو اس درخت کی مدت عمر تک برقرار رہنا ہے۔ یہ سب کچھ ایک زمان میں وقوع پذیر ہوگا جو اس درخت کی مدت عمر پر محیط ہے۔ زمان و مکان کا یہ تعلق اس قدر بصراحت اور بامعنی انداز میں اس سے پہلے کبھی کہیں بیان نہیں ہوا۔ عام طور پر مکان کسی زمان میں واقع ہوتا ہے۔ لیکن اس مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمان سے پہلے ہی اس درخت کے مختلف اجزاء کے لیے فضا میں مکان مقرر ہو چکا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ ہوا اور آندھی کے دوران اس درخت کی شاخیں مع اپنے متعلقات کے کسی حد تک اپنا مکان تبدیل کرتی رہیں گی۔ یعنی فضا میں ہوا اور آندھی کے دوران اس کی شاخیں کتنی کتنی دور تک جھوم کر پہنچیں گی۔

اسی طرح ایک بامعنی تمثیل ہے جس میں ایک ایسا سوال اٹھایا گیا ہے جس کا جواب دینا آسان نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک کمرے کا تصور کیجیے جس میں استعمال کی معمولی چیزیں موجود ہیں۔ اس کمرے کی فضا ہوا سے پُر ہے۔ رات کے وقت اس کمرے میں ہوا اور تاریکی ہوگی۔ اب اس میں ایک شمع روشن کر دیجیے تو ہوا کے ساتھ اس میں روشنی بھی موجود ہوگی۔ شمع کو کسی رنگین شیشہ سے ڈھانپ دیجیے تو ہوا اور روشنی کے ساتھ اس

میں رنگ بھی شامل ہو جائے گا۔ پھر اس میں لوبان جلایئے اب اس کمرے میں ہوا، روشنی اور رنگ کے ساتھ خوشبو کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ یہ ساری چیزیں ایک ہی زمان میں اس کمرے کی فضا میں موجود ہوں گی۔ ان میں سے ہر چیز اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے، ہوا سے روشنی روشنی سے رنگ، اور ان تینوں سے خوشبو ممیّز ہے اور کمرے کی فضا میں جہاں خلا ہے یہ ہر جگہ موجود ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک زمان میں ان کا علیحدہ علیحدہ مکان ہے یا نہیں، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ابھی تک نہیں دیا گیا۔

زمان کو عام طور پر ماضی حال اور مستقبل میں تقسیم کیا جاتا ہے اور یہ تقسیم لمحۂ موجود سے متعیّن ہوتی ہے جب زمان میں تسلسل ہے تو اسے ماضی، حال اور مستقبل میں کب سے اور کیونکر تقسیم کیا جائے اس کو بھی ایک تمثیل سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس تمثیل کو ہم ایک جدید اور سائنسی تجربے کا نام بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ایک ساز لیجیے اور اس کے ایک پردے پر انگلی رکھیے جو آواز نکلے گی وہ حال ہے اس سے آگے کا پردہ مستقبل ہے۔ اس پر انگلی رکھیے تو اس کی آواز حال ہے۔ اس وقت تک اس سے پہلے کا سُر ماضی میں غائب ہو چکا ہے اسی طرح ہر سُر جو نکل رہا ہے حال، جو نکل چکا وہ ماضی ہے اور جو آنیوالا سُر ہے وہ مستقبل ہے۔ اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ ایک بڑے زمانے میں ماضی حال اور مستقبل کی تقسیم دراصل ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ کسی واقعہ یا حادثے کو نقطۂ آغاز بنا کر زمانے کا تعین کیا جاتا ہے ورنہ ہر لمحۂ موجود ماضی حال اور مستقبل کا فیصلہ کرتا ہوا گزرتا ہے۔

مکان کے مسئلے سے قطع نظر جو دراصل زمان ہی میں طے ہوتا ہے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ

زمان کو سمجھنے کے لیے مسلمان مفکرین نے جو غور و فکر کیا ہے اس کی ماہیت، نوعیت اور حقیقت کیا ہے۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے مسلمان صوفیاء کی فکر کے بنیادی عناصر کو سمجھنا ضروری ہے۔

در اصل زمان کا مسئلہ وجود کے مسئلے کا شاخسانہ ہے۔ مسلمان صوفیاء نے جن میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ، رومیؒ، جامیؒ اور دوسرے اکابر شامل ہیں وجود کو چھ مرتبوں میں تقسیم کیا ہے جنہیں مراتب ستّہ یا مراتب نزولی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔

(۱) احدیت (۲) واحدیت (۳) واحدیت

یہ وجود کے وہ مراتب ہیں جن میں سے پہلے کا تو ادراک ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دو مراتب اضافی طور پر عقل اور منطق کی گرفت میں آ سکتے ہیں لیکن ان کا ادراک بمشکل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد کے تین مراتب یہ ہیں:۔

(۱) روح (۲) مثال (۳) جسم

روح کا مسئلہ ہمیشہ مابہ النزاع رہا ہے لیکن عالم مثال جس میں انواع کا ادراک ہو جاتا ہے شعور میں آتا ہے اور جسم میں انواع کا تشخص ہوتا ہے پوری طرح فہم و ادراک میں آجاتا ہے یہ سب کچھ کسی نہ کسی زمان میں موجود ہے اور ادراک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں زمان (TIME) کا سلسلہ یوں بنتا ہے اس کے مدارج اور مراتب کا خلاصہ یعنی تقسیم یہ ہے۔

(۱) فرمان الٰہی جس کا ادراک مقام احدیت کی طرح ناممکن ہے،

زمانِ الٰہی مقام احدیت میں موجود ہے - اس سے علیٰحدہ اور ممیز نہیں ہے اس لیے فی الحال بحث سے خارج ہے۔

(۲) زمان سرمدی۔ یہ زمان الٰہی میں موجود ہے لیکن اپنے مرتبے میں اس سے علیٰحدہ اور ممتاز ہے۔ اس کا ادراک عقلی ہونے کے اعتبار سے بالواسطہ اور اضافی طور پر ممکن ہے۔ زمان نزّی اور ہر قسم کا زمان، زمان الٰہی ہی سے ماخوذ ہے یعنی اس کے کسی نہ کسی مرتبۂ نزولی سے متعلق ہے۔ زمان سرمدی، مرتبۂ وحدت میں موجود ہے اور ہم اسے زمان کے ہر درجہ میں موجود پاتے ہیں۔ دراصل آج کی اصطلاح میں یہ ایک (ETERNAL NOW) دائمی لمحہ موجود ہے۔

(۳) زمان ابدی۔ جسے (ABSOLUTE TIME) کہہ سکتے ہیں اس کا ادراک عام طور پر کرلیا جاتا ہے اور یہ فلسفے میں اکثر زیر بحث آتا ہے۔ یہ مرتبۂ واحدیت سے متعلق ہے اس کا تصوّر ازل اور ابد کے درمیان کیا جاتا ہے۔ (زمان کے یہ تین مرتبہ ہیں جن میں سے ایک ناقابل ادراک اور دو عقلی اور منطقی طور پر کسی نہ کسی طرح قابل ادراک ہیں۔)

(۴) زمان روحی:۔ یہ روح کا مرتبہ ہے اور اس کا ادراک روح کے ادراک پر مبنی ہے۔

(۵) زمان مثالی:۔ یہ مرتبۂ مثال سے متعلق ہے اور اس کا ادراک عالم مثال کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے اسے (CATA GORIES) سے متعلق سمجھنا چاہیے) اس زمان کا تصور

زمانِ وجودی کی زندگی کے متوازی ہے اور اس کا ادراک اسی کے ساتھ مسلسل ہونے کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔

(۶) زمانِ وجودی (مادی) یہ جسم کے مرتبے سے متعلق ہے زمان کی تمام قسمیں جن پر کسی نہ کسی طرح فلسفے اور تصوف یا کسی اور صورت میں بحث کی جاتی ہے۔ اسی زمانے سے متعلق ہیں۔ چنانچہ مذکورہ تقسیمِ زمان کے ذریعے اس کا تعلق بالآخر زمانِ الٰہی تک پہنچ جاتا ہے۔ زمانِ وجودی کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) زمانِ کائناتی :- اس کا تعلق کائنات کی لامتناہی وسعتوں سے ہے۔

(ب) زمانِ ارضی :- اس کا تعلق کرۂ ارض سے ہے۔

(ج) زمانِ اضافی :- یہ زمان، ارضی اور کائناتی زمان میں ربط پیدا کرتا ہے۔ ان کی تصدیق کرتا ہے اور ان کے تعلق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی "زمان" اعتدالی کہلاتا ہے۔ جسے آئن اسٹائن نے کائنات میں چوتھے بُعد سے تعبیر کیا ہے۔

زمانِ کائناتی کی دو قسمیں ہیں جن کا ادراک کرہ ارض پر ہوتا ہے۔

(الف) زمانِ آفاقی :- یہ کرۂ ارض پر زمان کی وسعتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور اسی سے زمانِ کائناتی کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

(ب) زمانِ دَوری :- یہ کرۂ ارض کا عام زمان ہے

جو شمس و قمر کی گردش اور زمان کے پیمانوں مثلاً ساعت۔ (گھڑی) سے متعین ہوتا ہے اسے "زمانِ ساعت" بھی کہہ سکتے ہیں۔

زمانِ دوری کی تین قسمیں ہیں :۔

(الف) زمان شعوری

(ب) زمان غیر شعوری

(ج) زمان بے شعوری

(الف) زمان شعوری ـــــ انسان کے شعور کا عام تصوّر زمان ہے۔

(ب) زمان غیر شعوری یا عدم شعوری جانوروں کا زمان ہے جس کا ان کو شعور و ادراک نہیں ہوتا۔ صاحب شعور اس کا ادراک کر سکتا ہے۔ ماں کے پیٹ میں بچّے کا زمان بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

(ج) زمان بے شعوری یا زمان لاشعوری یہ ان اذہان میں موجود ہوتا ہے جن کا شعور معطل ہو چکا ہو اور جو ذہنی طور پر ایک ایسے زمان میں زندہ رہتے ہیں جن کا ادراک ان کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔ زمان شعوری کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(الف) زمان غیر حقیقی (زمان باطل) جس میں تمام عالم انسانیت ایک غیر شعوری کیفیت میں میکانیکی طریقے سے زندگی گزارتا ہے اس کا ادراک نابغۂ روزگار لوگوں کی فکر اور کارناموں کے ذریعہ ہوتا ہے جو روح عصر کی تشکیل میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ان کے فکر و عمل زندگی کو ایک

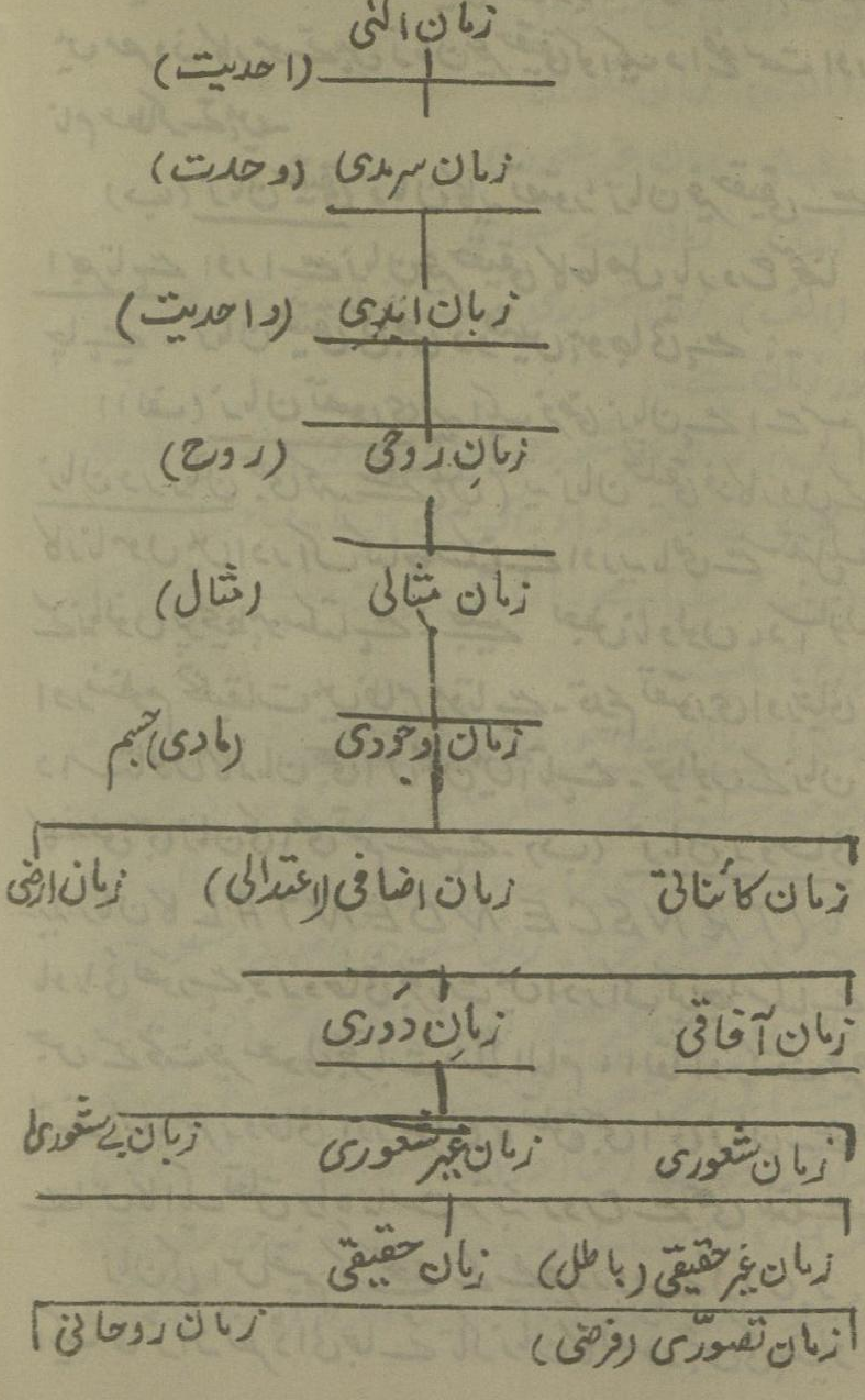
بامعنی اور بامقصد طریقے سے ظاہر کرتے ہیں۔ فلسفی، سیاسی منفکرین، سائنسدان اور تخلیقی فنکار جو زندگی کے عام ہنگاموں میں مصروف کار ہوتے ہیں زمان غیر حقیقی کو ایک واضح سمت اور نام عطا کرتے ہیں۔

(ب) زمان حقیقی زمان کا یہ تصوّر، زمان غیر حقیقی سے ابھرتا ہے اور اسے زمان غیر حقیقی کا حاصل یا روح سمجھنا چاہیے۔ زمان حقیقی کی بھی دو قسمیں ہو جاتی ہے :-

(الف) زمان تصوری (یہ ایک فرضی زمان ہے اسے ہم زمانِ در زمان بھی کہہ سکتے ہیں) یہ زمان تخلیقی فنکاروں کے کارناموں میں ادراک کیا جاسکتا ہے اور یہ ماضی سے مستقبل تک کے زمانوں پر محیط ہوسکتا ہے۔ جیسے بعض ناولوں، داستانوں اور منظوم تخلیقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ قدیم تصوری اور خیالی داستانوں کا زمان بھی اس ضمن میں آتا ہے۔ خوابوں کے زمان کا تعلق بھی زمان کی اسی قسم سے ہے۔ (ب) زمان روحانی یہ زمان کا (TRNSCENDENTAL) یا ماورائی تصوّر ہے جو روحانی تجربات میں ادراک کیا جا سکتا ہے جس کے تحت غیر معمولی تجربات مثلاً الہام، القا اور کشف وغیرہ آتے ہیں، سیر روحانی اور معراج کا تعلق بھی اسی زمان سے ہے اس کا ایک تعلق براہِ راست مرتبۂ روح سے بھی بنتا ہے۔

زمان کی اس تقسیم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ زمان کا تصوّر جس کی بنیاد

مسلمان فلسفیوں اور صوفیاء کے افکار و مشاہدات یہ ہے اپنے
دلچسپ تسلسل کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے۔



اس تقسیم سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسلمان مفکرین اور صوفیاء نے مسئلہ زمان و مکان پر کس تفصیل کے ساتھ غور و خوض کیا ہے اور اس کے کن کن شعبوں اور کن کن جہات کا پتا دیا ہے اس وضاحت کے بعد یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ مسئلہ زمان و مکان، شعور اور ادراک کا مسئلہ ہے۔ جو وجود بلکہ انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیوں کہ انسان کا وجود در اصل شعور کا وجود ہے۔ اگر شعور کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو زمان اور مکان کا مسئلہ بھی باقی نہیں رہتا۔ زمان وجود کے مختلف مراتب کے درمیان ایک رشتۂ ادراک و شعور قائم کرتا ہے جو مراتب وجود کے سمجھ لینے کے بعد واضح ہو جاتا ہے اور اس کی وضاحت اور تفہیم سے بہت سی فکری اور فلسفیانہ الجھنوں کو سمجھنے اور ان کا حل دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مگر خود یہ مسئلہ مسائلِ وجود کو سمجھے بغیر حل نہیں ہوتا۔

سلیم احمد

"گڈ باۓ ٹو سرسیّد"

خوش قسمتی سے یا بد قسمتی سے مجھے سرسید احمد خاں کے مخالفوں میں سمجھا جاتا ہے بہت سے لوگ مجھے اس کی داد دیتے ہیں۔ بہت سے فریاد کرتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے جو خود بھی سرسیّد سے زیادہ خوش نہیں ہیں ایک دفعہ میرے بارے میں لکھا ہے۔ کہ میں نے سرسیّد کے خلاف لکھ لکھ کر خوب شہرت کمائی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد پر میں نے ایک آدھ کالم یا جہاں تہاں دو چار فقروں کے سوا اور کچھ لکھا ہی نہیں ــــ البتہ حالؔی کے خلاف میں ضرور لکھتا رہا ہوں لیکن مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ حالؔی پر جو کچھ لکھوں گا۔ وہ بھی سرسیّد کے خلاف سمجھا جائے گا۔ پھر ادب میں یہی ایک تصوّرِ مخالفت یا موافقت ہے جو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک سطح پر تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن عام طور

پر اس کے معنی بہت پست ہو تے ہیں اس میں ذاتی معاملات کی سی بُو آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ادبی، نظریاتی یا اصولی بات کا محرک کوئی ذاتی جذبہ ہو۔ میں ذاتی جذبے اور ذاتی معاملے کا بھی قائل ہوں زندگی بہت بڑی حد تک انھیں دو چیزوں کا نام ہے۔ مگر افسوس کہ اس کی بھی ایک پست سطح ہے۔ جو میرے معیار کے مطابق نہیں جن معنوں میں لوگ ذاتی مخالفت یا موافقت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان معنوں میں مَیں اپنی ذات کا کوئی علم نہیں رکھتا ایسا ذاتی تعلق تو مجھے اپنے بچّوں سے بھی نہیں ہے۔ بچّوں کے لیے مَیں جان دے سکتا ہوں اصول نہیں دے سکتا۔ جھوٹی گواہی نہیں دے سکتا۔ کسی سے بے جا دشمنی یا دوستی نہیں پال سکتا۔ میری ذات میرے اصولوں اور معیاروں کے ساتھ میری ذات ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور ذات مجھ میں موجود ہے تو میں اسے "بد ذات" سمجھتا ہوں۔

لیکن حاؔلی سے میں نے کبھی بد ذاتی نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بچپن ہی سے حاؔلی سے ایسی محبت رہی ہے کہ اردو کے کم ادیبوں سے رہی ہے۔ اس آدمی میں کیسی سچّی شرافت اور دردمندی تھی۔ رہ گئی اس کی ادبیت تو میں ہی کیا اردو کا کوئی ادیب ہے جو ادب پہ بات کرتا ہے اور حاؔلی کے بغیر لقمہ توڑ سکتا ہے میرے دوست ضیا جالندھری نے کہا۔ آپ ہر بات میں حاؔلی کا تذکرہ کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کیا کروں ادبی دریا کی یہ وہ مچھلی ہے۔ کہ جس کنارے پر شست پھینکتا ہوں ہر جگہ حاؔلی نکل آتا ہے۔ غزل میں وہ ہے۔ تنقید میں وہ ہے سوانح عمری میں وہ ہے۔ نظم

میں وہ ہے، مضمون نگاری میں وہ ہے۔ حالیؔ تو ہمارے جدید ادب کا کابوس ہے۔ حالیؔ سے کون بچ سکتا ہے۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند سب زلف حالی کے اسیر ہیں۔ میں تو حالی سے اتنا متاثر ہوں کہ شیروانی پوشی ہی میں نہیں غزل نویسی میں بھی اُن کی نقل کرتا ہوں۔ اور کئی غزلیں حالیؔ کے رنگ میں کہی ہیں ان کا لب و لہجہ بار بار میرے لب و لہجہ میں گونجنے لگتا ہے۔ مفلر البتہ نہیں باندھتا حالیؔ کی قدرشناسی کے لیے یہ بھی ضروری ہو تو باندھ سکتا ہوں۔ مگر حالیؔ سے میرا اختلاف (مخالفت نہیں) بہت بنیادی ہے۔ یہ اختلاف کبھی کبھی جہاد کو ضروری بنا دیتا ہے۔ اور جہاد کا اصول ضرب کاری ہے۔ جو لوگ سرسیدؔ کو سمجھتے ہیں۔ نہ حالیؔ کو نہ ادب کو۔ انھیں بظاہر میرے اس رویّے سے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر تکلیف کے اسباب بھی مختلف ہیں۔ کوئی حالیؔ کو ترقی پسندی کا باوا سمجھتا ہے، اس لیے بگڑ جاتا ہے۔ کوئی اسلام اور مسلمانوں کا محسن سمجھتا ہے اس لیے خار کھاتا ہے۔ میں بات حالی پر کرتا ہوں۔ اور لوگ سمجھتے ہیں۔ ان پر تنقید کی جا رہی ہے۔ اس لیے اپنی روح کی تکلیف کو حالیؔ کی روح کی تکلیف سمجھ لیتے ہیں کچھ دوستوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ہر طرح کے لوگوں کو ناراض کرنے سے بہتر یہ ہے کہ نام لیے بغیر بات کی جائے نام اگر علامت نہ ہوں۔ تو مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔

بعض نام قومی یا آفاقی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں اور میں بہت سے ایسے نام بھی سنتا ہوں۔ جو میرے لیے ذاتی علامت ہیں۔ یہ گم نام اور کم حیثیت لوگوں کے نام ہیں اور اکثر لوگ ان کے

تذکرے سے بھی چڑ جاتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں مجھے تو اپنی بچی میں بھی ایک علامتی معنی نظر آتے ہیں۔ پھر لوگوں کو خوش کرنا میرے کس کام آئے گا مجھے کون سا عہدہ یا مرتبہ لینا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں مَیں نے اپنے ایک مضمون میں اپنے اس منشور کا اعلان کیا تھا کہ گلے میں سونے کا تمغہ ڈال کر ادب کی خدمت کی تو کون سا تیر مارا، روکھی سوکھی کھا کے ادب کے لیے کچھ کرسکوں تو البتہ ایک بات ہوگی ایسی باتوں کو لوگ باتیں بنانا سمجھتے ہیں۔ اور ہمیشہ ایسی باتیں بنا کر "آمدم بر سرِ مطلب" کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ادب میرے لیے ہمیشہ مقصود بالذات رہا۔ کبھی کسی اور چیز کے حصول کا ذریعہ نہیں بنا۔ اگر کوئی اسے "انگور کھٹے ہیں" کا معاملہ سمجھتا ہے تو یہ خوش خیالی اسے مبارک ہو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ انگور میرے لیے اتنے کھٹے کبھی نہیں تھے جتنے ان لوگوں کے لیے تھے جنھوں نے ادب میٹھا بنا لیا ہے۔ ویسے اگر نام نہ لینے کے اصول کو اختیار بھی کروں تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہوگی یعنی ان لوگوں کا نام لینا چھوڑ سکتا ہوں۔ جن کے خیال یا تجربے سے موافقت رکھتا ہوں ان لوگوں کا نام لینا پھر بھی ترک نہیں کروں گا۔ جن سے اختلاف رکھتا ہوں۔ کیوں کہ قرآن حکیم میں (ابوبکرؓ وعمرؓ) کے نام نہیں لیے گئے مگر ابولہب کا نام لیا گیا ہے۔ کبھی کبھی مصالحت یا منافقت سے بچنے کے لیے دشمن اور مخالف کا نام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

خیر تو حالی اور سر سیّد سے میری کیا مخالفت ہو سکتی ہے۔ غور کیجیے انھیں مرے ہوئے زمانہ ہو گیا۔ میں تو جب پیدا بھی نہیں ہوا

تھا۔ پھر یہ کوئی خاندانی، نسلی یا قبائلی تنازعہ بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میں مُردوں سے لڑنے کو تضیع اوقات بھی سمجھتا ہوں۔ اور خلافِ شریعت بھی جو مر گیا قابلِ معافی ہے۔ اور لاش کا مُثلہ کرنا حرام ہے۔ حالیؔ اور سر سیدؔ سے میری لڑائی مُردوں سے لڑائی نہیں ہے ایسے زندوں سے ہے جو زندوں سے زیادہ زندہ ہیں۔ میں حالیؔ کو ادب کی ہر صنف میں زندہ دیکھتا ہوں اور سر سیدؔ کو ہر اصلاحی تحریک میں۔

سر سیدؔ اصلاحی تحریکوں میں بھی زندہ ہیں اور نظامِ تعلیم میں بھی۔ اور جدید مذہبی فکر میں بھی یہ سر سیدؔ ہی ہیں جو اس وقت بولنے لگتے ہیں جب قوم کے کسی زوال۔ انحطاط یا غلط اقدام پر شور مچایا جاتا ہے۔ یہ سر سیدؔ ہی ہیں جنھوں نے ہمارے پورے نظامِ تعلیم کو کاندھوں پہ اٹھا رکھا ہے۔ یہ سر سیدؔ ہی ہیں جو کبھی پرویز میں بولتے ہیں کبھی غلام جیلانی برق میں۔ شبلیؔ، اقبالؔ، مولانا مودودی علامہ مشرقی سب کو تھوڑے تھوڑے اختلاف سے ان کا فیض پہنچا ہے یہاں تک کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی۔ ان میں سے جو لوگ سر سیدؔ سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ تو وہ ایسا ہے جیسے باپ اور بیٹے میں ہوتا ہے۔

مجھے سر سیدؔ سے نہ ذاتی اختلاف ہے۔ نہ باپ بیٹے کا۔ سر سیدؔ سے میرا اختلاف ایسا ہے جیسے دن کو رات سے ہوتا۔ چلیے آپ مجھے رات اور انھیں دن سمجھ لیجیے۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے نہ کبھی ان کی تحریکِ اصلاح کا فیض پہنچا نہ تحریک مذہبی کا۔ یہاں تک کہ نظامِ

کا بھی نہیں۔ میں نے ان کے نظام تعلیم سے اتنا واسطہ بھی نہیں رکھا کہ ان کی دی ہوئی ڈگری سے روٹی کماتا۔ میں نے روٹی ان کی مدد اور سند کے بغیر کھائی ہے۔ مگر سرسیدؒ سے میرا اختلاف مجھ پہ الہام نہیں ہوا ہے میں بھی اسی ماحول میں پیدا ہوا تھا جس کے سنگِ بنیاد پر سرسید کا نام لکھا ہوا ہے۔ ماحول وہی تھا۔ عام خیالات وہی تھے نظام تعلیم وہی تھا۔ یہاں تک کہ نصاب بھی۔ لوگ ان سب چیزوں سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ اور زندگی بنا رہے تھے جس طرح چشموں پر پیاسوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک دنیا سرسیدؒ کے تخلیق کردہ حوض کے گرد جمع تھی۔ اور سیراب ہو رہی تھی۔ ادیب شاعر، مصلح، ڈاکٹر، انجینئر، صحافی، لیڈر کون ہے جس نے اسی گھاٹ پر پانی نہیں پیا۔ میں بھی پینا چاہتا تھا مگر پہلے ہی چلوؔ میں الّو ہوگیا۔ اس کا ذائقہ اتنا تلخ اور بدبودار لگا کہ پینے کی ہمت نہ پڑی۔ دوستوں نے سمجھایا۔ عزیزوں نے نصیحتیں کیں بزرگوں نے ڈرایا دھمکایا، ہمدردوں نے کہا بھوکے مروگے۔ استادوں نے کہا فیض اٹھاؤ کانے ہو اندھوں میں راجا ہو جاؤ گے۔ میں جانتا تھا۔ کہ سب سچ کہتے ہیں۔ مگر اللہ اکبر غرورِ تشنگی بھی کیا شے ہے۔ میں نے چلّو کا پانی اچھال دیا۔ اور پیاسے کا پیاسا اپنی راہ پر چلدیا۔ اس نظامِ تعلیم سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ لیا۔ آج تک اسے استعمال نہیں کیا۔ کیوں کہ کہیں درخواست ہی نہیں دی خدا بخاری صاحب کا بھلا کرے انہوں نے تعلیم پوچھے بغیر اسٹاف آرٹسٹ بنا دیا تھا۔ ساری زندگی میں صرف ایک بار سرٹیفکیٹ کی ضرورت

پڑی وہ بھی تاریخ پیدائش کی تصدیق کے سلسلے میں۔

بزرگ کہتے ہیں سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر پالنا اچھی بات نہیں۔ میں سمندر میں ہوں اور مگرمچھ کے بچوں سے تو اب بھی مفر نہیں۔ ہر طرف سرسیّد کے جال پھیلے ہوتے ہیں اور جالوں کے سرے سرسیّد کے وارثوں نے تھام رکھے ہیں۔ نکل جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ ایک کڑی توڑتا ہوں دوسری میں پھنس جاتا ہوں بقول جمیل الدین عالی "مچھلی بچ کر جائے کہاں جب جل ہی سارا جال"، یہ جل نہیں اجل ہے۔ پانی نہیں زہر ہے کچھ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ باپ سے روٹھے ہوئے ہیں۔ لڑتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں، کبھی کبھی دھوکے میں ان کو اپنا ساتھی سمجھ لیتا ہوں۔ مگر آخر میں وہ بھی سرسیّد کے چہیتے نکل جاتے ہیں اور طنز کرنے لگتے ہیں۔ کہ سلیم احمد سرسید کے خلاف لکھ کر خوب شہرت کمائی ہے۔ شہرت کا معاملہ یہ ہے کہ میں ۲۳ برس سے ریڈیو میں ہوں۔ ۱۸ برس سے فلم میں۔ ریڈیو، فلم، ٹیلی ویژن وصحافت شہرت کے وہ ذرائع ہیں کہ کسی ایک کو ہاتھ لگ جائے تو سات پشت کی عاقبت سنور جاتی ہے۔ میری شہرت کا یہ عالم ہے کہ سلیم احمد شاعر کو الگ سمجھا جاتا ہے۔ سلیم احمد ڈرامہ نویس کو الگ۔ سلیم احمد فلم نویس کوئی اور ہے۔ سلیم احمد جس کے کالم چھپتے ہیں۔ کوئی اور ہے۔ محلے کے بچے تک نہیں پہچانتے ایک ادیب سے ایک ناول کی ڈرامائی تشکیل کی   تو انھوں نے کہا۔ یہ کون سلیم احمد ہیں۔ ایک سلیم احمد کو تو میں جانتا ہوں جو تنقید اور شعر لکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہ عالم ہے۔ کہ ایک اخبار

میں میرے کچھ اشعار انتخاب کیے گئے۔ تو اخبار والوں نے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ سلیم احمد ڈرامہ نویس کی حیثیت سے تو جانے جاتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ مجھ پر تو زندگی بھر کے تجربے سے کھل گیا۔ کہ شہرت ایک سراب ہے اور بلبلہ ہے۔ شہرت کمانا مقصود ہوتا تو سرسید کی مداحی میں مدلل کتاب لکھتا اور رگلڈ سے انعام پاتا۔

لیکن ایک راستہ سرسید کی شاہراہ سے الگ بھی موجود تھا۔ یہ بھی ایک سراب کی شاہراہ تھی اس پر غزالی اور رازی کی سواریاں چلی تھیں۔ اور سلاطین زمانہ رکاب تھامے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ ہزاروں غلام جلو میں ہوتے تھے۔ اور قدم قدم پر زر و جواہر کی بارش ہوتی تھی۔ مگر زمانے کی دست و برد سے یہ سڑک ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس کے دو رویہ لگے ہوئے درخت جھنکاڑ بن چکے تھے۔ سرائیں اور منزلیں اجاڑ ہو چکی تھیں۔ چلنے والوں کی بھیڑ اب بھی تھی۔ مگر ایسی جیسی دیہاتیوں کے میلے میں جاتے وقت ہوتی ہے۔ کہ پگڑ باندھے اور لُٹیا سنبھالے چنے چباتے اور اوک سے پانی پیتے چلے جاتے ہیں۔ مجھے اس راستے کی عظمت کا احساس تھا۔ مگر یکہ۔ تانگے، سائیکلیں اور کاریں سب تھیں۔ ریل بھی ادھر ہی جاتی تھی۔ میں دیہاتی میلوں میں گھومنے والوں کو دیکھتا تھا۔ کہ پیدل یا ٹٹوؤں پر سوار شہر کی سڑکوں پہ آ جاتے ہیں۔ تو تماشا بن جاتے ہیں۔ میں تماشا بننے سے ڈرا ورنہ سرسید کے حوض کے مقابل ایک میٹھے پانی کا چشمہ بھی موجود تھا۔ اس کا

پانی گدلا، ریتیلا اور تہ نشین ہو گیا تھا۔ مگر تھا آب حیات یہ دیوبند کا چشمہ تھا۔ میں علی گڑھ نہیں گیا۔ نہ دیوبند بس میرٹھ میں بیٹھا رہا۔ دونوں مقامات یہاں سے مساوی فاصلے پر تھے۔ دونوں طرف آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سرسید ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر بنا رہے تھے تو دیوبند شیخ اسلام، شیخ الحدیث، عالم اور مفتی پیدا کر رہا تھا۔ معاشرے میں دونوں کا مقام تھا۔ دیوبند والے ذرا پرانے، فرسودہ اور کسی حد تک از کار رفتہ سمجھے جاتے تھے۔ مگر مولانا احتشام الحق کو دیکھ لیجیے تو سمجھ میں آجائے گا کہ دونوں راستوں کی منزلیں مختلف ہو کر کتنی مساوی ہیں۔ میں نے دونوں دروازے اپنے اوپر بند کیے اور مسٹر اور مولوی دونوں میرے کام کے نہیں تھے میں کچھ اور کیا بننا چاہتا تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ مگر کچھ بننا ضرور چاہتا تھا۔ اور منتظر تھا کہ دریافت کر لوں کہ کیا بننا چاہتا ہوں۔ یہ زمانہ انتظار کا تھا۔ انتظار اور کیسا انتظار جس کے نباہنے کی مدت نامعلوم تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کبھی ختم ہو گا یا نہیں اور ختم ہو گا تو کیا لائے گا۔ لائے گا یا نہ لائے گا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ مگر میں انتظار کرنے بیٹھ گیا۔

خدا پروفیسر کرار حسین اور محمد حسن عسکری کو جزائے خیر دے جب میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ تو یہ چراغ روشن تھے۔ بلکہ میرے لیے آفتاب و ماہتاب تھے۔ میرے شب و روز انہیں کے سہارے بسر ہوتے تھے۔ یہ میری روشنی تھے میری امید

تھے۔ میری روح کا آسرا تھے۔ انتظار سے تھک جاتا تھا تو ان کی طرف زخم کھا کر بھاگتا تھا۔ ان کی طرف مایوس ہو کر پلٹتا تھا۔ کب ایسا ہوا ہے کہ ان کا فیض نہیں پہنچا۔ یہ ہر زخم کا مرہم ہر مایوسی کا تریاق تھا۔ ان کی خاموشی اور گویائی دونوں نے مسیحائی کا کام کیا۔ بولتے تو جانے کتنے دروازے کھل جاتے اور خاموش رہتے تو حیات افروز قوتوں کا پُراسرار سناٹا میری روح پر چھا جاتا۔ آتش نے کہا کہ سفر شرط ہے۔ ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔ مجھے ہزار ہا کا تجربہ تو نہیں مگر دو چھتنار درخت میں نے ضرور دیکھے۔ ان کی چھاؤں میں بیٹھا۔ ان کے پھل پھلاری کھا کر پیٹ بھرا اور ان کی ٹیک لگا کر کمر سیدھی کی۔ خدا دونوں پر رحمت کرے۔

ہاں تو میں سر سیّد سے اپنے اختلاف کا ذکر کر رہا تھا میں نے کہا میں مُردوں سے اختلاف نہیں کرتا میری لڑائی صرف زندوں سے ہے۔ اور زندہ قوت کے خلاف زندہ قوت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ میں نے حالی پر شدید حملے کیے۔ حالی کو ضرب لگتی ہے تو سر سیّد کا تخت واقتدار بھی کھسکنے لگتا ہے حالی آخرت ہی میں سر سیّد کے لیے وسیلۂ نجات نہیں بنیں گے۔ دنیا میں بھی ذریعۂ شفاعت ہیں۔ لیکن سر سیّد کے دوسرے مخالفوں، دشمنوں، نکتہ چینوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ گو کبھی میرا اور ان کا اعتراض ایک معلوم ہوتا ہے وہ تو سر سیّد کو مغرب کی برتری کا مبلغ سمجھتے ہیں۔ مگر مغرب کی برتری سر سیّد نے نہیں پیدا کی تھی۔ انہوں نے صرف برتری دیکھی تھی۔

اور اسے تسلیم کیا تھا۔ صرف شترمرغ کی طرح آنکھیں بند کرکے نہیں بیٹھ گئے تھے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسیّد انگریز کے اقتدار کا مبلغ ہیں۔ مگر انگریزوں کو سرسیّد نے دعوت نامہ بھیج کر نہیں بلایا تھا۔ انگریز از خود آئے تھے۔ اور توپوں اور بندوقوں کے زور پر آئے تھے۔ سرسیّد نے صرف یہ دیکھا کہ وہ آ گئے ہیں۔ تو ان کے آنے کو تسلیم کیا اور گردن جھکا دی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ سرسیّد گردن نہ جھکاتے تو لڑائی فتح ہو جاتی۔ مگر گردن نہ جھکانے والے ایک، دو نہیں فوج کی فوج ہے اور سب کا حشر ہمارے سامنے ہے۔ سرسیّد گردن نہ جھکاتے تو ان ہی میں سے ایک ہوتے غالباً قید فرنگ، اور شہادت سرسیّد کے لیے اتنی گراں بھی نہیں تھی۔ سرسیّد بہت بڑے سید۔ سید شہادت کو کھیل سمجھتے ہیں۔ اگر سرسیّد گردن نہ جھکاتے تو زیادہ وہ شہید ہو جاتے فتح کا وہ راستہ نہ نکلتا جو بعد میں پیدا ہوا۔ وہ حسینؑ کے مقلد نہیں بنے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ تقلید حسنؑ بھی ان کے حصّے میں نہ آئی۔ کچھ لوگ اتنے خبیث اور دنی الطبع ہیں کہ سرسیّد کو ایجنٹ، مفاد پرست اور بدنیت تک ثابت کرتے ہیں ان سب سے اپنی برات کا اظہار کرتا ہوں۔ اور اگر میری کسی بات سے ایسے خیالات کی تائید ہوتی ہے تو اس سے بھی بری الذمہ ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔ میرے اختلافات کی سطح کچھ اور ہے۔ اور وہ مجھ پر رفتہ رفتہ منکشف ہوئی۔

سرسیّد بہت بڑے مرتبے کا آدمی تھا۔ اور سرسیّد نے جو کر دیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ اکبر بھی ساری زندگی مخالفت کرنے کے باوجود

مان گئے کہ سرسید کام کرتا تھا۔ کام کے طریقے ذرائع اور حدود پر مجھے اعتراض ہے کام کے مقصد اور نیت پر نہیں۔ وہ مسلمانوں کے سچے بہی خواہ اور اسلام کے معتقد تھے۔ البتہ ان کے عمل نے مقصد اور نیت سے آزاد ہو کر ایسے نتائج پیدا کیے جن سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجھے اختلاف ہے بھی مگر یہ اختلاف بھی دوسروں سے مختلف ہے ایک وقت تھا۔ جب ہمیں ایسے نتائج کی ضرورت تھی۔ ہم نے ان نتائج سے کام لیا اور زندہ رہے۔ زندہ رہے اور جہاد کیا، جہاد کیا اور انگریزوں کو باہر نکال بھگایا۔ روح ہندوستان ہمیشہ اس جنگ میں سرسید کے پیدا کیے ہوئے سپاہیوں کی ممنون منت رہے گی۔ میرا اختلاف یہ نہیں ہے کہ وہ نتائج اس وقت میں کیوں پیدا ہوئے ان کا پیدا ہونا تاریخی تقاضا تھا۔ اختلاف یہ ہے کہ وہ نتائج اب بھی کیوں برقرار ہیں۔ اب ہم زندگی کی نئی منزلوں میں ہیں۔ ہمیں اب ایک دوسرے طریق کار اور حکمت کی ضرورت ہے۔ اب ہم بالکل دوسرے نتائج پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ سرسید جو ہمارے لیے سنگ میل تھے اب سنگ راہ ہیں۔ اب وہ راستے نہیں دکھاتے گمراہ کرتے ہیں۔ منزل رسی میں مدد نہیں کرتے، رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ تاریخ کا تقاضا ہے کہ اس سنگ گمراہ کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس کی اپنی وقتی اور تاریخی اہمیت اور ضرورت کا اعتراف کر کے اس کو ٹھوکر مار دی جائے اور آگے بڑھا جائے۔ سرسید زندہ ہوتے تو مجھے حق الیقین

ہے کہ جو لوگ ایسا کرنا چاہتے - ان کی تائید کرتے - شاید ان میں سے پھر کوئی مسدس ، مدوجزر اسلام قسم کی کوئی چیز لکھ دیتا - اور سرسیّد اسے بھی اپنا وسیلۂ نجات بنا لیتے - میں سرسیّد کو گالی دینے نہیں آیا ہیں تو سرسید کو سلام کرنے آیا ہوں - مگر یہ سلام رخصت بھی ہے - یہ اسی وقت ہوگا جب سرسیّد کی پیدا کردہ دنیا نیا پیکر اختیار کرے گی - جب ہم ان تنظیموں ، اداروں ، اور جمعیتوں کو پاش پاش کر دیں گے جو سرسیّد نے پیدا کی ہیں - اور ہمارے راستے میں حائل ہیں - مختصراً جب سرسیّد کا حوض خشک ہو جائے گا - ایک بار پھر ابلنے کے لیے دیوبند کو بھی اس کی ضرورت ہے جب یہ دونوں ملیں گے - تو دریا بن جائیں گے - اور کیسا دریا کہ جس کا سوتا حوض کوثر سے پھوٹتا ہے - مجھے یقین ہے اور خدا اس یقین کو پختہ تر کر دے کہ ہمارے اس کام میں خود روح سرسید دست بدعا ہے -

---

ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

بارے اختر کا کچھ بیاں ہو جائے

یہ ذکر ان دنوں کا ہے جب زندگی کے قرینے آج سے مختلف تھے لوگ دن بھر تلاشِ روزگار میں مبتلا رہتے اور اپنی شامیں حلقہ یاراں میں اور راتیں محفل شعر و سخن میں گزارتے۔ زندگی کے ابتلا پر غالب آنے کے سستے نسخے بھی تھے، مگر ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے انھیں اپنے لیے قبول نہیں کیا تھا۔

میں اختر انصاری اکبرآبادی کو اس دور سے جانتا ہوں۔ یہ سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء کی بات ہے۔ سندھ مسلم کالج برنس روڈ میں پڑھا کرتا تھا۔ اور آتے جاتے ایک گلی کے مکان پر اختر انصاری اکبرآبادی کے نام کی تختی نظر آتی تھی۔ ایک دن مرتضیٰ، قسیم اور میں نے طے کیا کہ ذرا ان "شاعر" صاحب سے ملا جائے

اور ان کی "کھنچائی" کی جائے ۔ اسی ارادے سے دروازے پر دستک دی یا گھنٹی بجائی اور یوں اختر انصاری اکبر آبادی سے ملاقات ہوئی ۔ یہ آدمی اتنا معصوم نکلا کہ کھنچائی کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا اور جب ہم اس آدمی کے گھر سے باہر نکلے تو ہمارے ہاتھوں میں اس کی کتابیں تھیں ۔

وقت نے دو ایک کروٹیں اور لیں ۔ ادبی محفلوں کے ساتھ ساتھ کراچی کے ادبی رسالوں کے حلقے بھی ادبی اداروں کی صورت اختیار کر گئے ۔ "ساقی" اور "افکار" کے علاوہ سب سے اہم نام اب "مشرب" کا تھا جس کے مدیر اختر انصاری اکبر آبادی تھے ۔ کبھی کبھی بعض اور ادبی چراغ رسالوں کی صورت جل اٹھتے ۔ لیکن انکی روشنی کو قرار حاصل نہ تھا ۔ "ادب" بھی ایسا ہی رسالہ تھا ۔ میں اسلامیہ کالج میں پڑھانے لگا ۔ طالب علموں کے پہلے گروہ میں مشفق خواجہ، آمنہ مینائی، انعام صدیقی جیسے ذہین لوگ شامل تھے میں انعام صدیقی اور مشفق خواجہ کے ساتھ اکثر اختر انصاری صاحب سے ملتا رہتا ۔ بلکہ یوں کہیے کہ ہر شام صدر کے قہوہ خانوں میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار ملاقاتیں ہوتیں ۔ ہر چائے خانے کے اوقات مقرر تھے ۔ کتنے بجے سے کتنے بجے تک کہاں نشست ہو گی ۔ یہ سب ہماری زندگی کے غیر تحریر شدہ دستور میں درج تھا ۔

شاہد بھائی کو ساقی سے بے پناہ محبت تھی ۔ اگرچہ ساقی کا دلّی والا معیار قائم نہیں رکھا جا سکا لیکن ساقی کا ماضی اس کے ساتھ تھا، اور ہم سب کے لیے ساقی میں لکھنے میں عجب طلسمی کشش تھی

ساقی کے بعد قہوہ خانوں کے " منہ زبانی ادب " کی جگہ لکھنے پڑھنے پر ہمیں اکسانے اور آمادہ کرنے میں اختر انصاری اکبر آبادی اور مشرب کا بڑا حصّہ تھا۔ اس بات کا اعتراف میں پہلے ہی ایک تحریر میں کر چکا ہوں۔ افکار کی خدمات بھی مجھے تسلیم ہیں۔ (اب پاکستان میں اردو ادب کی بدقسمتی کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ افکار ہمارا واحد ماہنامہ ہے) لیکن صہبا صاحب کی مروّت، مسکراہٹ اور انکسار میں کاروباری پہلو ہمیشہ رہا۔ اختر انصاری اکبر آبادی ادب کو اپنی زندگی کا رومان سمجھتے رہے اور یہ ایسا سودا تھا کہ ایک طرف ان کی عائلی زندگی نے ان پر دروازے بند کر دیے اور دوسری طرف جو صورتِ حال پیدا ہوئی وہ سب کے سامنے ہے۔ بڑھاپا قدرے بے وقت ان پر چھا گیا۔ بیماریاں، معاشی بحران —— مگر بڑی بات یہ ہے کہ آج بھی اختر انصاری کو اپنے اس ماضی پر ندامت نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ادب پر، لکھنے والوں اور پڑھنے والوں پر اپنا احسان نہیں جتاتے۔ آج بھی لگن اور تمنّا ہے تو یہی کہ نئی قدریں کا سلور جوبلی نمبر شاندار ہو اور زندگی کے باقی ماندہ ماہ و سال معنویت در کنار ہوں۔

اختر انصاری کا نام ہماری ادبی صحافت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس کا اعتراف اور احساس عام نہیں ہے، سبب یہ ہے کہ ادبی صحافت کا کوئی واضح تصوّر ذہنوں میں نہیں ہے کامیاب اور نہایت صحت مند خاص نمبروں سے کسی رسالے کا قد و قامت نہیں ناپا جا سکتا۔ ایسے شماروں کو ترتیب دی ہوئی کتابیں

کیجیے۔ ادبی رسالے کا مقصد پڑھنے والوں اور لکھنے والوں کے درمیان رشتے کی تخلیق ہے۔ اسی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اچھا ادبی رسالہ خود لکھنے والوں کے درمیان ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ اختر انصاری کا نئی قدریں اب پابندی سے شایع نہیں ہوتا، اس کی کتابت اور طباعت بھی اچھی نہیں ہے۔ معیار بھی قابل رشک نہیں ہے، لیکن اس کے مُدیر کا عکس اس میں آج بھی موجود ہے۔

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اختر انصاری اکبرآبادی کا نام غزل گو شعراء میں کافی نمایاں اور ممتاز تھا (اس میں ان کی ادارت کا بھی دخل تھا) اردو کے معتبر اور قابل احترام نقاد اور صاحبان نظر ان کی شاعری کی اہمیت کا تحریری اعتراف کر چکے تھے۔ ان میں نیاز فتحپوری، فراق گورکھپوری، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور احتشام حسین جیسے اکابر بھی شامل تھے۔ لیکن میں نے اختر کی شاعری کو اس زمانے میں تسلیم نہیں کیا۔ میں اختر کے سامنے ان کے شاعرانہ وجود سے انکار کرتا۔ اور ان کے چہرے پر کبھی ناگواری کی لہر تک نہ ابھرتی۔ وہ اس بات سے بھی آزردہ نہ ہوتے کہ میں اپنی رائے کا اظہار سب کے سامنے کرتا۔ اب تو دوستی مصلحتوں، سمجھوتوں اور منافقتوں کے حاصل جمع کا نام ہے۔ ہاں مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں قطعاً تامل نہیں تھا کہ "اختر انصاری خوش گو شاعر ہیں اور مشق نے انھیں زبان و بیان پر خاصی قدرت عطا کی ہے۔ پھر وہ تضمین کا بہت اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔" میں اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضرور کہہ دیتا کہ ان کی غزل میں نئی حیثیت نہیں

ہے اور عہد حاضر کے جن شعرا کو غزل کی نمایندگی کے لیے چنا جائے گا۔ وہ میرے خیال میں ان شعرا میں شامل نہیں ہیں" اور پھر ہوا یہ کہ ایک دن اختر انصاری نے یہ شعر سنایا ؎

جو فسانے لبِ گفتار تک آئے بھی نہیں   رنگ بن کر ترے رخسار تک آ پہنچے ہیں

میں نے اسی لمحہ ان سے کہا " میں اس شعر کی بنیاد پہ آپ کا نام اُن غزل گو شعرا کی اس فہرست میں درج کر رہا ہوں جو میرے نزدیک عہد حاضر کی غزل کے ترجمان ہیں " یہ ان دنوں کی بہت مقبول زمین تھی تقریباً ہر شاعر نے اس میں غزل کہی، لیکن قتیل شفائی اور ظہیر کاشمیری جیسے شاعر محض بیانات کی شاعری (POETRY OF STATEMANT) کر رہے تھے اور یہ شاعری پنچایتی شاعری تھی ۔ وہی کردار تک آ پہنچے ہیں اور " رسن و دار تک آ پہنچے ہیں " اُن دنوں نازک شاعری کا قحط تھا ۔ نزاکت خیال تو نظر آ بھی جاتی تھی لیکن نزاکتِ احساس تو جیسے جنس نایاب بنتی جا رہی تھی ۔

گزشتہ پچیس سال میں اختر انصاری اکبر آبادی نے جو غزلیں لکھی ہیں ان میں بالطف اشعار کی کمی نہیں ۔ اردو تذکروں کے قاری بالطف اشعار کی ترکیب سے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس میں کلام کی کون کون سی خوبیاں اور ادائیں چھپی ہوئی ہیں ۔ کیسی ستم ظریفی کی بات ہے کہ نئی تنقیدی اصطلاحوں کے ہجوم میں ہم نے اپنی قدیم اصطلاحوں کو بالکل بھلا دیا اور ہم ان اصطلاحوں کو عام الفاظ کی اوپری سطح تک محدود جانتے ہیں ۔ بعض قدیم تنقیدی اصطلاحوں میں

کئی مفاہیم کا جو اجتماع نظر آتا ہے وہ نئی تنقیدی اصطلاحوں میں شکل سے ملے گا۔ الفاظ کا دروبست، شعر کا آہنگ، معانی و الفاظ کی ہم آہنگی، شاعر کی شخصیت کی نمود اور پھر مسرت کا وہ عنصر جو شاعری کی دین ہے۔ سب چیزیں بالطف اشعار میں نظر آتی ہیں ؎

بھٹک بھٹک کے مجھے راستے ملے اختر
یہ گمرہی بھی عجب رہنما نکلتی ہے

ایک ایسا بے حسی کا دور گزرا ہے کہ نظروں سے
کوئی فریادرس گزرا، نہ کوئی دادرس گزرا

ماہ و انجم بدل گئے اختر — یا نظر کے مقام بدلے ہیں

جو دور سے گزر گیا جھونکا ہوا کا تھا
جو سر تک آگیا اسے پتھر کہا گیا

ان اشعار کو آپ کسی معروف شاعر سے منسوب نہیں کر سکیں گے۔ کیوں کہ ان میں اختر انصاری کی ذات، فن اور مشاہدہ و فکر موجود ہے۔ یہ ان اشعار کی فردیت ہے۔ " یا نظر کے مقام بدلے ہیں۔" اختر انصاری نے کیسا اہم فنی نکتہ بیان کر دیا ہے۔ ہماری دید اور مشاہدہ کا انحصار ہمارے مقام تناظر پہ ہے۔ جس نے جہاں سے دیکھا اسی کے مطابق بیان۔ یوں بظاہر متضاد نظر آنے والے بیانات ایک

دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس طرح "پتھر کھا گیا" کہ ٹکڑے میں زبان کے مزاج سے آگاہی کی وہ شان موجود ہے کہ پتھر کے موضوع پر کہے گئے اشعار میں ایسا اضافہ کر دیا ہے جو اپنی ذات سے لیکر لوگوں کے برتاؤ اور غزل کی روایات کی گہرائیوں تک کے کتنے ہی پہلوؤں تک ہمیں پہنچاتا ہے۔

اختر انصاری نے نثر کے ذریعے بھی اپنی ذات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے رسالوں کے اداریے اگر جمع کیے جائیں تو ان سے گزشتہ تیس سال کے ادبی رجحانات اور مسائل کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ اختر انصاری نے ہمیشہ اپنے ماحول سے ادب کے رشتہ کو استوار کرنے کی کوشش کی ہے، اور اردو ادب و شعر کو نئے تصورات اور فنی معیار اور شعری اصناف سے روشناس کرایا ہے اس کا اندازہ ان کی تحریروں اور تالیفات سے کیا جاتا ہے جو حضرت شاہ بھٹائی سے متعلق ہیں۔ "جمالِ آگہی" اختر انصاری کی تنقیدوں کا مجموعہ ہے، اس مجموعے میں ادیبوں اور شاعروں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اصناف اور مسائل کے جائزے اور تجزیے بھی ہیں ان میں مضامین بہت زیادہ گہرائی نہ سہی لیکن وہ دیانت ضرور ہے جس سے ہماری تنقید محروم ہوتی جا رہی ہے۔

گزشتہ کئی برسوں سے اختر انصاری نے کتابوں کے تبصروں پر خاص توجہ دی ہے۔ مولوی عبدالحق اور نیاز فتحپوری نے تبصرہ نگاری کو اردو میں تنقید کی ایک اہم شاخ بنا دیا۔ نئے نقادوں میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام اور کام بھی اس ضمن میں قابلِ ذکر

ہے۔ لیکن آج مجموعی طور پر تبصرہ نگاری پی۔ آر یا مخالفت و عناد کے لیے استعمال کی جا رہی ہے۔ نقاد اپنے گروہ کے ادیبوں کے کام کو اچھالتے ہیں اور جس سے تعلقات خوشگوار ہوں تو پھر کتاب کے ساتھ ساتھ اس کی ذاتی زندگی اور خواب گاہ کے مناظر تک تبصرہ کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ اس دور اور فضا میں اختر انصاری اکبر آبادی نے قلم کی حرمت کی پاسداری اور حفاظت کی ہے۔ ان کے تبصرے دیانت کی مثال ہیں اور ان کو کتابوں کے اچھے تعارف کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

یہ تحریر نہ تو اختر انصاری اکبر آبادی کا خاکہ ہے، نہ ان پر تنقید ہے۔ بلکہ اسے آپ شخصی تاثرات قرار دے لیں۔ تقریب اس تاثرات کی نئی قدریں کا بنر ہے۔

اختر انصاری کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو مسلسل کام، یک جہتی و یک سوئی اور اردو زبان سے ان کی بے پناہ اور لامحدود محبت ہے۔ ہم میں سے بیشتر لوگ جب خدا کے حضور حاضر ہوں گے تو ہمیں ندامت ہو گی کہ ہم نے اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اختر انصاری کے حصّے میں یہ ندامت نہیں آئے گی۔ انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں اور قوت کو اردو زبان کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے سندھ کے ریگزاروں میں اردو کے چراغِ لالہ کی روشنی کو یوں پھیلایا کہ چراغاں کا سا سماں نظر آتا ہے اس سلسلے میں ان کی ذات سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ محنت ہر نفرت پر غالب

آجاتی ہے۔

اختر انصاری پر مزاحیہ اشعار بھی کہے گئے۔ یہاں یہ عرض کر دوں کہ بدنیتی سے نہیں بلکہ مجلسی لطف کی خاطر ۔۔ ان اشعار کو اس لیے نقل نہیں کرتا کہ ادب میں قاری کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور آج کے بہت سے پڑھنے والے ان مجلسی اشعار کا مطالعہ صحیح پس منظر اور تناظر میں نہیں کر سکتے ۔۔۔ آج ان اشعار کے خالق اور شاعر بھی اختر انصاری کی اہمیت اور کام کا اعتراف کرتے ہیں۔ بلکہ ایک ایسے شاعر اب اختر کے نہایت درد مند اور محبت کرنے والے دوست ہیں (دوست تو پہلے بھی تھے) اختر نے وقت سے ہار نہ مان کر اور جنگ کر کے ہمیں اپنے کردار کے اس پہلو سے بہت سے سبق دیے ہیں۔ اختر کبھی حاسد نہیں رہے ہاں دوسروں کے محسود ضرور رہے ہیں ۔۔۔ اور اس بات پر میں انہیں مبارک باد دیتا ہوں۔

سجاد باقر رضوی

الفاظ کی توانائی اور غالب

انتظار حسین کا ایک افسانہ ہے "ہڈیوں کا ڈھانچہ"، کسی مردے کے جسم میں بدروح سما گئی اور یہ ہڈیوں کا ڈھانچہ اُٹھ بیٹھا اس کی مخصوص صفت یہ تھی کہ وہ سارے محلے کی روٹیاں اکیلے کھا جاتا تھا۔ زندوں کا رزق جب مُردے کھانے لگیں تو ایسا وقت زندگی کی ابتلا کا وقت ہوتا ہے اور بدروحوں کو جسموں سے نکالنے کے لیے عمل کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ٹھہریے۔ یہ وہ عمل نہیں جس عمل کا تصوّر آپ کے ذہن میں بچپن سے ڈال دیا گیا ہے۔ یہ عمل وہ نہیں جس سے علامہ اقبال کے لفظوں میں زندگی اور جنت اور جہنم بنتے ہیں۔ اس عمل کا تعلق لفظوں کی تاثیر سے ہے۔ لفظوں کی تاثیر سے مُردے جی اٹھتے ہیں۔ اور وہ مُردے جو بدروح کے سہارے زندوں کا رُوپ

دھارتے ہیں کھڑ کھڑا کر نیچے گر پڑتے ہیں۔

لفظوں میں قوت اور توانائی زندگی سے آتی ہے مگر اس زندگی سے جس میں خود قوت اور توانائی ہو زندگی بخش زندگی ہوتی ہے اور زندگی بخش الفاظ زندگی کے قدری رویوں کے نمائندے بے قدر اور زوال آمادہ زندگی میں لفظ اپنے معنی اور تاثیر کھونے لگتے ہیں۔ بقول غالب ؂

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں سراب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

غالب نے ان اشعار میں شاعری کی تاثیر کی وضاحت بھی کی ہے اور معاشرے اور افراد کے بے قدر رویوں کی بھی۔ شاعر اپنے کلام کے سحر سے ایک صحرا میں جہاز چلاتا ہے۔ اور آفتاب پر شگاف ڈالتا ہے لیکن ناقدر شناس اور بے طاقت معاشرہ شاعر کی اس قوت سے خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے زندہ شاعروں کی موت کا منتظر رہتا ہے اور ان کو جو مر جانے کے باوجود زندہ ہیں مُردوں کی طرح گھسیٹتا ہے۔ بی اے کے نصاب میں ردیف "نون" کے حوالے سے غالب کا مطالعہ اسی رجحان کی دلیل ہے۔ شاعر ردیفوں، قافیوں سے پہچانا نہیں جاتا شعری رویوں سے پہچانا جاتا ہے۔ شاعری کے وہ کون سے رویے ہیں جو ہمیں ہم عصر اور زندہ غالب کے روبرو کرتے ہیں اور اگر اسی حوالے سے کلام غالب کا انتخاب نصاب میں شامل ہوگا تو طالب علم آج کے زندہ غالب سے آشنا ہو سکیں گے بصورت

دیگر غالبؔ، غالب نہیں مغلوب رہے گا "مُردہ بہ دست زندہ" نہیں زندہ بہ دست مُردہ ثابت ہوگا۔

غالبؔ طاقت اور توانائیوں کا شاعر ہے اس کی توانائی کا راز یہ ہے کہ وہ زندگی کو بطورِ کل دیکھنے کا اصل ہے اس کی شاعری کے بنیادی حوالے انسان اور زندگی میں انسانی رویّے ہیں۔ اس کے پاس تخلیقی انسان کا نقطۂ نظر ہے۔ انسان کے بلند و پست پر نظر رکھتا ہے ایک عام تنقیدی رویہ غالبؔ کو انا پرست انسان کی حیثیت سے دیکھنے کا ہے۔ مگر غالبؔ کی شاعری انسانی انا کا اعلان نامہ نہیں ہے۔ وہ تو انسانی امکانات کا جائزہ ہے۔ انسان کی بلندی کن حدود کو چھو سکتی ہے اور اس کی شکست اسے کن سطحوں سے کن سطحوں پر گرا سکتی ہے۔ ایک غزل یوں شروع ہوتی ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اور یوں ختم ہوتی ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اس ایک غزل ہی میں انسانی امکانات اور اس کے عروج و زوال کی پوری کہانی کہہ دی گئی ہے۔ اس ضمن میں اس کا یہی شعر پڑھ لیجے۔

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

ایک آفاقی صداقت ہونے کے علاوہ انسانی زندگی کے امکانات کو کس طرح ظاہر کرتا ہے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ غالب کو ورثہ میں وہی نظریۂ حیات ملا تھا جو اس سے پہلے کے شاعروں کو ملا تھا۔ زندگی کو ایک کل کی حیثیت سے دیکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی نظریۂ زندگی لازم ہے۔ غالب نظریۂ وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ لیکن تصوّف کا حال ان تک نہ پہنچا۔ معاملہ قال تک رہ گیا۔ ان کے یہاں تصوّف کی کیفیت کم اور مسائل زیادہ ہیں۔ مگر یہ محض غالب کی صورتحال نہیں۔ ان کے عہد کی صورت بھی یہی ہے وہ وقت ہوتا ہے جب ایک نظریاتی نظام کی عمارت میں کیفیت اور جذبات کی سیمنٹ اکھڑنے لگتی ہے۔ نظام اوپر سے ٹوٹنے لگتا ہے اور فرد اندر سے بکھرنے لگتا ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ اس نے نظام و احساس کو مربوط کرنے کی کوشش کی اور اس طرح فرد کو داخلی شکست و ریخت سے بچایا۔ عقل اور جذبے کی جو دوئی بعد میں پیدا ہوئی۔ غالب کے ہاں نہیں ہے۔ اس کے یہاں مکمل ہم آہنگی کی صورت نہ سہی۔ یہ ایک نظام میں پروئے ہوئے ضرور معلوم ہیں ۔۔۔ نظام احساس کو مربوط کرنے کی کوشش غالب کو ہمارے اپنے عہد کا زندہ شاعر بنا دیتی ہے۔ نظام احساس میں ربط آہنگ اشیاء کو بحیثیت کل دیکھنے کے لیے ضروری ہے غالب کے ایک شعر سے اس بات کی وضاحت ہو سکتی ہے۔

مثلاً:-

در خورِ عرض نہیں جوہر بیداد کو جا
نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

پہلا مصرعہ عقلی منطقی اور دوسرا مصرعہ جذباتی رویوں کا حامل ہے اور ایک شعر میں دونوں رویوں کو مربوط کرنے کی کوشش پورے نظام احساس کو مربوط کرنے کے مترادف ہے۔ نظام احساس کے بکھرنے سے اشیاء بحیثیت کل یا زندگی بحیثیت کل نظر نہیں آتی۔ غالبؔ کے بعد طرزِ احساس کی یہ اکائی قائم نہ رہ سکی اور اس کی وجہ نئے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی عوامل تھے۔

ہماری آج کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے اور غالب آج ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ہم اقتدار کی شکست و ریخت کی اس دنیا میں کم از کم بحیثیت فرد اپنے آپ کو کس طرح منظم کر سکتے ہیں۔ تاہم یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کسی قسم کی تنظیم ذات تخلیقی رویوں کو اپنائے بغیر ممکن نہیں ہے یہ تخلیقی اور قدری رویے ذات کے سیم دھور کے لیے ٹیوب ویل کا کام کرتے ہیں۔ غالب کے ہاں جو تخلیقی اور قدری رویے ملتے ہیں۔ ان کی اساس عشق ہے عشق وہ ہوتا ہے جس سے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی کے تمام قدری رویے پیدا ہوتے ہیں۔ پاک و ہند میں مسلمانوں کی تہذیب اس عشق اور جہاد پر ہے۔ مگر عشق اور جہاد دو الگ الگ رویے نہیں ہیں۔ ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ مجاہد اور عاشق دونوں راضی بہ رضا ہتھیلی پر سر لیے پھرتے ہیں۔ بس عاشقی لذت اندوزی کا نہیں مرنے کے لیے تیار رہنے کا نام ہے۔ غالبؔ کے یہاں

عاشقی کی مختلف صورتیں ہیں مگر یہ بنیادی بات ہر جگہ موجود ہے قیس اور فرہاد سے غالب کا برتری جتانے کا انداز انا پرستی کی مثال نہیں ہے بلکہ عاشقوں کی فہرست میں سر فہرست آنے کی کوشش ہے بہرحال یہاں عاشقی کی مختلف وارداتیں ہیں مثلاً یہ بھی ہے کہ ؎

جب تک وہاں زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل ہے تجھ سے راہِ سخن ادا کرے کوئی

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

اور یہ بھی کہ ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

البتہ غالب عشق میں سمجھوتے کے قائل نہیں۔ جس عاشق اور رقیب میں پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ قدر اور ناقدر میں سمجھوتے بازی آج کا کھیل ہے اور لوٹے پھوٹے مطلب پرست، خود غرض حریص لوگوں کا شغلہ۔ اسی بنا پر غالب کا اعتراض یہ ہے کہ ؎

عشق و مزدوری، عشرت گہِ خسرو کیا خوب

ہم کو منظور نکونامی فرہاد نہیں

یہ اظہار غالب کی انا کا نہیں ایک قدری رویے کا ہے اور وہ جو غالب نے کہا تھا کہ ؎

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہیے

گو نامہ بر کے لیے تھوڑی سی رعایت ہے لیکن نامہ بر اور حاکم وقت میں فرق ہوتا ہے۔ حاکم وقت کی خدمت گزاری اور چیز ہے اور اپنے قاصد کو بخش دینا اور چیز ہے۔

عاشقی کے اس رویے کی تذلیل جو ہمارے زمانے میں ہوئی وہ ہمارے سامنے ہے زوال کی صورت میں اعلیٰ رویے اپنے حاصل مفاہیم کھو دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ادنیٰ لوگ ہر شے کو اپنی سطح پہ لے آتے ہیں۔ آج کے نوجوانوں کا مسئلہ عشق کرنا نہیں ہے کہ یہ کام جان جوکھوں کا ہے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی آئے اور ان سے عشق کرے۔ عاشقی کا رویہ دنیا کو کچھ دینے کا ہے اس سے حاصل کرنے کا نہیں۔ اس معنی میں عاشقی ایک تخلیقی اور انقلابی عمل ہے جو ناجرانہ معاشرت میں بے عملی، یا ایک پست درجے کی قدر کا حامل ہوتا ہے، خود غرضی خوف، حرص اور ہوس کے رویے عاشقی کی نفی نہیں ہیں عاشقی کے رویے کی غیر موجودگی کے مختلف نام ہیں۔ فیض احمد فیض نے ہمیں کچھ مدت پہلے یہ یاد دلایا تھا کہ ؎ ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے

جز ترے اور کو بتلاؤں تو بتلا نہ سکوں

عاجزی سیکھی غریبوں کی حمایت سیکھی
درد و حرمان و غم و یاس کے معنی سیکھے

لیکن فیض احمد صاحب نے یہ سب کچھ رقیب سے کہا۔ مگر غالب کا رقیب اس کا ہمراز نہیں ہے۔ وہ رقیب سے بالخصوص اس وقت جبکہ وہ طاقت رکھتا ہو کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن فیض کی یہ بات کہ عشق، عاجزی، انکساری، درد و حرماں غم و یاس کے معنی سکھاتا ہے بڑے پتے کی بات ہے کہ عاشقی کا رویہ ان جذبات و احساسات کو جنم دیتا ہے۔ جو پتھر دل کو پگھلاتا ہے۔ اور آنکھوں کو نم کرتا ہے۔ کہ اگر یہ نہ ہو تو دلوں پہ سماعت اور بصارت پر اللہ تعالیٰ کی مہر لگ جاتی ہے اور عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں خود کو توڑ کر دوسروں کی ذات میں داخل ہونا یہ بات تہذیب نفس کے لیے ضروری ہے۔ اور عشق ہی سکھاتا ہے لہٰذا عشق زندگی کا ایک ہمہ گیر جذبہ ہے جسے محض جنسی معاملات تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے حضرت امام حسینؓ کو امام عاشقاں کہا ہے عشق خواہ وہ فرد کی سطح پہ کیوں نہ شروع ہو بالآخر کائناتی حقائق کو منکشف کرتا ہے اور انسان کو اعلیٰ انسانی سطحوں سے روشناس کراتا ہے۔

کسی خوبصورت شے کی طرف رسائی کی بدہیئت اور چھچھوری کوشش سے خوبصورتی خود کو ظاہر کرنے کے بجائے چھپا لیتی ہے حسن تک رسائی محض عشق کے تعلق سے ہی ممکن ہے۔ غالب کے

کلام میں حسن و جمال کا مرقعہ ہے جس تک مولانا صہبائی کے حوالے آپ پہنچ نہیں سکتے ۔ اردو تنقید کے ان ٹوٹکوں سے غالبؔ پہلے ادق کلام کہتے تھے مگر بعد ازاں دوستوں کے سمجھانے بجھانے یا حکیم آغاجان عیشؔ کے طنز کے باعث سادہ زبان میں شعر کہنے لگے ۔ بڑے شاعر کے یہاں شاعری جذبہ و احساس کا سفر بھی ہوتی ہے اور زبان کا بھی علامہ وزیرالحسن عابدی نے "گل رعنا" کی تالیف پہ غالبؔ کی شروع کی غزلیں نقل کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ غالبؔ میرؔ و نظیرؔ کی زبان کے ورثہ دار تھے میں یہاں دو شعر اولین دور کے نقل کرتا ہوں ؎

سمجھاؤ اسے یہ وضع چھوڑے جو چاہے کرے پر دل نہ توڑے
جاتے ہیں رقیب کو خط اس کے کاغذ کے دوڑتے ہیں گھوڑے

بس غالبؔ کا مسئلہ یہ نہیں تھا کہ وہ آسان اور سادہ زبان پر قادر نہ تھے ان کا کلام پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی تہذیبی وحدت کو جس کا وسیع و عریض احاطہ دلی سے لیکر شیراز و اصفہان تک پھیلا ہوا تھا ۔ اپنے کلام میں محفوظ کر لینا چاہتے ہیں ۔ ان کا عہد سیاسی وحدت کے بکھرنے کا عہد تھا ۔ اور غالبؔ اقلیم تہذیب کے پاسبان تھے ۔ لہٰذا ان کی نظر میں محض دلّی کی گلیاں نہ تھیں ۔ یہ پورا علاقہ تھا ۔ لہٰذا غالبؔ کے یہاں اس اردو کی توقع کرنا جو دلّی کے محاوروں سے حیثیت استاد ذوقؔ کے ہاں نظر آتی ہے بے سود ہے ، اب غالبؔ کی زبان ہمارے لیے وہ معنی نہیں رکھتی کہ اس زبان کے پیچھے جو تہذیبی

اکائی تھی وہ بھی بکھر چکی ہے۔ اس کے باوجود ان کے زبان کے ایک اور معنی ہیں اور وہ یہ کہ تہذیب کے اس وسیع کینوس پر نقش ونگار بنانے والے غالب کا سفر ایک اعلیٰ وسیع دنیا کا سفر تھا۔ اور اسی وسعت کے اعتبار سے ان کی زبان نے جو منطق بنانے میں قابل قدر ہیں اعلیٰ افکار وخیالات کے حامل الفاظ اعلیٰ شاعر کے یہاں مختلف سطحیں حاصل کرتے ہیں۔ غالب کا زبان کے مسئلے میں یہ خاصہ ہے کہ اس کے یہاں زبان کی کئی سطحیں ہیں اور وہ غزل، شب خمار ذوق ساقی ورنجیدہ اندازہ تھا سے لیکر دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے تک پھیلی ہوتی ہیں۔

غالب کا زبان کی سطح پر مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ بڑے شاعر کے یہاں زبان سے نتیجہ آزمائی نظر آتی ہے جس شاعر کے یہاں زبان کے سلسلے میں یہ کشمکش نظر نہ آئے اس کے شعری مسائل بھی نسبتاً کم اور نسبتاً کم اہم ہوں گے۔ پھر یہ بھی کہ زبان کا تنوع، اسلوب کے تنوع سے عبارت ہے اور اس تنوع کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کے پاس کہنے کو تو بہت کچھ ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے یک سطحی نہیں ہمہ جہتی ہے۔

میں نے یہ چند اشارے علماء کے لیے نہیں طالب علموں کے لیے لکھے ہیں اور اب اگر انہیں غالب بھاری پتھر نظر آتا ہو تو چوم کر چھوڑ دینا بہتر ہے۔ ردیف نون سے کام تو نکل ہی آتا ہے۔ اردو کے بے شمار ناقدوں کی آراء ہر طرف بکھری پڑی ہیں کہ جو شخص یا شے زیادہ اہمیت کی حامل

ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ہیتیم گردانی جاتی ہے جس کے متعلق جو چاہے کہہ دیجیے آپ کو کون پوچھتا ہے؟

ان آداب کو ورٹ ڈالیے کہ رٹنے سے کم از کم سنگوری تجربے سے تو نجات مل ہی جاتی ہے میرے جیسے استادوں کے لکھے ہوئے خلاصے بھی مل ہی جاتے ہیں۔ جو مزید عاقبت کا باعث ہوتے ہیں اور اگر ان سب سے کام نہ چلے تو امتحان کی تاریخیں ملتوی کرا لیجیے اور پھر دیکھیے کہ آپ غالب ہیں اور غالب مغلوب۔

محمد علی صدیقی

شاہ لطیفؒ کی شاعری

(ایک تاثر)

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ بلاشک وشبہ، نہ صرف سندھی زبان بلکہ دنیائے تصوف، کے بڑے انوکھے اور عظیم الشان شاعر ہیں۔ آپ کا مجموعۂ کلام "رسالو" ایک عرصے سے سندھی زبان کے شیدائیوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہا ہے اور یوں لگتا ہے کہ "شاہ جو رسالو" اپنی زبان کے لیے وہ مینارۂ روشنی ہے جس کی ضیاء پاشی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔

"شاہ جو رسالو" اس لحاظ سے بھی ایک منفرد شعری مجموعہ ہے کہ اس میں انسان و کائنات کے باہم رشتوں اور ان پر دو دنیاؤں کے بطون سے اس قدر دل نشیں انداز میں گنجینہ ہائے

معانی حاصل کیے گئے ہیں کہ اردو قارئین "رسالو" کے مستند ترجموں کے مطالعے کے دوران خود کو ایک ایسی دنیا میں منتقل ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں جو جانی پہچانی سی دنیا لگتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو بہت سے تناقضات سے پاک ہے۔ اس دنیا کا لوگ، مناظر، اشجار، حیوانات اور حشرات سب ہی یک گونہ اپنائیت کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کا کلام نہ صرف روحانی ترفع اور فکری بالیدگی کا حامل ہے بلکہ یہ کلام ایک جغرافیائی و تاریخی حقیقت کا عکاس ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کلام کا خمیر مخصوص سُروں (راگوں) کے مترنم زیروبم میں گوندھا گیا ہے۔ صرف یہی ایک خصوصیت اس درجہ اعلیٰ و ارفع ہے کہ "شاہ جو رسالو" خود بخود عالمی ادب کے اعلیٰ شہ پاروں کی منتخب فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ دنیا کسی ایسے شعری مجموعہ کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے جس کے خالق نے اپنی شاعری کے لیے ایک مخصوص غنائی روپ بھی تجویز کیا ہو ـــــ اور وہ بھی اس طرح کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک کی دُھن اور لے طے شدہ ہے۔ شاعری اور موسیقی مشکل ہی سے اس طرح یک جان ہوئی ہیں۔

"شاہ جو رسالو" کی آفاقیت کا سارا راز اس کی مقامیت میں مضمر ہے۔ شاہ لطیفؒ کا وصفِ خاص ہی یہ ہے کہ ان کے مجموعۂ کلام کی ایک ایک سطر پورے علاقے کے روحانی ذہن کے خدوخال واضح کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ

جیسے پورا علاقہ "رسالو" کی روشنی سے منوّر ہو چلا ہو۔ شاہ صاحب اپنے علاقے سے اس درجہ پیار کرتے ہیں کہ وہ اس پیار کی بنیاد پر تمام بنی نوع انسان سے یکساں محبت کرتے ہیں وہ تفریق وانتشار کی دنیا میں "صحیح" اور "حقیقی" نقطۂ نظر کی وکالت کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ "حق" اور "باطل" میں تمیز کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو شاہ لطیفؒ کی شعری دنیا کا اپنا جغرافیہ اپنی تاریخ اور اپنی موسیقی ہے اور ان سارے اوصاف کی یک جائی کے ساتھ شاہ صاحبؒ کے کلام کا لہجہ آفاقی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اولمپس پہاڑ (OLYMPUS) پر بیٹھے ہوئے ایک وحدت کی ہزار ہا تعبیرات سے مطمئن نہ ہوں بلکہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ "اے انسان اپنے اندر جھانک اور اپنے ارد گرد پر نظر دوڑانا سیکھ کہ خدا اپنی تمام تر رفعتوں کے ساتھ تیرے وجود میں موجود ہے"۔ بعض حضرات اس پیغام کی آفاقیت کے بارے میں شکوک وشبہات میں پڑ جاتے ہیں بہت سے حضرات نے شاہ صاحبؒ کی شاعری کے بارے میں یہاں تک اظہار خیال کیا ہے کہ یہ نفس کشی کی تعلیم دیتی ہے۔ شاید یہ حضرات سمجھتے کہ "نفس پروری" اور "ترقی" کے مابین ایک نامیاتی تعلق موجود ہے۔ جبکہ میری ناچیز رائے میں "ترقی" کی بنیاد "علم" ہے اور "علم" وہی ہے جو آج کی صداقت پر صاد کرتے وقت آنے دن اس صداقت کے استرداد پر چیں بہ جبیں نہ ہو سکے۔ معقولات کی حد تک علم کا گراف رد وقبول کی راہوں سے ہو کر

گزرتا ہے اور شاہ صاحبؒ کی شاعری میں جستجو نے حقیقت پہ اس قدر زور دیا ہے کہ انسان بذاتِ خود جستجو کا استعارہ بن جاتا ہے۔ شاہ لطیفؒ نے ثابت کیا ہے کہ "کُل" اسی وقت "کُل" ہو سکتا ہے جب وہ "اجزا" سے آزادانہ مرکب کے طور پہ آیا ہو۔

شاہ لطیفؒ کے کلام میں مجھ ایسے ہیچمدان کے لیے صرف حیرت و استعجاب اور محویتؔ شاعری کا بہت کچھ سامان موجود ہے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ نہ صرف سندھی شاعری کے دلدادگان میں وسیع تر مفاہمت کا سامان پیدا کیا ہے بلکہ شاعری کے منصب کو بھی بلند تر کر دیا ہے۔ وہ سندھی شاعری کی روایت کے سب سے بلند قامت نام ہیں اور جب اٹھارویں صدی سے آج تک کی سندھی شاعری کے ارتقاء پہ نظر دوڑاتے ہیں تو قدم قدم پہ یہ احساس اجاگر ہوتا رہتا ہے کہ شاہ لطیف نے سندھ کی سرزمین کو ایک ایسا آسمان بنا دیا ہے جس میں ان کی خوبصورت سطریں خوبصورت ستاروں کی مانند جگمگاتی رہیں گی خواہ کوئی جدید سندھی شاعر شاہ صاحب کی روایت کا علمبردار ہو یا اس روایت سے ہٹ کر راستہ بنانے کی تگ و دو میں مصروف ہو، شاہ صاحب بہر صورت ایک ایسا حوالہ ٹھہرتے ہیں جس کے حضور سجدہ کیے بغیر سفر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

انگریزی ادب میں شیکسپیئر، طویل عرصہ تک اسی حیثیت کے مالک رہے تا آنکہ ملٹن نے ایک راہ نکالی اور پھر ملٹن طویل مدت تک اس منصب پہ فائز رہ چکنے کے بعد وہاں

پسندیوں کے ہاتھوں پس پشت چلے گئے۔

ہندی شاعری میں میرا باتی اور کبیر بھی آیندہ نسلوں پر اثر انداز ہونے والے شعراء کی صف میں شامل ہیں۔ اُردو شاعری میں میرا اور غالب بعد کی نسلوں پر تا ہنوز اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر چند ان تمام متذکرہ بالا شعراء کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہیں اور بعض شعراء نے کلیتاً تجرباتی شاعری کی حدود میں آبلہ پائی کی، لیکن شاہ لطیف، اس لحاظ سے، مختلف ہیں کہ انھوں نے آج سے دو سو سال قبل جس انداز کی شاعری کی تھی وہ تا ہنوز، اس قدر طاقت ور ہے اور ہم عصری حیقت کے مطابق ہے کہ شاہ صاحب کے اثرات سے ہٹ کر اپنی راہ نکالنے والا اہم شاعر شیخ ایاز بھی کافی شعوری کدوکاوش کے بعد شاہ صاحب کے حصار سے اس حد تک باہر نکل پایا ہے کہ وہ شاہ صاحب کی شاعری میں جاری وساری وحدت الوجودی فکر کے لیے "انقلابی" گھن گرج بہم کر پائے ہیں۔ لیکن وہ شاہ صاحب کی روایت سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں ـــــ گزشتہ چند برسوں میں شاہ لطیف کے پرستاروں نے "شاہ جو رسالو" کے مطالعہ میں خاصی دقت پسندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اس اہم شعری دستاویز کا مطالعہ ایک سے زائد سطحوں پر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ آزادی کے بعد کے حالات نے شاہ لطیف کی شاعری کی تفہیم کے بہت سے نئے گوشوں اور زاویوں کو جنم دیا ہے تو چنداں غلط نہ ہوگا۔

ہر بڑے شاعر کا مقدر ہے کہ وہ ہر دور کے شعراء کا ہمعصر متصوّر ہو۔ اگر دیکھا جائے تو یہ عظمت کی کسوٹی بھی ہے اور ثبوت بھی۔ شاہ لطیف نے اپنے علاقہ کے خس و خاشاک تک سے محبت کی ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہ جذبہ اس قدر دلکش اور مترنم الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے شاہ صاحب نے جغرافیائی اور سیاسی حالات کی بے پناہ نیرنگیوں کے باوجود اپنی شاعری میں ماضی اور حال کے مابین خطِ فاصل نہیں کھینچا ہے۔

شاہ صاحب کی شاعری میں محبت کا وفور ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شاہ صاحب نے جس دور میں "عشق" کا علم بلند کیا ہے اس دور میں "عمل" اور "حرکت" کی کمی تھی۔ عارفوں نے تسلیم کیا ہے کہ عشق پژمردہ دلوں میں حریت فکر اور دعوت عمل پیدا کرتا ہے۔ سندھ شاہ صاحب کے دور میں غیر یقینی صورت حال سے دوچار تھا۔ شاہ صاحب نے عشق اور اخوت پر بے پناہ زور دیا ہے چونکہ وہ جانتے تھے کہ عشق کے رشتوں میں بندھے ہوئے عوام بیرونی خطرات کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں۔

میں شاہ لطیف کی شاعری کے اس وصف خاص سے بطور خاص متاثر ہوں کہ وہ غیر یقینی اور ناامیدی کی ذہنی فضا میں بھی "عشق" کی شوریدہ سری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کم ہمت لوگ عموماً اس عالم میں غفلتا گ ہو جاتے ہیں اور بے عمل افراد اپنے غیظ و غضب کی آگ میں جل کر خاکستر ہو جاتے

ہیں —

شاہ صاحب نے اپنی شاعری سے اپنے دلدادگان کی سماجی اور سیاسی حالت بدلنے کا کام لیا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا مقصد نہیں تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان کی شاعری کی تفہیم کا لازمی نتیجہ ہے۔ انھوں نے ایک ایسے معاشرے کے لیے آواز اٹھائی ہے جو خیر و عدل پر مبنی ہو —

جہاں "ماروی" محرومی اور یاسیت سے ہمکنار نہ ہو سکے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ شاہ صاحب نے شاعری کی دنیا میں ایک ایسا گلستان آباد کیا ہے جس کے پھولوں کی رنگا رنگی اور خوشبو ابدی ہے۔ وہ شاعروں کے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر

افسانہ
انگلستان اور فرانس میں

انگریزی افسانے کا اپنا افسانہ بھی کسی افسانے سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ ادبی تاریخ کے حوالوں کو مد نظر رکھیں تو انگریزی افسانہ انیسویں صدی کے وسط کی پیداوار قرار پائے گا۔ لیکن یہ کہہ دینا کہ اس سے قبل انگریزی ادبیات افسانے ایسی چیز سے قطعی طور سے نا آشنا تھی، یقیناً غلط ہوگا اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی ملک یا زبان کے ادب میں کسی مخصوص صنف کی وقوع پذیری، زلزلہ سے سمندر میں اچانک ظہور پذیر ہو جانے والے جزیرے کی مانند اچانک یا خودکار قسم کی نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے عوامل و محرکات کے ایسے لہر در لہر سلسلے ملتے ہیں جو بعض اوقات صدیوں پر محیط ہوتے ہیں GRANT OVERTON نے اپنی معروف تالیف "THE

"PHILOSOPHY OF FICTION" میں
فکشن کی اولین صورت "عہد نامہ قدیم" میں تلاش کی ہے۔
اس کے بقول "انسان کی اولین کہانیاں یا اساطیر درحقیقت
اپنے خدا یا دیوتاؤں سے حق و صداقت کی فیصلہ طلبی کے لیے
تھیں چنانچہ ان میں سے مکمل طور پر محفوظ شدہ کہانیاں
بائیبل کے اس دور میں ملتی ہیں جنھیں ہم قدیم قانون یا عہد نامہ
عتیق کہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی قدیم یہودیوں کا
یہ ادب کہانیوں کے ایک حیران کن سلسلے کی حیثیت رکھتا ہے
ان تمام کہانیوں میں پلاٹ نمایاں تر نظر آتا ہے اور یہ بالکل
آج کی تکنیک کی مانند ہے یعنی یہ پلاٹ ایسے واقعات اور
حوادث کا مجموعہ ہے جو انجام کے بارے میں غیر یقینی صورتحال
کو جنم دیتے ہیں۔" (ص: ۳۴)

یوں دیکھیں تو دنیا بھر کی ادبیات میں اساطیر، لی جنڈز
اور مذہبی روایات کو بلاشبہ افسانوں کی اولین اور بعض صورتوں
میں تو مکمل ترین صورت بھی قرار دیا جا سکتا ہے (خود قرآن
مجید میں خدا نے سورۃ یوسف کو "احسن القصص" قرار
دیا ہے)

انگریزی میں زمانہ قدیم کے نامعلوم شعراء کی "BALLADS"
کا بھی اس ضمن میں نام لیا جا سکتا ہے ان میں سے بیشتر
"BALLADS" میں ناکام محبتوں کے المیے ملتے ہیں یا پھر
جانباز عشاق کے محیر العقول کارنامے اب یہ "BALLADS"

قدیم انگریزی لوک ادب کا قابل قدر ورثہ ہیں۔

گو قدیم دور میں پیشہ ور مغنی سرائیوں اور بھٹیار خانوں میں انھیں سنا کر اپنا پیٹ پالتے ہیں مگر آج کے تنقیدی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے پر ایسی بے شمار "BALLADS" مل سکتی ہیں جن میں پلاٹ، واقعات کی ترتیب و پیش کش اور کردار نگاری میں کسی منجھے ہوئے افسانہ نگار ایسا رچا ہوا فنی شعور ملتا ہے۔

انگلستان میں نشاۃ الثانیہ نے اگرچہ تاریک دور کو ختم کرایا لیکن "DARK AGE" کی ہانٹڈ فضا اجتماعی شعور سے دور نہ ہو سکی اور اس نے کہانیوں کی اس خاص صورت کو جنم دیا جنھیں "گوتھک" (GOTHIC) کہا جاتا ہے۔ یہ ویران قلعوں میں بھٹکتی روحوں، پر اسرار اور تحیر خیز واقعات صدیوں کے طلسم چھپائے تہ خانوں، اجڑے ویرانوں اور کھنڈرات کی کہانیاں تھیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو کہانیوں کے سلسلے بھی ملتے ہیں جو اب "رومانس" کے عمومی نام سے پہچانی جاتی ہیں ان کہانیوں میں سے بیشتر سرفروشی اور شجاعت کے واقعات پر مبنی ہیں۔ جبکہ بعض میں قدیم لی جنڈز وغیرہ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ اب ماضی کی داستان پارینہ بن چکی ہیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ سب انگریز قوم کے اجتماعی لاشعور کا ایک حصہ بن گئیں کیوں کہ ان کی فکشن میں کسی نہ کسی طرح سے گوتھک اور رومانس کا امتزاج نظر آجاتا ہے۔ چنانچہ ادب میں رومانیت کی

تحریک کے عروج میں بھی ہمیں مشہور شاعر شیلے کی بیوی میری شیلے "THE CURSE OF FRANKENISTIEN"
ایسی کہانی لکھتی نظر آتی ہے جس میں فرینکینیسٹین اپنے خالق کا یوں ہی پیچھا کرتا ہے جیسے کوئی بھوت اپنے شکار کا، اس کے بعد برم سٹوکر کا "ڈریکولا" آتا ہے اور اس انداز کی لاتعداد کہانیاں جو تسخیر قمر کے دور کے قارئین کو سینکڑوں برس پیچھے گوتھک کہانیوں کے دور میں لے جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ اردو ادب کے برعکس انگریزی فکشن میں اس انداز کی کہانیاں بھی ادب کا حصہ سمجھی جاتی ہیں حتیٰ کہ جاسوسی کہانیاں اور ان کے خالق بھی اتنے ہی مقبول اور پسندیدہ رہے ہیں جیسے کہ دیگر ادبی افسانہ نگار۔ چنانچہ شرلک ہومز کے خالق سر آرتھر کانن ڈاہل سے لیکر 007 جیمز بونڈ کے خالق این فلیمنگ تک جاسوسی کہانیاں لکھنے والے ہر عہد میں بے حد مقبول اور اس کے ساتھ ساتھ متمول بھی رہے ہیں۔
انگلستان میں افسانے کا انیسویں صدی کے وسط میں آغاز ہوتا ہے اور یہ عجب اتفاق ہے کہ انگریزی میں افسانہ امریکی اثرات کا مرہون منت نظر آتا ہے۔ ایڈگر ایلن پو نے سب سے پہلے اس انداز کی کہانیاں لکھی تھیں۔ جنھیں ہم آج کی ادبی اصطلاح میں مختصر افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ ایڈگر ایلن پو کی ابہام پسند علامتی شاعری نے فرانس میں بادلیر ایسے شعراء کو بے حد متاثر کیا اور یوں فرانس میں مختصر افسانہ کی ایک باقاعدہ روایت کی داغ بیل ڈالی گئی اب یہ الگ بات

ہے کہ فلوبیر کی صورت میں اسے صحیح راہنما ملا۔ شاید اسی لیے ایلین ٹیٹ کے بقول "فلوبیر جدید افسانہ کا خالق ہے"

انگلستان میں امریکی اور فرانسیسی اثرات کے تحت مختصر افسانے کا آغاز ہوا مگر جلد ہی مقامی فنکاروں نے اس میں اپنی انفرادیت کے جوہر دکھانے شروع کر دیئے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عہد کے بیشتر افسانہ نگار محض افسانہ نگار ہی نہ تھے انھوں نے کسی اور صنف میں بھی خصوصی شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ بلکہ بعض تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے افسانے بھی لکھ لیتے تھے جیسے آسکر وائلڈ جو بنیادی طور پر ایک ڈرامہ نگار بلکہ اپنے عہد کا شہرہ آفاق ڈرامہ نگار تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ "THE NIGHTIGALE ANSTHES ROSF" ایسے تاثر افسانے کا بھی خالق ہے۔

نوجوان اپنی محبوبہ کو گلاب کا سرخ پھول تحفہ میں پیش کرنا ہے مگر وہ ایسا کرنے پر قادر نہیں بلبل اس کے دکھ کو محسوس کرتا ہے اور سفید گلاب کے کانٹے کو دل میں پیوست کر کے رات بھر برہا کا گیت گاتا ہے حتی کہ صبح کو گلاب سرخ ہو جاتا ہے۔ بلبل کو اس کی قیمت خون دل کی صورت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو ایڈ ورڈ ڈیرل لوکس ایسے مصنفین آتے ہیں جنہوں نے انگریزی معاشرے کے تضادات کو طنز کا نشانہ بنایا۔ لوکس کے بارے میں یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ وہ مشہور ہمانہ

"پنچ" کے ادارتی عملہ میں شامل تھا۔
اگرچہ آج آر۔ ایل اسٹیونسن اپنے شہرۂ آفاق ناولوں "THE TREASURE ISLAND" اور "THE KIDNAPPED" کے لیے مشہور ہے۔ مگر اس نے مختصر افسانے بھی لکھے اور بہت اچھے لکھے۔ اس کے افسانوں میں "مارکھیم" خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے میں مجرم ذہن کا جس کامیابی اور فنکاری سے نفسیاتی مطالعہ کیا گیا ہے وہ بعض امور میں وہ سٹوفسکی کے "THE CRIMEAND THE PUNISHMENT" کی یاد دلاتا ہے اسٹیونسن نے "DR, JACKAL AND MR. HYDE" میں بھی انسانی شخصیت کے اس تاریک پہلو کا کامیاب مطالعہ کیا ہے جسے جدید نفسیات کی اصطلاح میں "SPLIT PERSONALITY" کہا جاتا ہے ـــ ایچ جی ویلز نے انگریزی ادب کو سائنس فکشن کا تحفہ دیا۔ خلا، تسخیر قمر، جوہری توانائی، اجنبی سیاروں سے آنیوالی خوفناک بلائیں اور مستقبل میں لے جانے والی ٹائم مشین یہ سب ویلز کی پُر اسرار سائنسی دنیا میں ملتے ہیں۔ ویلز کے مختصر افسانے بھی ایسے ہی سائنسی موضوعات پر ہیں۔
سمرسٹ ماہم تک آتے آتے انگریزی افسانے نے کئی کروٹیں لی ہیں ۔ اس سے قبل ڈی۔ ایچ۔ لارنس، فرینک ہیرس اور آلڈوس ہکسلے ایسے اسماء ملتے ہیں یہ تینوں اور بالخصوص لارنس

اپنے وقت کے سنجیدہ نزاعی ادیب رہے ہیں۔ اپنے مخصوص نظریات کی بنا پر بھی اور نزاعی اندازِ نظر کے باعث بھی، ویسے یہ تینوں بنیادی طور پر ناول نگار تھے اور انہیں پر ان کی شہرت کی اساس استوار رہے۔ ماہم نے افسانوں کے علاوہ ناول اور ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ سمرسٹ ماہم صحیح معنوں میں ایک جہاں گشت ادیب تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے افسانوں کے لیے مواد اور کردار بھی اسی طرح سے تلاش کیے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں آج تک کسی ایسے شخص سے نہیں ملا جس نے مجھے کوئی کہانی نہ دی ہو۔ شاید اسی لیے اس کے افسانوں میں کرداروں کا بے حد تنوع ملتا ہے۔

سمرسٹ ماہم ان انگریز افسانہ نگاروں میں سے ہے جن کے افسانوں کے اردو میں بکثرت تراجم کیے گئے ہیں۔ میں اس کی ایک طویل کہانی "THE RAIN" کا خصوصی تذکرہ کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس کی تھیم اب عالمی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ فرانس میں اناطول فرانس کی شہرۂ آفاق "تائیس" ہندی میں بھگوتی چرن ورما کا "چترلیکھا" اور اردو میں سعادت حسن منٹو کا افسانہ "کروٹ" (جسے بعد میں اس نے ڈرامائی روپ بھی دیا۔) سب ایک ہی تھیم کی کہانیاں ہیں یعنی مرد بھٹکی ہوئی عورت کو سیدھی راہ دکھانے میں خود راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ جبکہ بھٹکی ہوئی عورت صحیح راہ پر آجاتی ہے۔ ان چاروں کا تقابلی مطالعہ دلچسپ تنقیدی نتائج کا موجب بنے گا۔

اردو میں ایک اور انگریزی افسانہ نگار کا بھی بہت ترجمہ ہوا ہے اور یہ ہے ایم۔ایچ منرو۔ جب منرو نے عمر خیام کی رباعیات کا مطالعہ کیا۔ تو وہ ان سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے لیے "ساقی" کا قلمی نام اپنا لیا۔ اور اس نام سے اب وہ مشہور ہے۔ ساقی اگرچہ انگریزی ادب کے قد آور افسانہ نگاروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اپنے افسانوں کے اچانک اور ڈرامائی اختتام کی بنا پر وہ موپساں اور او ہنری کی تکنیک کی یاد دلاتا ہے۔ اردو میں اس انداز کے لیے منٹو نے خصوصی شہرت حاصل کی ہے۔ ورجینا وولیف اور جیمز جوائس سے انگریزی افسانہ تکنیک کے انقلاب سے روشناس ہوتا ہے ان دونوں نے پلاٹ اور کردار و واقعات کی جکڑ بندیوں سے افسانہ کو آزاد کر کے اس میں "FREE ASSOCIA TION" یعنی آزاد تلازمہ شعور کی رو اور فلیش بیک سے کام لیکر افسانے کو اس قابل بنا دیا کہ وہ لاشعور کے سیال لمحات کو الفاظ کا پیکر دے سکے۔ جیمز جوائس کا ناول "ULYSSES" عالمی ادبیات میں خصوصی مقام کا حامل ہے۔ لیکن یہ امر بے حد معنی خیز ہے کہ اس نے ادبی سفر کا آغاز مختصر افسانوں سے کیا تھا۔ "DUBLINERS" اس کی پہلی کتاب بھی تھی اور افسانوں کا اولین مجموعہ بھی۔ بالفاظ دیگر نئے اسلوب کی تلاش کا آغاز اس نے افسانے سے کیا۔ بلکہ "ULYSSES" کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر اسے بھی مختلف افسانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیمز جوائس

نے "DUBLINERS" میں اپنے آبائی شہر ڈبلن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرنے کے لیے جن کرداروں کا انتخاب کیا وہ انفرادی حیثیت میں فرد ہیں مگر اجتماعی حیثیت میں معاشرہ کے کسی ایک طبقہ کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ یوں چند افسانوں سے اس نے ڈبلن کی زندگی کا "MOSAIC" تیار کر دیا۔ تو یہ ہے انگریزی افسانے کی ایک مجمل تصویر! ایک صدی پر محیط، مگر بعض ایسے اثرات کی حامل جو اسے قدیم دور اور ڈرامے کے بجز سے بھی ملا دیتے ہیں۔

اس دوران میں افسانے نے کئی ادوار دیکھے کبھی رومانی محبت اور اس کے المیے لکھے گئے تو کبھی ادب برائے زندگی کے نقطۂ نظر سے معاشرہ میں طبقاتی کشمکش اور اس کے اقتصادی عوامل و محرکات اجاگر کیے گئے۔ پھر جدید ترین افسانے کا دور آتا ہے جس میں تکنک کی پابندیاں توڑنے کا رجحان قوی نظر آتا ہے اب فرانس اور امریکہ کی مانند انگریزی افسانے میں بھی علامت نگاری اور تجرید کے تجربات کیے جا رہے ہیں۔

اس مختصر سے جائزے سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا تو یقیناً واضح ہو جاتا ہے کہ موضوعات و اسالیب کے لحاظ سے انگریزی افسانے میں تجربات کے تنوع کی کمی نہیں۔ اور یہی سب سے اہم ہے کہ اس سے افسانہ ادب زندگی کے بدلتے انداز اور زمانہ کی کروٹوں کا ساتھ دینے کے قابل ہو سکتا ہے چنانچہ اس لحاظ سے جائزہ لینے پر انگریزی افسانہ کم عیار ثابت نہ ہوگا۔

یورپ کے مختلف ممالک اپنی خصوصیات کی بنا پر مشہور ہیں اور یہ شہرت اتنی قدیم اور دیرپا ہے کہ بعض ممالک کی صورت میں تو اس نے اب ضرب المثل ایسی حیثیت اختیار کر لی ہے چنانچہ آج ہم برطانیہ، اٹلی، یا جرمنی کا نام لیتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ان ممالک سے وابستہ خصوصیات علامت کی طرح اُبھر آتی ہیں فرانس کا بھی یہی حال ہے۔ فرانس کا نام آتے ہی فیشن، مصوّری اور کلچر ایسے تلازمے اُبھرتے ہیں گویا فرانس اور یہ سب لازم و ملزوم ہوں۔ لیکن فیشن اور مصوّری کے ساتھ ساتھ عالمی ادبیات میں بھی فرانس کی عطا کچھ کم نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ فرانس ادب و فن کی کئی جدید تحریکوں کا منبع بھی رہا ہے چنانچہ شاعری میں سمبلزم اور مصوّری میں کیوبزم اس کی مشہور مثالیں ہیں۔ الغرض ادب و فن اور فنونِ لطیفہ کی دنیا میں فرانس اپنے ایفل ٹاور ہی کی مانند ممتاز و منفرد اور سربلند نظر آتا ہے۔ فرانس میں ادب کے آغاز اور ارتقاء کا مطالعہ کرنے پر یہاں بھی وہی صورت حال کارفرما نظر آتی ہے جسے کسی حد تک عالمی ادبیات سے ہی مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے یعنی سب سے پہلے شاعری ظہور پاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آہنگ اور ترنم انسان کی گھٹی میں پڑے ہیں اس لیے جذبات و احساسات کے براہِ راست اظہار کے لیے ہر عہد کے انسان کو موزوں الفاظ کی مترنم ترتیب ہی موزوں ترین نظر آتی رہی ہے چنانچہ اسی نفسی وقوعہ کے زیر اثر فرانسیسی زبان میں بھی ادب نے شاعری

کی صورت میں اظہار پایا۔ جس کی ایک انتہا پر تو چرواہوں کسانوں اور دیہی لڑکیوں کے لوک گیتوں کی سادگی نظر آتی ہے تو دوسری طرف شہروں اور درباروں میں زبان کی فنکاری کے نمونے ملتے ہیں چنانچہ چودھویں صدی تک فرانس میں نثری ادب نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اور قصے کہانیاں لیجنڈ حتیٰ کہ تاریخی واقعات اور کوائف کا بیان بھی منظوم صورت ہی میں ہوتا تھا۔ اس عہد کے امراء اور خاندانی لوگ شاعروں کو معاوضے کے طور پر اپنے خاندان کا احوال اور اپنے آباء کے کارناموں کی منظوم تاریخ لکھوا لیتے تھے اس دور میں کہانیوں کے بیان کے لیے "FABLIAUX" کی صورت میں ایک جداگانہ صنف سخن ملتی ہے یہ رومانسز اور اسی نوع کی دیگر منظوم کہانیوں سے اپنے مزاج کے لحاظ سے یکسر مختلف تھی۔ اس حد تک کہ آج کی ادبی اصطلاح میں اسے حقیقت نگاری کا ادب قرار دیا جا سکتا ہے "A SHORT NISTORY OF FRANCH LITTERATURE" کے مؤلف جیفرے برونٹن نے فرانسیسی ادب میں مختصر افسانہ کے آغاز کا سب سے اہم محرک اور ماخذ اٹلی کے بکاچو کی "DECAMEERON" کو قرار دیا ہے (ص - ۲۱۴) ڈی کیمرون کا عالمی کلاسیک میں جو مقام ہے اسے بطور خاص اجاگر کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے۔ ڈی کیمرون سو کہانیوں کا مجموعہ ہے جو حلقۂ احباب میں دس دنوں میں سنائی گئی تھیں یوں دیکھیں تو بلحاظ مزاج یہ الف لیلیٰ سے مماثل

قرار پاتی ہے۔ یعنی ایسی مختلف کہانیاں جن میں موضوع یا کرداروں کی وحدت نہیں ملتی۔ بس الف لیلیٰ کی مانند ایک فرد یا ڈی کیمرون کی مانند مختلف افراد انہیں بیان کرتے ہیں۔ کردار و واقعات کے لحاظ سے ڈی کیمرون کی کہانیاں جدید مختصر افسانے کے قریب تر نظر آتی ہیں اور انھوں نے فرانس کے ساتھ ساتھ دیگر یورپی ادبیات پر بھی خاصے گہرے اثرات ڈالے ہیں اس انداز کا پہلا مجموعہ "LES ZENT NOUVELLEES" چودہویں صدی میں لکھا گیا۔ یہ سو کہانیوں کا مجموعہ ہے جسے برگنڈی کے دربار سے وابستہ کسی شخص نے قلم بند کیا مگر اس نے انھیں اپنے نام سے منسوب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کے بعد اس انداز پر اور اس سے ہٹ کر بھی منظوم اور نثری قصے کہانیاں بیان ہوتی رہیں چنانچہ سولہویں صدی تک فرانس میں "NOUVELLE" ایک مقبول صنفِ ادب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ یہ اصطلاح مختصر افسانے اور طویل کہانیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس اصطلاح کے سلسلے میں یہ واضح کر دینا لازمی ہے کہ یہ اٹلی کے "NOVELLA" سے ماخوذ ہے چودہویں صدی سے لیکر سولہویں صدی تک فرانس میں ڈی کیمرون کے انداز کی کہانیوں کی مقبولیت میں کسی طرح کمی نہ ہوسکی چنانچہ سولہویں صدی کی ایک ملکہ نے بھی ۱۵۵۹ میں "HEPTAMERON" کے نام سے کہانیوں پر مشتمل کتاب مکمل کی۔ یہ کہانیاں سات دنوں میں سنائی جاتی ہیں۔ مصنفہ کا نام مارجری (MARGUE REE)

تھا۔ یہ شاہ فرانس فرانکوسس اوّل کی بیٹی اور ناروے کی ملکہ تھی اس نے دربار سے وابستہ امرا اور عالی مرتبت بیگمات کی زندگی سے پردے اٹھائے ہیں۔ سولھویں صدی میں چھاپہ خانے کی ایجاد نے کتاب کو ایک کمرشیل چیز بنا دیا اب تک کتابیں امرا اور رؤسا کے لیے لکھی جاتی ۔ مگر پریس کی بنا پر اب کتاب ہر ہاتھ پہنچائی جا سکتی تھیں۔ اس لیے کتاب کی زیادہ مانگ ہونے لگی۔ چنانچہ قدیم اور نایاب کتابوں کی بازیافت کے ساتھ ساتھ معاصر قلمکاروں نے NOUV ELLE کی صورت میں اپنے قلم کے جوہر دکھانے شروع کر دیے یہی نہیں سترھویں صدی میں طویل کہانیوں کے مقابلہ میں مختصر افسانے نے زیادہ فروغ پایا۔ (ص: ۱۱۸۰) ان کہانیوں کا ایک مقبول عام انداز و اعترافات یا یادداشت "MEMORI" کی صورت میں ملتا ہے اسی صدی میں "REERIDMG HOOD" اور اسی انداز کے دیگر لوک قصوں کو جمع کر کے ان سے اخلاقی نتائج اخذ کرنے کے رجحان نے بھی جنم لیا۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں GALLAND نے الف لیلیٰ کا ترجمہ (۱۷-۱۷۵۴) کیا۔ ڈی کیمرون کی مانند الف لیلیٰ کے اس ترجمے نے بھی فرانسیسی ادبیات پر خلاصے گہرے اثرات ڈالے۔ چنانچہ جوزف برونٹن کے بموجب اس نے اگر ایک طرف ہمہ مختصر افسانے میں طرح نو ڈالی تو دوسری طرف کہانیوں میں موضوعات، واقعات و کردار اور ماحول کی عکاسی میں مافوق الفطرت

کے ساتھ ساتھ مشرقیت کا ایک CULT بھی بنا دیا۔ ان کہانیوں میں کھل کھیلنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ اس طرح قلم کی بے لگامی بھی ملتی ہے جدید نفسیات میں "سادیت" یعنی (SADISM) اور ساکیت یعنی (MASOCHISM) کی اصطلاحات اتنی معروف اور مقبول ہیں کہ ان سے وابستہ نظریات کی بطور خاص تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات حقیقی افراد کے ایما پر استوار ہیں کاونٹ مسوک جرمن تھا اور مارکوئیس ڈی ساڈ فرانسیسی ڈی ساڈ (۱۸۱۵-۱۷۴۵) نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں جو کچھ لکھا وہ اس کی زندگی کا آئینہ ہے۔ بلکہ اپنی بے راہ روزندگی اور اس کے ساتھ ساتھ زہر خورانی کے جرائم کی بنا پر اسے ۳۲ برس کی عمر میں جیل ڈال دیا گیا جہاں اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا چنانچہ بقایا عمر پاگل خانے میں بسر کی اور وہیں انتقال ہوا۔ ڈی ساڈ کی دو کتابیں جیسٹن اور جولیٹ بہت مشہور ہیں۔ مگر اس نے افسانے بھی خاصی تعداد میں قلم بند کیے ہیں۔ اس کے افسانے ابنارمل جنس کے موضوعات پر ہیں۔ انیسویں صدی سے فرانس میں مختصر افسانے اور اس کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کے سنہری دور کا آغاز ہوتا ہے۔

والٹیر، ستاں دال۔ وکٹر ہیوگو، بالزاک۔ فلوبیر اور موپساں کی صورت میں افسانے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ ایسے نام ہیں جنھوں نے فرانس ہی نہیں بلکہ عالمی فکشن

پر گہرے اثرات ڈالے ہیں ان میں سے موپساں کی استثنائی مثال سے قطع نظر باقی سب نے ناولوں میں خصوصی نام پیدا کیا ہے لیکن انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور خوب لکھے ہیں۔ جبکہ موپساں کے ناولوں کے مقابلے میں اس کے افسانوں نے کہیں زیادہ شہرت حاصل کی۔

بالزاک بکثرت لکھنے والوں میں سے تھا۔ اگرچہ اس نے "طربیۂ انسانی" کے عمومی عنوان سے جو ناول قلم بند کیے انھوں نے خصوصی شہرت حاصل کی ہے لیکن "BEST OF BALZAC" میں شامل مختصر افسانے بھی خاصے کی چیز ہیں "ڈرنکرڈ" اور "ناناں" کا خالق ایمیلی زولا فرانسیسی ادب میں واقعیت نگاری یا نیچرل ازم کی مکمل اور نمائندہ ترین مثال تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے ناولوں کے ساتھ ساتھ اس کی کہانیوں میں یہی انداز کارفرما ملتا ہے۔

مختصر افسانے میں خواہ وہ فرانس کا ہو یا کسی اور ملک کا موپساں کا نام عجیب دلکشی کا حامل نظر آتا ہے وہ زولا سے متاثر تھا اور فلوبیر کا شاگرد بلکہ روایت تو یہ ہے کہ موپساں فلیوبیر کو کہانیاں لکھ کر دکھاتا اور وہ انھیں تلف کروا دیتا تھا کہ موپساں کا تخلیقی جوہر صحیح معنوں میں صیقل ہو گیا۔ اسی لیے موپساں کی پہلی کہانی تیس برس کی عمر میں طبع ہوئی اس دور کے اخبارات مختصر افسانے شائع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ موپساں نے بھی اخبارات میں افسانہ نگاری شروع کر دی۔ شاید اسی لیے اس کے افسانے صحیح معنوں میں مختصر افسانے ہیں۔ کیوں کہ اخبارات کی ضروریات

کے مطابق وہ طوالت کی ایک خاص حد سے تجاوز نہ کر سکتا تھا۔ وہ اخبارات کے قارئین میں بے حد مقبول تھا۔ اس نے کوئی تین سو کے قریب افسانے لکھے جن میں سے بیشتر اردو میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔ موپساں نفسیاتی مریض تھا۔ وہ اس نفسیاتی خوف کا مریض تھا۔ کہ کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں اور واقعی یہی ہوا۔ اس نے پاگل خانے میں ہی جان دی ویسے اس نے عالم جنوں میں بھی کہانیاں لکھیں۔

انیسویں صدی کا اختتام مارسل پروست پر ہوتا ہے۔ پروست نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں واقعیت نگاری کی اس روایت سے انحراف کیا ہے جو زولا سے مخصوص تھی اور نصف صدی تک فرانس میں جس کا چرچا رہا۔ پروست نے کرداروں کی باطنی کشمکش اجاگر کرنے پر زیادہ توجہ دی ہے اس لیے اس کی کہانیوں میں تدبیر کاری کا وہ میکینیکل انداز نہیں ملتا جو زولا سے مخصوص سمجھا جاتا ہے اور جو عرصے تک مقبول رہا۔ موجودہ صدی نے یورپ اور اس کے ساتھ ساتھ باقی دنیا کو بھی دو عظیم جنگوں کے عذاب میں مبتلا کیا ہے۔ ان جنگوں میں انسانی زندگی کی ارزانی اخلاقی اقدار کے انحطاط بلکہ فقدان اور مروّج اقتصادی نظام کی ناکامی نے انسانی زندگی کی بے معنویت پر مبنی جس فلسفیانہ اندازِ نظر کو فروغ دیا اس کی نمایاں ترین مثال وجودیت کا دبستان قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس کی سب سے مشہور اور متنازعہ فیہ شخصیت سارتر ہے۔ سارتر نے فلسفہ کے ساتھ ساتھ ناول، ڈرامے

اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ "INTIMACY" اور "ERASTRATUS" کے افسانے جہاں بطور افسانے لاجواب ہیں۔ وہاں وہ اس مخصوص فلسفیانہ امورات کی تفہیم کے لیے کار آمد اشارے بھی مہیا کرتے ہیں۔ اس کا افسانہ "THE WALL" اس انداز کی نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

"THE CNILD OF ALEADER" اس کا ایک اور بہت اہم افسانہ ہے یہ افسانہ ایک کامیاب نفسیاتی مطالعہ ہے۔ اس میں اُن نفسی عوامل اور عمومی میلانات کی نشاندہی کی گئی ہے جو لیڈر کی ساخت اور اس کے پالتو تعصبات کی آبیاری میں اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ سارتر کا کمال یہ ہے کہ وہ فلسفیانہ افکار کو پس پردہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے افسانے میں افسانہ پن کبھی بھی مجروح نہیں ہوتا۔ اگرچہ کامیو نے خود کو کبھی بھی وجودیت کے دبستان میں شمار نہ کیا۔ لیکن اس کا نام وجودی فلاسفروں میں شمار ہوتا ہے۔ کامیو نے انسانی زندگی کی بے مقصدیت کو اجاگر کرنے کے لیے سسی فیس کی متھ کو نئے معانی پہنا کر اسے جدید انسان کی زندگی کا استعارہ بنا دیا ہے۔ اگرچہ وہ پلیگ آؤٹ سائیڈر اور "دی فال" ایسے ناولوں سے مشہور ہوا لیکن اس نے افسانے بھی لکھے ہیں چنانچہ THE JONAH میں اس نے حضرت یونسؑ کے کشتی سے کود جانے والے واقعہ کو لیکر فرد کے اپنے گھر سے کٹ جانے کی کہانی بیان کی ہے۔ ویسے اس کے یہ تینوں ناول طوالت میں مختصر ہی نہیں بلکہ مختصر افسانہ کی

اساسی خصوصیت یعنی وحدتِ تاثر کے : بھی حامل ہیں یہی
انداز ساگاں کا ہے جس کے مختصر ناول جیسے THE FACE
LEES PFO PLE. مزاجاً
افسانے ہی ہیں - فرانس جدید ترین ادبی تحریکات کا مرکز بھی رہا
ہے چنانچہ ادب میں سمبلزم اور سرریلزم کی تحریک کا آغاز اور
فروغ یہیں پر ہوا - سرریلزم دراصل مصوری کی تحریک تھی لیکن
اس نے افسانہ نگاری کو بھی متاثر کیا اس میں لاشعور کی گریزاں
کیفیات کی عکاسی کی جاتی ہے اس مقصد کے لیے فلیش بیک
آزاد تلازم خیالات اور فینٹیسی وغیرہ سے خصوصی امداد لی جاتی
ہے چنانچہ اب جدید فرانسیسی افسانہ زولا کی حقیقت نگاری
سے چل کر لاشعور کے نہاں طلسم خانہ میں آگیا ہے کہ اب
اصل حقیقت نگاری یہی ہے -

ڈاکٹر تبسم کاشمیری

اردو ڈرامہ
اندر سبھا سے پارسی تھیٹر تک

اردو ڈرامے کی ابتدائی شکل اندر سبھا ہے، اندر سبھا برصغیر کے زوال یافتہ جاگیرداری دور کی پیداوار ہے اور اس کا مطالعہ جاگیرداری تہذیب و ثقافت ہی کے حوالے سے کیا جا سکتا ہے، اردو ڈرامے کی تاریخ کا المیہ ہے کہ اس کے آغاز ہی سے بننے والی روایت اندر سبھا اور اس نوعیت کی دیگر سبھاؤں پر مشتمل ہے جاگیردارانہ معاشرے میں تفریح کی بنیاد ان عناصر پر مشتمل تھی۔

(۱) موسیقی

(۲) رقص

(۳) گائیکی

(۴) مزاح

اندر سبھا پہلے تین اجزاء کے امتزاج سے بنی، رقص موسیقی اور گائیکی کی روایت اپنے ماضی کے پرانے سلسلوں کے ساتھ اندر سبھا میں نمودار ہوتی۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اس زوال یافتہ معاشرے میں تفریح کا جو ذوق تھا یہ سبھائیں اُس ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتی تھیں ان میں اُس عہد کی تہذیب و ثقافت کے وہ سارے لوازمات جمع تھے جو ایک فارمولے کے تحت یکجا کر دیے گئے تھے اور یہی فارمولا اُس دور میں ڈرامے کی کامیابی کی بنیاد سمجھا جا رہا تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اندر سبھا میں ڈرامائی عنصر کو کم سے کم اہمیت دی گئی تھی۔ تجسّس کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب اشیاء بہت سست ہیں، مختلف کرداروں کی حرکات کو دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت آہستہ روی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ جس معاشرے اور تہذیب نے اندر سبھا کی روایت پیدا کی اس کی اپنی رفتار نہایت سست ہے یہ معاشرہ اپنے پیداواری نظام کی ساری تخلیقی قوتیں ختم کر چکا ہے اور اس معاشرتی بنجر پن نے اس کو ساکت کر دیا ہے۔ یہ ایک تھکا ہوا معاشرہ ہے جس میں ہر چیز پر تھکاوٹ کی گہری تہیں جمی ہوئی ہیں اور کسی نئے منظر کے آثار اس کے باوجود میں نظر نہیں آ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اندر سبھا اپنے ملبوس کے

باعث بحد سست ہے، خاص طور پر آج کے تیز رفتار صنعتی دور میں اس روایت کو دیکھیں تو لازمی طور پر اس کا ڈرامائی عمل بہت سست معلوم ہوتا ہے۔

اندر سبھا کی روایت میں رقص و موسیقی پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا اس کی دو وجوہات خاص طور سے واضح ہوتی ہیں اول یہ کہ ایک زوال پذیر معاشرے کے لوگوں کی اعصابی تھکن کو سکون دینا دوم اعصابی طور پر لوگوں کو مزید سلانا تاکہ وہ زندگی کے حقائق سے دور فراریت کے اس رستے پر چلتے رہیں اس قسم کے ڈراماتی ادب کو لکھنؤ میں عروج حاصل ہوا۔ لکھنؤ کے آخری حکمران واجد علی شاہ کی سرپرستی اور ذاتی دلچسپی کے باعث یہ ڈرامائی ادب مقبول ہوا۔ واجد علی شاہ قیصر باغ کے ڈراموں میں خود بھی شریک ہوتے تھے لہٰذا اس شاہی دلچسپی اور سرپرستی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک خاص طریقہ کا ماحول بنا جس میں اندر سبھا کی روایت کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔

اردو ڈرامے کا دوسرا دور پارسی تھیٹر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ خالصتاً تجارتی تھیٹر تھا۔ مگر اس تجارتی تھیٹر پر اندر سبھا کی روایت کا خاص طور پر عمل دخل تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ پارسی تھیٹر اندر سبھا ہی کی ایک توسیعی شکل ہے تو غلط نہ ہو گا، پارسی تھیٹر اندر سبھا کی روایت سے آگے تو بڑھا مگر اس پر اندر سبھا کی گرفت بہت مضبوط رہی۔ اس تھیٹر نے بہت سے نئے تجربات بھی کیے اس کی وجہ بمبئی کا ماحول تھا۔ بمبئی لکھنؤ کے مقابلے

میں جدید ترین مغربی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہونے والا شہر تھا اور برٹش تھیٹر کی ۔ روایت بھی یہاں پرانے زمانے سے موجود تھی جس سے اردو ڈرامے نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ پارسی تھیٹر کے مالکوں نے اپنے ڈرامہ نگاروں سے مغربی ڈراموں کے ترجمے بنوانے شروع کیے ۔ ان ترجموں میں وہ مقامی ماحول اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا رنگ پیدا کر دیتے تھے۔ آرام رونق، طالب اور حافظ عبداللہ کے ڈرامے انھی کڑیوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔

ان ڈرامہ نگاروں نے جو ادب پیدا کیا اس میں پارسی تھیٹر کے مالکان کے عزائم زیادہ غالب رہتے تھے۔ ان کمپنیوں کے مالک ڈرامہ نگاروں کو کسی مغربی ڈرامے کی کہانی دیکر اُس کے پلاٹ اور کرداروں کو ایک خاص ماحول میں ڈھال کر پیش کرنے کو کہتے تھے ۔ ڈرامہ نگار کہانی کو اردو ڈرامے کی شکل تو دیدیتے تھے مگر اصل ڈرامے میں جو اعلیٰ درجے کا ہونا تھا ۔ اس کو کچل دیتے تھے اور ایک بھونڈا سا چربہ سامنے لے آتے تھے ۔ اس سارے کھیل سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ پارسی تھیٹر میں کمتر درجے کی چربہ سازی کی بھونڈی روایات کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا اور یوں نہایت اعلیٰ سطح کے مغربی ڈرامے بُری شکلیں لیکر اردو کے روپ میں ظاہر ہوئے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان ڈراموں کو ہمارے لیے پڑھنا بھی مشکل ہے ۔

پارسی تھیٹر کے ڈرامہ نگار زندگی کی ٹھوس معروضی حقیقتوں

ہے دور ہتے تھے یہ لوگ اپنے معاشرے کے ساتھ بھی صحیح طور پر ہم آہنگ نہ تھے ، انھوں نے اپنے ڈراموں میں معاشرے کے سطحی اور بھی نقشے پیش کیے یا پھر سطحی قسم کے عامیانہ عشقیہ جذبات پر مبنی پلاٹ کو آگے بڑھایا ڈرامہ نگار انسانی نفسیات کے عمل کو سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ ان کی نظر انسانی نفسیات کی باریکیوں شخصیت کے داخلی بحران اور تضادات اور اندرونی کشمکش تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ ان کے ڈرامے کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے ڈرامہ نگار زندگی کے خارجی اور باطنی مسائل سے بے بہرہ تھے ۔ یہ لوگ مکمل طور پر اپنے مالکوں کے قبضہ میں تھے اور زندگی کی اصل تصاویر کو اپنے ڈراموں میں لانے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے ۔ یوں یہ ڈرامہ نگار مغلوب نظر آتے ہیں اور ان کے اس رویے نے اس دور کے ڈرامے کو فنی اور فکری طور پر بالکل بنجر بنا دیا۔

پارسی تھیٹر کی روایات میں اردو ڈرامے کو جو فروغ حاصل ہوا۔ اس روایت میں سب سے پہلا ڈرامہ نگار آرام ہے جس کے بعد تقریباً دو درجن ڈرامہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔ حافظ عبداللہ ، رونق اور ظریف وغیرہ اسی روایت کا تسلسل ہیں۔ ان ڈرامہ نگاروں کے فن کا جائزہ لینا بھی آج سے کچھ عرصے پہلے تک بہت مشکل تھا کیوں کہ ان ڈرامہ نگاروں کے متن ہی نہ دستیاب ہوتے تھے یا دستیاب ہوتے بھی تو اتنی بری حالت میں ہوتے کہ ان سے استفادہ کرنا وبالِ جان بن جاتا ۔ سید امتیاز علی تاج نے

سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد ان ڈرامہ نگاروں کے ڈرامے حاصل کیے، ان کا انتخاب کیا، ترتیب دی اور ضروری حواشی کے ساتھ انھیں شائع کردیا۔ آج انھیں انتخابات سے ہم اردو تھیٹر کی پرانی روایت سے روشناس ہوتے ہیں۔ ورنہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک اس دور کا جائزہ لینا از حد مشکل تھا۔

اچھے ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں میں سنجیدگی اور تفریح کے عناصر موجود ہوتے ہیں اور اس کا ایک اہم مقصد معاشرتی برائیوں کی طرف توجہ کرا کے ان کی اصلاح ہوتا ہے۔ یوں تو ہر فن پارہ زندگی کی عکاسی کرتا ہے مگر ڈرامہ زندگی کے حقیقی رنگوں کو پیش کرتا ہے، اس میں زندگی متحرک کرداروں کی شکل میں اجاگر ہوتی ہے اور اس طرح سے ڈرامہ معاشرتی عمل کو پیش کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔

مندرجہ بالا نظریے کے تحت جب ہم پارسی تھیٹر کا جائزہ لیتے ہیں تو بالکل مختلف صورت سامنے آتی ہے، اس دور میں لکھے گئے ڈرامے میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا نہایت سطحی، معمولی اور سرسری ادراک موجود ہے، ان سب ڈرامہ نگاروں میں معاشرتی عمل کا معمولی تجربہ نظر آتا ہے اصل میں یہ ڈرامہ نگار سماجی تجربہ کی رسمی سطح سے آگے سوچ نہ سکتے تھے۔ اس دور کے ڈرامے کی تباہی کا بڑا سبب ان کی رسمی سطح تھی جس سے ہٹ کر وہ سماجی شعور اور انسان کے باطنی اعماق تک نہ جھانک سکتے تھے معلوم ہوتا ہے اُن کے نزدیک یہ مسائل غیر اہم تھے اس کے برعکس

ان کی پوری توجہ ڈرامے کے رسمی تفریحی عنصر پر مرکوز رہی اس پر وہ اپنے فن کی بنیادیں استوار کرتے رہے۔

ڈرامے کے اس اولین دور میں اچھے ڈرامے منظر عام پر نہ آنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی روایت میں ڈرامے کو غیر سنجیدہ صنف سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا یہاں کے تخلیقی ذہن اس طرف توجہ نہ کر سکے، آرام، طالب اور رونق کے عہد میں کہ جو ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوتا ہے، اردو ادب میں نہایت اچھے داغ موجود تھے مگر ان کی توجہ شاعری اور نثر کی دیگر اصناف پر رہی اور ڈرامہ رسمی تفریح کے طور پر نظر انداز ہوتا رہا اور قابل اعتنا نہ سمجھا گیا اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس دور میں ناول پر توجہ دی گئی۔

نذیر احمد، سرشار، شرر، اسعد نے شاہکار ناول لکھے مگر ڈرامے سے سرد مہری کا رویہ اپنائے رکھا۔ اس وقت پارسی تھیٹر عروج پر تھا مگر ان کے مالکان ان مصنفین سے ناواقف رہے یا کاروباری سیٹھوں کے نزدیک یہ حضرات ڈرامہ لکھنے کے اہل ہی نہ تھے کیوں کہ ڈرامہ بغیر کسی ذہانت کے لکھا جاتا تھا جو بالآخر ایک فارمولے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ جہاں مقررہ مقامات پر ہلکا پھلکا مزاح، رقص اور المیہ اور کلائمکس کی طرف بڑھا جاتا تھا۔ اس طرح اپنی نصف صدی سے زیادہ کی زندگی میں پارسی ڈرامہ اپنی محدود رسمی حدود کے اندر ہی گردش کرتا رہا۔ آرام اور اس کے معاصرین نے اسی کمتر درجے کے فارمولے

کے تحت ڈرامے لکھے۔ یہ ڈرامے مشرق کی لوک کہانیوں سے بھی لیے گئے ہیں، مثلاً رونق نے "ہیر رانجھا" آرام نے "حاتم طائی" حافظ عبداللہ نے "علی بابا چالیس چور" "لیلیٰ مجنوں" اور "شکنتلا" کو ڈرامہ بنایا ہے۔

یہ ڈرامہ نگار زیادہ تر بادشاہوں کی کہانیاں ہی پیش کرتے ہیں۔ انیسوی صدی کے ربع آخر میں اگرچہ بمبئی، کلکتہ اور دیگر بڑے شہروں میں مڈل کلاس ابھر رہی تھی مگر یہ ڈرامہ نگار دور کھڑے نظر آتے ہیں۔ پارسی تھیٹر کی یہ روایت فنی اعتبار سے ناقص ہے جاگیر داری عہد کی رسمی تفریحی روایات نے اس دور کے ڈرامے کو پنپنے نہ دیا ان تفریحی روایات کی وجہ سے اگرچہ اردو تھیٹر کو زبردست مقبولیت حاصل ہوتی مگر اردو ڈرامہ فنی اعتبار سے پستی کی حالت میں سفر کرتا رہا۔ اس پورے دور میں ایک بھی ڈرامہ ایسا نہیں ہے جسے آج پیش کیا جا سکے۔

— — —

غوث بخش صابر

جدید بلّوچی ادب

ایک جائزہ

قیام پاکستان سے کچھ پہلے تک بلّوچی ادب اکثر و بیشتر اُس شعری سرمائے کے معنوں میں مستعمل رہا جو عہد رفتہ کے تاریخی، معاشرتی اور ثقافتی ورثے کا امین اور اس قوم کے قابل فخر کارناموں کا مظہر ہو کر سینہ بہ سینہ محفوظ و منتقل ہوتا رہا تاہم انگریزی دور میں حکمرانوں کے سیاسی اغراض اور مشنری ضروریات کے تابع رومن رسم الخط میں کچھ کتابیں بلّوچی زبان کی تالیف کی گئیں تو ان کا اثر تعلیم کی کمی کے باعث عام لوگوں تک پہنچنے نہیں پایا پھر مشنریوں کی سرگرمیوں کے انسداد کی غرض سے الجواب کے طور پر علمائے کرام خصوصاً

درخانی مکتبۂ فکر کے بزرگوں نے اشاعت دین میں بلوچی زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا ابھی یہ دور اپنے اختتام کو نہیں پہنچ سکا تھا کہ تحریک آزادی کا غلغلہ بلند ہوا۔ یوسف عزیز اور اس کے رفقا کی سعی نے پہلی اور دوسری کل ہند بلوچ کانفرنس کا انعقاد کرایا جس کے نتیجے میں بلوچستان سے اخبارات کے اجرار کے ساتھ ساتھ جولانیٔ فکر شعر و سخن میں ڈھلنے لگی۔ اخبارات ہر چند کہ اردو میں تھے مگر چند اصحاب نے وقتاً فوقتاً اظہار خیال کو سہل تر بنانے کے لیے بلوچی میں بھی خامہ فرسائیاں کیں۔ ان بزرگوں میں سے کچھ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ ان سب عوامل نے مل کر جدید بلوچی ادب کے لیے میدان ہموار کیا۔ یوں جدید بلوچی ادب سنہ ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ اپنے پہلے اور باقاعدہ ماہنامہ "اومان" کی شکل میں منصۂ شہود پر آیا۔ یہ ماہنامہ جسے مولانا خیر محمد ندوی کراچی سے شایع کرتے تھے چند وجوہ سے زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا مگر شوق و تشویق کی بہت سی راہوں کی نشاندہی ضرور کی۔

"اومان" خود تو مسائل و مشکلات کی تاب نہ لاکر داغِ مفارقت دے گیا مگر اس کے جگائے ہوئے جذبوں نے اظہار کے لیے ایک اور ذریعہ تلاش کیا۔ نامور شاعر اور ادیب آزاد جمال دینی نے بلوچی ادب کا یہ گرتا علم بڑھ کر اٹھا لیا۔ اور "بلوچی" کے نام سے کراچی ہی سے ایک ماہنامہ جاری کرایا۔ یہ ماہنامہ "اومان" سے کچھ زیادہ ہی سخت جان ثابت ہوا۔ دو ڈھائی سال تک باقاعدگی

سے شایع ہوتا رہا بالآخر مالی مجبوریوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مگر اس ماہنامہ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اس مختصر سے عرصے میں کراچی کے علاوہ اندرونِ بلوچستان لکھنے والوں کا ایک بڑا طبقہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ بلوچی ادب کی ترقی کے حوالے سے اہلِ قلم اور شائقینِ ادب نے اس وقت کی حکومت سے یہ مطالبہ منوالیا کہ بلوچی زبان کو نشریاتی اداروں میں اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ ریڈیو پاکستان کراچی سے بلوچی نشریات کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں بلوچی لکھنے والوں میں مرحوم سید ظہور شاہ ہاشمی، مولانا خیر محمد ندوی، قاضی عبدالرحیم صابر، مراد ساحر اور احمد ظہیر جیسے شاعر و ادیب بلوچی زبان کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف رہے۔ یہ سب کے سب آج کے نامور لکھنے والوں میں محسوب ہیں مگر اس دائرہ سے باہر بھی ایک حلقہ بلوچی ادب کی خدمت کے جذبے سے سرشار تخلیق و تالیف میں منہمک رہا۔ اس حلقے میں میر شیر محمد مری، میر گل خان نصیر، میر محمد حسین عنقا مرحوم خارزار سیاست و صحافت کے میدان سے اور میر مٹھا خان مری، ملک محمد پناہ مرحوم، حاجی عبدالقیوم بلوچ، میر محمد سردار خان اور بہت سے دوسرے مختلف علمی ادبی اداروں کی وساطت سے میدانِ ادب میں گرانقدر ادبی اضافوں کا باعث بنتے رہے۔

کوئٹہ شہر کے ایک بارونق بازار میں مرحوم ملک محمد پناہ نے "قومی کتاب گھر" کے نام سے ایک چھوٹی سی دکان کھول ڈالی۔

یہ مختصر سی دکان بلوچی ادب کے قصر کی حیثیت اختیار کر گئی۔ قومی کتاب گھر کی وساطت سے انجم قزلباش، میر عبدالرحمٰن کرد، میر عبداللہ خان جمال دینی، محسن سلام اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں کا بلوچی ادب میں عمل دخل بڑھ گیا۔ لیکن بلوچی ادب کے جدید دور میں حقیقی ترقی ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے قیام کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب کراچی سے ریڈیو کی بلوچی نشریات کوئٹہ منتقل ہوئیں تو بلوچ اہلِ قلم کی مناسب پذیرائی بھی ناگزیر ہوتی۔ جوں جوں نشریات کے اوقات میں اضافہ ہوتا گیا، شوق کے ساتھ معاشی احتیاجات کا ازالہ بھی ہوا اور بلوچی ادب میں نئے نئے اصناف و اسالیب کا بھی اضافہ ہونے لگا۔ موسیقی کے پروگراموں کی بدولت نئے اصنافِ شعری نے بلوچی شاعری کو چند ہی سالوں میں نئے نئے خیالات بخشے، تقاریر کے ذریعہ علمی، ادبی اور تاریخی مواد کا ایک قابلِ ذکر سرمایہ جمع ہو گیا۔ ڈرامے لکھے جانے لگے جو ابتدائی دور میں بھی اپنے معیار کے اعتبار سے معاصر زبانوں سے پیچھے نہیں کہے جا سکتے تھے۔ تراجم کے ذریعہ دیگر زبانوں کی خوشہ چینی سے بھی بلوچی ادب ترقی یافتہ افکار سے مالا مال ہوتا رہا۔۔۔ اس بامقصد ترقی میں یوں تو ہر شعبے کے لکھنے والوں کا حصہ رہا تاہم تین نام ایسے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اس جائزے کو ادھورا بنا دیتا ہے۔ بشیر احمد بلوچ جو خود بھی ایک صاحب طرز ادیب ہیں اپنے فرائضِ منصبی کے ہمقرین اس مہم کے نگران رہے عطا شاد جو اعلیٰ پائے کے شاعر ہیں اور میر صورت خان مری جن کا

ادب میں ایک ممتاز مقام ہے ان کی بدولت بلوچی کے لکھنے والوں کا اس ادارے کو مکمل تعاون حاصل رہا۔ یوں بلوچی ادب کی ترقی میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا نمایاں مقام متعین کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء اور سنہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں دو اور اہم عنصر بلوچی ادب کی پیش رفت میں قابل ذکر ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کا قیام عمل میں آیا۔ بلوچی زبان کے اہل قلم اور دانشوروں کا اس ادارے کو ایک مدت تک تعاون حاصل رہا۔ چنانچہ ساٹھ ستّر کے قریب کتابیں مختلف موضوعات پر یہاں سے شایع ہوئیں اس سلسلے کا دوسرا واقعہ محکمہ نشر و اشاعت قبائل کوئٹہ کے زیر اہتمام ماہنامہ "آس" کی اشاعت ہے جو بلوچی زبان کی معروف شخصیت میر امان اللہ گچکی کی ادارت میں بلوچی زبان و ادب کی ترقی میں قابل قدر اضافے کا باعث بنا۔ جناب گچکی کے بعد میر عبدالحکیم بلوچ اس کے مدیر مقرر ہوئے "آس" کا یہ دور بھی ترویج زبان و ادب میں مثالی کہلاتا ہے۔

بلوچی ادب کی ترقی کی مندرجہ صدر دہائی میں ہفت روزہ "نوکیں دور" اور پندرہ روزہ "زمانہ" بلوچی کا ممتاز مقام رہا ہے۔ اول الذکر میر عبدالکریم شورش (کریم امن) کی ادارت میں کوئٹہ سے شایع ہوتا رہا جسے کچھ عرصے اردو کے مایہ ناز شاعر و ادیب جناب کامل القادری کا تعاون حاصل رہا۔ گویہ اخبار ابلاغ کے عصری تقاضوں کے مطابق حالات حاضرہ کا آئینہ دار رہا لیکن اس میں ادبی اور علمی تحریروں کا بھی اچھا خاصا

ذخیرہ ملتا تھا۔ پندرہ روزہ "زمانہ" پہلے پہل کراچی سے نکلتا رہا۔ صدیق آزاد، ظفر علی ظفر۔ ابراہیم نگوری اور بہت سے بلوچی لکھنے والوں نے اسے معیاری بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر چونکہ ادبی امور کے ساتھ اس کا مطمح نظر کچھ تجارتی بھی تھا اس لیے کراچی سے کوئٹہ منتقل ہوا تاکہ بلوچستان کے مرکزی شہر میں رہ کر زیادہ سرپرستی اور قلمی تعاون حاصل کر سکے مگر اسے وہ ادبی مقام نہ مل سکا جو پندرہ روزہ کی حیثیت میں کراچی میں اسے حاصل تھا، سنتے ہیں کہ اب الحاج عبدالقیوم بلوچ کی نگرانی میں ایک ماہنامے کی صورت میں عنقریب منظر عام پر آکر ایک نئے دور کے آغاز کا باعث بننے کو ہے۔

کراچی میں ہر چند کہ بلوچی ادب کی ترقی کے وسیع امکانات ہیں لیکن وہاں ادبی اداروں کو حکومت کی مناسب سرپرستی حاصل نہ ہونے سے ادبی تحریکات دیرپا نہیں رہتیں، تاہم وہاں کے تخلیق کاروں نے نامساعد حالات کے مقابلے میں کبھی ہمت نہیں ہاری وہ نئی نئی ادبی تحریکوں کو جنم دیتے آرہے ہیں۔ بلوچی اکیڈمی بھی ابتداً کراچی میں قائم کی گئی تھی اس کی کوئٹہ منتقلی کے بعد وہاں "بلوچی ادبی بورڈ" قائم کیا گیا۔ اسی ادارے سے بلوچی مطبوعات کا ایک قابل ذکر ذخیرہ چھپ کر سامنے آچکا ہے۔ اس کا جاری کردہ ہفت روزہ "صدائے بلوچ" ادب کے میدان میں مصروف عمل ہے۔ کراچی ہی کے بلوچی اہلِ قلم نے نامور بلوچ شاعر مُلّا فاضل رند کی یاد میں فاضل اکیڈمی کی

تاسیس کی۔ یہ ادارہ بھی اپنی یاد میں ایک آدھ کتاب چھوڑ کر داغِ مفارقت دے گیا۔

بلوچستان سے شایع ہونے والے کچھ اردو اخبارات بھی بلوچی ادب کی ترویج و اشاعت کے مدّعی ہیں۔ ان میں مستونگ کے ملک محمد رمضان کا ہفت روزہ "ساربان" مستونگ ہی کا روزنامہ تعمیر بلوچستان اور خضدار سے نکلنے والا ہفت روزہ "مسلم" اور کوئٹہ سے مرحوم ملک محمد پناہ کا جاری کردہ "نوائے وطن" اپنے اپنے دائرے میں بلوچی ادب کی خدمت میں مقدور بھر مصروف ہیں تاہم اس بارے میں ملتان سے شایع ہونے والے ماہنامہ بلوچی دنیا کا مقام ممتاز و منفرد ہے۔ یہ جریدہ مولانا نور محمد خان فریدی بلوچ نے اس مقصد کے تابع جاری کیا کہ بلوچ تاریخ و ثقافت کے محو شدہ نقوش کو اجاگر کرے تاکہ بلوچ تاریخ کی تحقیق میں مختلف افکار و نظریات سامنے آسکیں۔ حتیٰ کے اس ماہنامے نے اس ذیل میں بلند پایہ نظم و نثر کا ایک بڑا ذخیرہ زبان کو دیا جس کو بنیاد بنا کر بلوچی تاریخ، ثقافت اور ادب کے شعبوں پر اس ادارے نے قابل قدر کتابیں شایع کرائیں تاریخ بلوچستان ان میں سے قابل ذکر ہے۔ بلوچی دنیا کی ادارت آج کل میر جاکر خان بلوچ کر رہے ہیں۔

پاکستان آرٹس کونسل بلوچستان ہر سال چند گنے چنے مشاہیر کی یاد مناتا ہے۔ یہاں اکثر اردو اور علاقے کی دیگر زبان کے مشترکہ مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ ان سے بھی بلوچی زبان

ادب کو بڑی تقویت ملتی رہی۔ پاکستان ٹیلیویژن بھی اپنے حلقۂ اثر میں بلوچی ادب کی اشاعت اور ترقی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے گویہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔

بلوچی زبان و ادب کی جدید ترقی کے باب میں سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی سعی اپنی اپنی جگہ قابل ستائش رہی ہے۔ تاہم بلوچستان میں اشاعتی موانعات کی موجودگی ادب کی پیش رفت میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود کچھ لکھنے والوں نے محض جذبے کی بدولت اس مشکل کو آسان بنا ڈالا۔ ایسے لکھنے والوں کی صف میں بہت سے نام آتے ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے بلوچی ادب میں کتاب چھپوا کر قابل قدر اضافہ کیا۔ ان میں میر گل خان نصیر نے اپنی تمام تر شعری تخلیقات کی خود طباعت کرائی ہے جس میں "گلبانگ"، "دوستیں شیرین" "شپ گروک" "حمل جئیند کلمتی اور گرند" شامل ہیں تاہم اردو نثری تخلیقات دوسرے طباعتی اداروں کے تعاون سے منظر عام پر آئیں جبکہ سید ظہور شاہ ہاشمی جو ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف و مؤلف ہیں انھوں نے اپنی تمام کتابوں کی اشاعت اپنی گرہ سے کرائی، بلوچی ادب کی ترقی میں مرحوم ظہور شاہ ہاشمی کا جو کردار رہا ہے بلحاظ اسلوب بھی اور بہ اعتبار فکر و نظر بھی وہ ایک مکتبۂ فکر کا درجہ رکھتا ہے مستقبل میں محقق و مؤرخ ہی اس کا یہ درجہ متعین کر سکیں گے۔

بلوچی ادب کے اس جائزے کو کسی طرح بھی مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ اگر بلوچی ادب کی موجودہ انحطاط پذیر حالت کا ذکر نہ کیا جائے اور اس کے وجوہ کا تعین نہ ہو۔

جدید بلوچی ادب کا ارتقا ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی پر محیط ہے۔ جب ریڈیو پاکستان کوئٹہ "آس" بلوچی اکیڈمی اور "نوکیں دور" کے چار ادارے یکساں فعال اور اس ایک مقصد کے درپے تھے کہ کسی نہ کسی طرح بلوچی زبان کو کسمپرسی کی اس اتھاہ گہرائیوں سے نکالا جائے جو عدم سرپرستی کے باعث اس کی پسماندگی کا سبب بنے تھے۔

افسوس کہ یہ وحدت فکر زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی۔ نوکیں دور اپنی کوتاہ اندیشیوں کی بھینٹ چڑھ گیا اور دوسرے سرکاری اور نیم سرکاری ادارے مختلف اسباب کی بناء پر وہ معیار برقرار نہ رکھ سکے جو ان کی روایات رہ چکی تھی۔

صدیق آزاد، ظفر علی اور ایسے ہی ولولہ انگیز لکھنے والوں کی رفاقت "زمانہ" سے چھوٹ گئی۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے وسائل پہلے سے زیادہ سہی لیکن باہمی اختلافات کی دیمک اس کی قوت کار کو چاٹ چکی ہے۔

بلوچی زبان کے بڑے بڑے انشا پرداز میر مٹھا خان مری عطا شاد، میر صورت خان مری، عبدالحکیم بلوچ اور میر طاہر محمد خان نے مجبوراً اس ادارے سے کنارہ کشی اختیار کی اور ریڈیو پاکستان کوئٹہ "لکھ مرے لکھ پال نہ مرے" کے

مصداق لکھ پال کو روپیٹ چکا۔ ٹیلی ویژن کا ہفتے میں پچاس منٹ کا پروگرام بھلا بلوچی ادب کی گرتی ہوئی ساکھ کو کیا سہارا دے سکے گا۔

بلوچی ادب اب بھی تخلیق ہو رہا ہے۔ زمانہ، سوغات اور اس کے صفحات اب بھی سیاہ کیے جا رہے ہیں۔ مگر وہ جذبۂ رفاقت مفقود ہے جس نے چند سال پہلے بلوچی ادب کے جسد میں روح پھونک دی تھی۔

محمد اعظم اعظم

ترجمہ طاہر آفریدی

رحمان بابا

(عوام کا شاعر)

رحمان بابا پشتو ادب کے جس دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ پشتو شاعری کا زریں دور کہلاتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ پشتو اس وادی میں شاعر کی روح اتر آئی ہو، اور یہ روح جب وجودی چہروں میں آشکار ہوتی ہے تو خوش حال خان خٹک۔ رحمان بابا۔ اشرف خان ہجری۔ عبدالقادر خان۔ حمید بابا۔ معز اللہ خان اور مصری خان گگیانی جیسے قدآور لوگ پشتو ادب کے لیے نئی جہتیں اور زاویے بناتے ہیں ــــ پشتو شعرو ادب کو ایک کلاسیکی اور دوامی مرکز مل جاتا ہے۔

اس پس منظر میں جو تاریخی ثقافتی داخلی اور خارجی عوامل سامنے آتے ہیں ان پہ ایک الگ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا عہد پشتو ادب کی پرانی شاعری کے عروج کا دور تھا جس میں بڑے اور پائے کے شاعر شاعری کے آسمان پہ کہکشاں کیطرح دکھائی دیتے ہیں۔

یہ زمانہ مغلوں کے ساتھ پختون کی مسلسل ناچاقی اور کش مکش کا زمانہ تھا یہ ایک اتفاق ہے کہ اس ناچاقی اور اس سے پیدا ہونے والی سیاسی تحریکوں کی ابتدا بایزید انصاری (جو پیر روشن اور پیر تاریک کے ناموں سے شہرت رکھتے ہیں) کی روشانی تحریک سے ہوتا ہے۔ اور پشتو شعر و ادب کی نئی تحریک بھی ان سیاسی تحریکوں سے شروع ہوتی ہے۔ اس نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریک (پیر روشن تحریک) کے بانی بایزید انصاری نے اپنے افکار و عقائد پشتو زبان میں "خیر البیان" کے نام سے لکھے ہیں۔ اور ان کے مریدوں۔ دولت خان لوانی ارزانی اور مرزا خان انصاری نے پشتو شعر کو تصوّف کا رنگ دیا۔ اور اس کے نتیجے میں پہلی مرتبہ پشتو ادب میں صوفیانہ خیالات نے رواج پایا۔

پیر روشن تحریک کے صوفیاء کی شاعری علمی رخ کے ساتھ واضح فنّی خوبیاں بھی رکھتی ہیں۔ اس میں مرزا خان انصاری کا دیوان پشتو ادب میں صوفیانہ شاعری کا شاہکار ہے۔ جس کا

ایک بڑا حصّہ تغزل کے نمونے پیش کرتا ہے۔ اور ان روایات کو ایک منظم اور مصفّا شکل میں اگر آگے بڑھا کر کسی نے برتا ہے تو وہ عبدالرحمان بابا ہیں۔

ایک بڑے محقق دوست محمد خان کامل نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ پشتو ادب میں صوفیانہ خیالات اور افکار کی ابتدا روشن تحریک کے ساتھیوں سے ہوتی ہے۔ تو دوسری طرف اس کی قبولیت اور مقبولیت کا درجہ رحمان بابا ہی کو دیا ہے۔

اس کی حمایت تو ہر باشعور فرد کرے گا کہ جو شہرت اور مقبولیت پشتو شعروادب میں رحمان بابا کو حاصل ہے اب تک کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوسکا ہے۔

یہاں تک کہ پشتو شعروادب کے سب سے بڑے بابا خوشحال خان خٹک نے بھی عوامی پیمانہ پر وہ شہرت نہیں پائی ہے جو رحمان بابا کے حصّے میں آئی ہے۔ اس شہرت کی وجہ ان کا صوفیانہ کلام ہرگز نہیں ہے۔ جو ان کے نام کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔ اور جو ان کی شاعری کا مخصوص رنگ سمجھا جاتا رہا ہے اور جس رنگ نے عوام میں رحمان بابا کو درویشی اور ولایت کے درجے تک پہنچایا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو رحمان بابا کی درویشانہ طبیعت اور ولایت نے انھیں ایک بڑا شاعر نہیں بنایا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان کی صاف ستھری شاعری نے ان کو عوام میں ایک ولی کا

مقام عطا کیا ہے۔

رحمان بابا کی شاعری کا ایک سب سے بڑا وصف ان کے خیالات کی بے ساختگی اور بیان کی سادگی ہے۔

ان کے اعلیٰ تخیل۔ فکر رسا اور حقیقی جذبے نے جو بھی کچھ جمع کیا ہے۔ انھوں نے اپنے عوام کے سامنے خوبصورت اور شائستہ اور عوامی لہجہ میں پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے انسانیت کا زخم اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے اور خارجی دکھ درد، محرومی اور المیے اپنی ذات کے اندر سمیٹ لیے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے دل کے تار پر جو بھی نغمہ چھیڑا ہے، سوز و گداز کی چنگاریاں نکلی ہیں۔

ان کی بات ہر ایک کو اپنے دل کی بات محسوس ہوتی ہے۔ اور ہر ایک اس میں اپنے درد کا درماں تلاش کرتا ہے۔

رحمان بابا ایک پڑھے لکھے عالم تھے۔ اپنے وقت کے مروجہ علوم پر دسترس حاصل تھی۔ یہ بات ان کے اشعار سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان بھی بخوبی سمجھتے تھے۔ ان کے کلام میں مذکورہ زبانوں کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو فارسی اور عربی کی ترکیبیں بہ کثرت استعمال ہوئی ہیں۔ اور اس کے ساتھ ان کے بیان کی سادگی اور ترمی اتنی ہے کہ ہمارے بڑے بڑے شعراء کے کلام میں بھی کم دکھائی دیتی ہے۔ اور اس خوبی نے رحمان بابا کے کلام کو ایک انفرادیت بخش دی ہے۔ رحمان بابا کے اس شعر سے اس بات کی تصدیق

بھی ہوتی ہے ؎

چہ منکر پرے اعتراض کولے منشی
داد ے شعر دے رحمانہ کہ اعجاز

یعنی۔ تیرے منکرین فن بھی اعتراض نہیں کرتے
اے رحمان! یہ تیرا شعر ہے کہ اعجاز ہے

بنیادی طور پر رحمان بابا غزل کے شاعر ہیں۔ غزل اس وقت فارسی میں کمال کو پہنچ رہی تھی۔ جب کہ پشتو میں نئی نئی وارد ہوئی تھی۔ خوشحال خان خٹک جیسے بڑے باکمال شاعر نے اپنے فن کا جوہر منوایا مگر پختون عوام نے عام مقبولیت کی سند رحمان بابا کو دی۔

رحمان کی غزل ایک طرف پاکیزہ ولطیف جذبات اور نادر تخیل کی رنگین اور خوبصورت تصویر پیش کرتی ہے تو دوسری طرف سیدھے، رواں، نرم اور میٹھے الفاظ بھی زبان کو شیرینی بخشتے ہیں۔

رحمان کی غزل رنگین خیالی اور بے ساختگی کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے کہ عوام وخواص کا دل کھینچ لیتی ہے۔

اگر تغزل کے رنگ اور فنی باریکیوں کی وجہ سے ان کے کلام کو ایک شاہکار کہا جاتا ہے تو جذبات کی گرمی، بیان کے سوز وگداز، سادگی اور نرمی کی وجہ سے بھی ہر ایک کے زخمی دل پر مرہم لگالیتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

رحمان حسن و دیار ونیم بہ پردہ کنبے

نہ ہمیذ ل نور د شمع بہ فانوس

ترجمہ :- اے رحمان! محبوب کا حسن تو پردے میں بھی نظر آتا ہے۔ جیسے نور شمع کبھی فانوس میں چھپ نہیں سکتا۔

تماشا بہ زما ہلہ در بکارہ شی!

کہ تہ ما غوندے بے دل او زرہ دلبر وے

ترجمہ :- تماشہ تو میرا جب تم دیکھ لیتے کہ تم میری جگہ بیدل اور میں تمھاری طرح دلبر ہوتا۔

کہ نور خلق قدمونہ ږدی پہ زمکہ

ما دے ایښے پہ اسمان قدم د زړہ

یعنی :- اگر لوگ زمین پہ قدم رکھتے ہیں تو کیا میں نے تو آسمانِ دل پہ قدم رکھے ہیں

بزرگ

حسن وعشق کا یہ بیقرار بھونرا حُسن کے پھولوں سے دامن بھر رہا ہے اور پھر نئی نئی بہاروں اور خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ؎

چہ ئے او سید وستا حسن بے حسابہ

لالہ دے قصدہ تاؤ پیدا شود افتابہ

ترجمہ :- جب تیرا حسن بے حساب دیکھا

تو آفتاب نے بھی تاؤ کھا کر قصداً تمازت پیدا کی

؎ کہ دے زلفے بہ خم ریچ و تاب شوے نبائی

و بخښته لله قالت لوی دا او ر د تابه

ترجمہ :- اگر تیرے گیسو رخساروں پہ پیچ و تاب کھاتے ہیں تو کیا
بالوں کی انگاروں کے سامنے کیا حقیقت ہوتی ہے

؎ د رحمان بخت به علا د خوبه ویښ شي
چه نه ستر کے پورته کړے د خوابه

ترجمہ :- رحمان کا بخت تو جب ہی بیدار ہوگا
جب تو نیند سے بوجھل آنکھ اٹھائیگا

تبصرہ

حسن و عشق خوبصورتی اور محبت کے جو لازوال نغمے رحمان بابا نے تخلیق کیے ہیں تو اس میں حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ یہ نغمے ایک شاعر کی لفاظی اور روایات کی گردان نہیں ہے۔ یہ تو الفاظ میں قلبی واردات ہیں جو ایک حقیقی شاعر کے دل پر گزرتی ہے۔ یا وجدان کی حوریں ہیں جو شعر کے صیقل آئینوں میں خود کو سنوارتی ہیں۔ سنگھار کرتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے ایک علاقے کے شاعروں کے کلام میں (خصوصاً مشرقی حصے کی شاعری میں) بہت کم ایسے مضامین، خیالات اور موضوعات آتے ہیں جو کسی ایک شاعر کی گرفت میں آگئے ہوں اور دوسرے سے رہ گئے ہوں۔

اس مقام پر جو چیز شاعروں کو ایک جداگانہ حیثیت اور درجہ دیتی ہے وہ ان کے اسلوب بیان اور اظہار کے طریقے ہیں۔ اس کا احساس ہر بڑے اور سچے فنکار کو ہوتا ہے

اور یہی وجہ ہے کہ بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کے کلام سے متاثر ہوتا ہے۔ اور شعوری یا لاشعوری طور پر وہ کچھ کہتا ہے جو دوسرے نے کہا ہو۔ یہ پھر اس کی فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اسی خیال کو کتنے بھرپور انداز میں پیش کرتا ہے۔

جناب دوست محمد کامل نے رحمان بابا اور فارسی کے نامور شاعر خواجہ حافظ کے چند اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"فارسی غزل میں جو مٹھاس اور لذت حافظ کی زبان میں ہے وہی مٹھاس وہی لذت پشتو میں رحمان رکھتے ہیں"

جیسے اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے واضح ہوتا ہے کہ رحمان بابا ایک پڑھے لکھے عالم تھے ان کی فارسی زبان سے واقفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے (بشمول خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا) عربی اور فارسی استادوں سے کافی فیض حاصل کیا ہے۔ جہاں تک رحمان بابا کا تعلق ہے تو ان کے کلام میں فارسی ادب کے استادوں خصوصاً حافظ کے فکر و نظر خاص طور پر ان کے انداز اور طرزِ ادائیگی کا اثر غالب ہے۔

کامل صاحب نے بڑی محنت اور کوشش سے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں حافظ اور رحمان کے کلام کے چند نمونے پیش کیے ہیں جس پر جناب حمزہ شینواری نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے لیکن یہ بات سب سے زیادہ حمزہ شینواری کو معلوم ہوگی کہ شاعری

خیال کے توارد کے احتمال کے علاوہ ایک شاعر کا انداز بیان، ہیئت زبان اور لہجہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خیال اور فکر سے زیادہ اسلوب ایک شاعر کے کلام کو دوسروں سے جدا رکھتا ہے۔

یہاں بے جا نہ ہوگا اگر خواجہ حافظ اور رحمان بابا کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کر دیے جائیں جس میں قریب قریب ایک خیال مختلف زبان اور الفاظ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

حافظ کہتے ہیں:۔

ہر سر موئے مرا باتو ہزاراں کار است
ماکجائیم و نصیحت گر بے کار کجاست

رحمان بابا کہتے ہیں:۔

دیار غم بہ هے هو سرے پہ شمار کہ
چے شمیر کی ئے وخنبہ وی دخپل ځان

حافظ:۔

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

رحمان:۔

ازادی تہ دا پہ هورته بلد نشته
چہ بندی دیار د زلفو پہ زنځیر شوم

ترجمہ:۔

آزادی اس کے سوا اور کہیں نہیں
جو محبوب کی زلفوں کی اسیری میں ہے

ان شعروں میں رحمان بابا کا ایک مخصوص رنگ و آہنگ ہے یہی رنگ یہی لہجہ اور آہنگ ان کے کلام میں ایک غنائیت اور موسیقیت پیدا کرتا ہے اور یہی موسیقی اور غنائیت رحمان کے فن کا وہ کلام ہے کہ ہر خاص وعام کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا ہے۔...... رحمان بابا کے شعر کی غنائیت اور سرور کے متعلق اس رائے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شاعری خالی پیکر ہے اور روح نہیں، خالی الفاظ ہیں معنیٰ نہیں۔ شعر میں معنی ابھی الفاظ سے جدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن خوبصورت اسلوب یا حسن وبیان الفاظ کی معنویت اور بھی نمایاں کرتے ہیں۔ معنی بذاتِ خود ایک ساز ہوتا ہے۔ اور لفظوں کی آواز اور لہجہ کے زیر وبم اس ساز سے وہ میٹھے نغمے ابھارتے ہیں کہ اپنے گرد وپیش اور ماحول کو اپنے ساتھ مست اور بے خود کر دیتے ہیں۔

رحمان بابا نے اپنے نغموں کے لیے عوامی زبان اور لہجہ پسند کیا ہے اور وہ اپنے عوام سے اسی عوامی پیرائے میں مخاطب ہوتے ہیں ؎

کہتے ہیں :-

تہ چہ ماتہ وائے چہ ولے ژاړې

نہ دې زړہ لو میږی دغہ خپل جور و جفا

یعنی :- مجھ سے میرے رونے کا سبب پوچھتے ہو

کیا تم کو اپنا جور و جفا معلوم نہیں

نہ جور و جفا کړے نہ ژړا کوم زه به

ستا کہ دغہ ندی دہ ابہ حکم ندی زما

ترجمہ:۔ تیرا شیوہ ہے جور و جفا اور میرا رونا
تو اگر یہ نہ کرے تو وہ میں بھی نہیں کرونگا

ہم نغمے کاندی ہم رقص کہ ہم خاندی
د رحمان پہ شعر ٹر کے د با کرام

ترجمہ:۔ رحمان کے شعر پہ باگرام کے سب حسین
نغمے گا رہی ہیں رقص کرتی ہیں اور ہنس رہی ہیں۔

نامور مستشرق۔ ایچ ٹی راورٹی لکھتے ہیں۔

"پختون شعراء میں ملا عبدالرحمان سب سے زیادہ مشہور شاعر ہیں ان کی شاعری کا بڑا حصّہ دیگر مسلمان شعراء کی طرح مذہبی اخلاقی اور حقیقی محبت کا سچا نمونہ ہے لیکن ان کے اندازِ بیان میں وہ زبردست سوز و سادگی اور بے ساختگی نمایاں ہیں جو فارسی (ایرانی) کے پائے کے شاعروں کے کلام میں نہیں ملتی"۔

اگر رحمان بابا کے شعر میں انسانی زندگی اور اردگرد کے ماحول کے دکھ اور درد نمایاں ہیں۔ لٹی پٹی انسانیت کے زخموں کا بیان ہے۔ تو ان زخموں کے علاج کے لیے مرہم کی پٹیاں بھی ملتی ہیں۔

وہ زندگی کو بے عمل اور تارک الدنیا زاہد کی آنکھوں سے نہیں۔ بلکہ وہ ایک باعمل صوفی کی نظر سے دنیا کو انسانی زندگی کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ اور زندگی کو حسن و ارتقاء کے راستے بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ :۔

بندہ بند دہ دنیا
چہ تو بند دہ دعقبا

ترجمہ :- یہ دنیا اچھی بہت اچھی ہے
کہ اس میں آخرت کا سامان ملتا ہے

دنیا بحر دے بہبنذی
آئینے غوندے صفا

ترجمہ :- دنیا بحروں کی طرح رواں ہے
اور آئینے کی طرح شفاف ہے

خیل خیل مخ ور کبنے بعدہ شی
کہ څوک زشت دی کہ زیبات

ترجمہ :- (دنیا کے آئینے میں) سب اپنے اپنے چہرے دیکھتے ہیں۔ خواہ کوئی خوبصورت ہو یا بدصورت!

رحمان بابا کی اخلاقی شاعری کا بڑا حصّہ پختون قوم میں اتنا مقبول ہوا ہے کہ لوگ اسے روزمرّہ مثالوں میں پیش کرتے ہیں۔

درحقیقت اس قسم کی شاعری نے بیمار معاشرے کے ان زخموں سے پردہ اٹھایا ہے جو انسانی زندگی اور ارتقا کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

رحمان بابا کہتے ہیں

بے منتہ جام وزمہر خبلے بندے
نہ ئے عنہ چہ منت وخوشامد باد شئی کوثر نہ

ترجمہ:- بے منّت وخوف زہر کا پیالہ پینا اچھا ہے ۔ نہ وہ کہ منت اور خوشامد کریں "کوثر" کے لیے ۔

یا

هغه زده بدل طوفانه په امان دی
چه کشتے دغوندے دخلقو بار بردارشی

ترجمہ:- وہ دل طوفانوں سے محفوظ ہوگا
جو کشتی کی طرح لوگوں کی باربرداری کریں

یا

هغه ناوے چه په ځان ښائسته نه دی
څوک به ئے څه کاندے ښائیست د مور نیا

ترجمہ:۔ وہ دلہن جو بذات خود خوبصورت نہ ہو
کوئی اس کی ماں نانی کی خوبصورتی کا کیا کرے گا

مولانا عبدالقادر لکھتے ہیں کہ :-

"رحمان ہر ایک کے دل کی باتیں اپنے الفاظ میں کرتے ہیں ان کی آواز ہر ایک کے کانوں تک پہنچتی ہے ۔ مرد اور عورتیں بے ساختہ ان کے سادہ الفاظ کے ساتھ چلتے ہیں ۔ ان کے اشعار ہر ایک کے دل میں اتر جاتے ہیں ۔ سالکوں کا کہنا ہے کہ اگر قرآن کے سوا نماز کسی اور الفاظ میں ہوتی تو وہ نماز رحمان کے شعروں پر ادا کرتے ۔"

رحمان بابا پختون شعراء میں وہ واحد شاعر ہیں جو گلی گلی گاؤں گاؤں اور شہر شہر مقبول ہیں ۔ ان کے اشعار مثالوں ، محاوروں

اور روزمرہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں۔

ان کے کلام میں ایک ایسی جاذبیت ضرور ہے کہ جس سے ہر دل کی تسلی ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایاتی معنوں میں ایک عوامی شاعر ہے۔ اور اس کا کلام ادبی اور فنی حیثیت سے کچھ کم تر ہے۔ یا اس کی عوامیت میں عامیت پائی جاتی ہے۔

میرے خیال میں کوئی بھی باشعور شخص اس شک میں نہ پڑے گا اور نہ اب تک کسی نقاد نے رحمان کے کلام کے فنی اور ادبی مقام پر انگلی رکھی ہے۔

رحمان بابا کی فکر ایک انسان کی فکر ہے۔ وہ انسانیت کا مقام سب سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ وہ انسان کو دنیا کے لیے نہیں دنیا انسان کے لیے سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں :-

۵ آدمیت خہ پہ دولت دے رحمانہ
بت کہ جوڑ سی د سرو زرو انسان نہ شو

ترجمہ :- آدمیت اور انسانیت دولت سے نہیں ہے۔ اے رحمان! بت بھی تو سونے سے بنائے جاتے ہیں۔

وہ انسان کو انسانیت کے حقیقی معنوں میں خیلوں، قبیلوں قوموں اور قومیتوں کے حدود سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ نام جب اکٹھے ہوتے ہیں تو ایک انسانیت کا نام بن جاتا ہے۔ وہ انسان کو انسانیت کی اس اکائی کا مظہر سمجھتے ہیں۔

کہتے ہیں :-

نہ وہ عاشق ہم سرے کار ہے دے لا عشقہ
نہ خلیل نہ داؤد زئے ہم نہ مہمند

یعنی :۔ میں ایک عاشق ہوں میرا سروکار عشق سے ہے
نہ تو خلیل ہوں نہ داؤد زئی اور نہ مہمند

رحمان بابا کا نام ان مفکروں میں شامل ہے جو انسانیت کی ترقی اور معراج اور انسانی زندگی کی عظمت پر ایمان رکھتے ہیں اور بنی آدم کی اونچ نیچ ۔ اپنے پرائے ۔ کالے اور سفید میں تمیز نہیں کرتے ۔

کہتے ہیں کہ :۔

وارہ ڈچل ځان پہ نظر کورہ کہ دانائے
اے عبدالرحمانہ اجہان ټول عبدالرحمان دے

ترجمہ :۔ سب انسانوں کو اپنی نظر سے دیکھو اگر سمجھدار ہو
اے عبدالرحمان ! سارا جہان عبدالرحمن ہے

وہ جب مغلوں کے دور زوال (اورنگ زیب اور اس کے بیٹوں شاہ عالم وغیرہ کے دور) کی بدنظمی اور بد انتظامی کے سبب عوام پر روا رکھے گئے ۔ ظلم کا نقشہ دیکھتے ہیں تو ایک طرف ان کے کلام پر دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کے غم و درد سے پیدا شدہ یاسیت اور ایک دردناک فضا طاری ہوتی ہے تو دوسری طرف عوام اور انسانیت کا دکھ ان کو اس پر مجبور کرتا ہے کہ اس قسم کی صورت حال پر برملا تنقید کریں ۔ اور کہیں کہ :۔ (ترجمہ)

ظالم حکمرانوں کے سبب سے لحد۔ آگ۔ اور پشاور تینوں ایک ہیں
اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو رحمان بابا کی فکر ایک روایتی صوفی شاعر سے زیادہ ایک عوامی مصلح کی فکر ہے۔

اس وقت کے رائج علم و فنون اور علمی نظریے کی روشنی میں انھوں نے جو زندگی کا نظریہ اور رویہ قائم کیا تھا وہ یک گونہ ترقی پسند رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے عوام اور عوامی معاشرے کے ساتھ خود کو ایک مخصوص پیرائے میں باندھ رکھا ہے۔ اور یہ بندھن ابدی اور دوامی ہے۔ اور اسی بندھن کے لیے انھوں نے اظہار کا جو پیرایہ اختیار کیا ہے وہ پشتو ادب کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہے۔

وہ ایک طرف عوام کے دل کی آواز بن کر اٹھے اور دوسری طرف فن کے کوزے میں فصاحت و بلاغت کا سمندر بند کر دیا۔
وہ کہتے ہیں:۔

چہ د انور شاعران کاندے حقہ نہ کہ
رحمان کرے نورے نوے اجتہادے

(ترجمہ)

جو یہ اور شاعر کرتے ہیں تو وہ نہیں کرتا
رحمان نے تو نئے نئے اجتہادات کیے ہیں

خوشحال خان خٹک

ترجمہ خاطر غزنوی

حمد و ثنا

المدد میرے خدا میرے خدائے یکتا
ہو مدد تیری تو ہر کام رواں ہو میرا

فضل ہیں تیرے بہت کیسے سراہے کوئی
پھر بھی تا حدِ تواں میں ہوں ثنا خواں تیرا

پیر بھی تو نہیں برنا بھی نہیں پھر کیا ہے
جیسے تھا روزِ ازل، ویسے ابد تک ہوگا

کون ہے کر سکے جو ریگ کے ذرّوں کو شمار
ریگِ صحرا سے زیادہ ہے کہیں حدِّ ثنا

لفظِ کن سے کیا تخلیق جہاں بھر کو مگر
خود نہ پیدا ہے نہ تجھ سے کوئی پیدا ہوگا

تو سفید اور سیہ پر ہے جہاں کے حاوی
ہر سفید اور سیہ شاہدِ وحدت ہے ترا

خوب تر کام ہیں سب خوبی و نیکی ہیں ترے
ہم تلک پہنچے کبھی نیک کبھی بد مولا

حرفِ خوشحال کہاں تیری ثنا کے قابل
فضل سے اپنے اسے بخش دے رتبہ اعلیٰ

راغب مرادآبادی

صلِّ علیٰ محمدٍ

دل کا ہو وِرد اگر سدا صلِّ علیٰ محمدٍ — دور ہو گردِ ماسوا صلِّ علیٰ محمدٍ
دام و درم کا دائرہ اور ہو مدعا — گوہرِ مدعا مرا صلِّ علیٰ محمدٍ

اُس کا کرم سما سما، لمعۂ گُل کا سلسلہ — مہر و عطارد و سہا صلِّ علیٰ محمدٍ
رحم و کرم مدام کر، رسمِ سلوک عام کر — اور ہو کس کا آسرا صلِّ علیٰ محمدٍ

آگ کا، طولِ طور کا مسئلہ حل ہوا ہوا — سرِّ احد کا در کھلا صلِّ علیٰ محمدٍ
مردم و مور و مار کو، کاہ کو کوہسار کو — حکمِ صمد کُل عطا صلِّ علیٰ محمدٍ

سہم و سلاسل دور ہو، دل ہمہ کوہِ طور ہو — مالکِ مُلکِ دوسرا صلِّ علیٰ محمدٍ
اہلِ سلوک عام ہو، رسمِ محامدِ رسولؐ — صد درِ ارم ہوا صلِّ علیٰ محمدٍ

گردِ ملال کو ذکر دور ہو کس طرح مگر — ردِّ ملال لا دوا صلِّ علیٰ محمدٍ
وہ درِ مرگ وا ہوا مالکِ ملک المدد — سہل مرا ہو مرحلہ صلِّ علیٰ محمدٍ

دل کا ہراس مٹ سکا راغبِ کم عمل مگر
اُس کا کرم اگر ہوا صلِّ علیٰ محمدٍ

مظفؔر ضیاؔ

نعتؐ

○

آپؐ کے جیسا نہ کوئی آپؐ سے بہتر لگے
کس کی جراٴت ہے کہ کوئی آپؐ کا ہمسر لگے

آپؐ ہی سچے ہیں آقاؐ آپؐ کی بعثت کے بعد
کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص پیغمبر لگے

آپؐ کے نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے نکلے جو ہم
راستے کے خار ہم کو پھول سے بہتر لگے

درگزر کرنے کا یہ کتنا حسیں انداز تھا
دیں دعائیں آپؐ نے گو آپؐ کو پتھر لگے

روضۂ اقدس کی جالی پر نظر جب بھی پڑی
ہم کو یکجا دونوں عالم کے حسیں منظر لگے

یوں تو دیکھے چاند سورج رات دن روشن ضیاؔ
ذرّہ ہائے خاکِ طیبہ سے مگر کم تر لگے

○

اثرؔ لودھیانوی

نعت ؐ

جب تک کہ نورِ پاشِ رخِ مصطفےٰؐ نہ تھا
مشرق کے مطلعِ زار میں سورج اُگا نہ تھا

حسنِ صفات اپنے ہی مرکز کے تھا قریں
اتنا قریں کہ فاصلہ قوسین کا نہ تھا

یہ آپؐ ہی کی بارگہ لطف تھی جہاں
محرومِ التفات کوئی بے نوا نہ تھا

جب تک نہ انکی چشمِ مسیحا صفت اٹھی
انسانیت کے درد کا درماں ہوا نہ تھا

وہ رہبری کے وصف کے حامل نہ ہو سکے
جن راستوں پہ آپ کا احسانِ پا نہ تھا

جس کی امنگ شوق کا محور بنی رہی
وہ در قریب پایا تو اپنا پتا نہ تھا

نعتِ رسولؐ بن گئی حیلہ نجات کا
ورنہ اثرؔ اثر تھا کوئی پارسا نہ تھا

راز کاشمیری

نعتؐ

تو روشنیِ عین ہے اے سرورِ کونین
تو دل کے لیے چین ہے اے سرورِ کونینؐ

تو حُسن کا معیار ہے، تو خیر کا گلزار
تو زینتِ کونین ہے اے سرورِ کونینؐ

در تیرا ہی حدِّ نظرِ عالمیاں ہے
تو محورِ قطبین ہے اے سرورِ کونینؐ

قدموں میں ترے رہ کے سرِ عرش گئی ہے
یہ رتبۂ نعلین ہے اے سرورِ کونینؐ

چمکے ترے الطاف کا مہتابِ ضیا بار
غربت کی کٹھن رین ہی اے سرورِ کونینؐ

اک راز ہی کیا سارے زمانے کی نظر میں
تو دولتِ دارین ہے اے سرورِ کونینؐ

حفیظ صدیقی

نعتؐ

میں کہ ہر کمال سے ہوں تہی میں کہ ہر طرح سے ہوں بے ہنر
مگر اک نگاہ تری ملے تو مرا ستارہ ہو اوج پر

ترا نام وردِ زبان ہے، ترا ذکر ہے مری بندگی
ذرا اک نظر مری سمت بھی مری شامِ غم کی بھی ہو سحر

مری آنکھ کچھ نہیں دیکھتی مرے دل کو کچھ نہیں سوجھتا
تو ہی میری آنکھ کا شمس ہے تو ہی میرے قلب کا ہے قمر

میں کہ یاس خوردہ ہوں ہر طرح میں کہ بیدلی کا شکار ہوں
ہو ترا کرم تو مرے لیے کھلیں عرش و فرش کے سارے در

شب و روز اک یہی آرزو کہ ہر آن تیری ہی دید ہو
کبھی آنکھ میں مثلِ خواب آ، کبھی دل میں مثلِ صبا اتر

تجھے ربِّ پاک کا واسطہ مجھے اتنا حوصلہ کر عطا
نہ گلہ کسی کا قلب میں نہ کسی کا شکوہ زبان پر

طفیل دارا

نعت

○

آپ کی اک اک بات ہے رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
آپ سراپا نطق ہدایت صلی اللہ علیہ وسلّم

دریاؤں میں ایک سفینہ صحراؤں میں میٹھا پانی
راتوں میں مہتاب کی صورت صلی اللہ علیہ وسلّم

دونوں ہاتھوں سے دنیا میں اللہ کو دن رات لٹایا
کوچہ کوچہ بن گیا جنت صلی اللہ علیہ وسلّم

جس ایمان کے شعلے نے ہر ظلمت کو چمکایا تھا
آج وہ ہے بے نور عقیدت صلی اللہ علیہ وسلّم

گھر، مسجد، بازار، مسافت ظاہر باطن عدل شجاعت
سب مل کر ہیں ایک رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم

قطرہ دریا سے ہے لیکن اس میں کشتی کب چلتی ہے
ہستی کی اک سمت عبادت صلی اللہ علیہ وسلّم

بت خانے کی صورت اسمیں اب سجدے ہی ہوتے ہیں
مسجد تھی، چوپال، عدالت صلی اللہ علیہ وسلّم

دارا! غیر فسانوں کو بھی ایک حقیقت ہی کہتے ہیں
تیرا افسانہ بنی حقیقت صلی اللہ علیہ وسلّم

حضرت خواجہ محمد زمان (وفات ۱۱۸۹ھ)

ترجمہ:- ڈاکٹر نجم الاسلام

ابیاتِ سندھی

میانِ صورت و معنی نہیں جدائی کچھ
کہیں ہے عرض تو جوہر ہے اسکا نام کہیں
جُدا جُدا نہ تو انکی فنا (نخت) اور نہ وجود
حقیقت ایک ہے اور نام اسکے لامحدود

جن کو پل بھر لگی ہو بادِ وصال
وہ جواہر انھوں نے پائے ہیں
ان کی خوش بختیوں کا کیا کہنا
جن کی خاطر بنی ہے یہ دنیا

زمانے کی راحت ہے مثلِ سراب
اسی سے ملی راحتِ جاوداں
عدم ہی سے رکھا فقیروں نے کام
اسی سے کھلا بابِ عشق مدام

آدمی کا قیاس و وہم و گماں
حق کی نور ہی ہدایتوں کے طفیل
میرے حق میں یہی دعا کرنا
بار اُس بارگہ میں کیا پائے
چھٹ گئے رنج و غم کے سب سائے
کہ پلٹ کر نہ پھر فراق آئے

(سندھی سے)

جوشؔ ملیح آبادی

شادیانہ

خوشا کہ آج ہے صید آسماں، زمیں صیاد
قلندران ثوابت نگہ، مبارک باد
اس آرزو میں کہ رقصاں ہوں فرشِ گیتی پر
مچل رہی ہیں فضا پر بناتِ گردوں زاد
کھلا ہے غنچۂ ہستی پہ سازِ موجِ نسیم
چلی ہے کشتیِ مستی بہ نازِ بادِ مراد
چٹک رہا ہے کچھ اس طرح غنچۂ رفتار
کہ فاصلوں کا تبختر ہے مائلِ فریاد
رگِ حقائقِ کونین کو خبر کر دو
کہ معرضِ حرکت میں ہے نشترِ فصّاد
سنک رہی ہے نسیمِ شعورِ نسلِ جواں
بھڑک رہا ہے چراغِ عقائدِ اجداد
ہزار شکر کہ اب ہیں صحائفِ اقوال
طلسم ہوشربا و فسانۂ آزاد
خوشا کہ اب ہے وہاں قدرِ حکمت و منطق

جہاں مذاقِ تجسس کا نام تھا الحاد
نثار تجھ پہ دو عالم نگارِ جودتِ نو
تنت بناز طبیباں، نیاز مندِ مباد
دل جلال میں جاگا ہے یوں مذاقِ جمال
کہ راہِ شیشہ گری پر ہے صنعتِ حدّاد
دیارِ حق کے تجسّس میں ہے دلِ باطل
نسیم امن کے جادے پہ ہے سمومِ فساد
ہوائے صدق سے زیر و زبر ہے رایتِ کذب
درِ حسینؑ پہ خم ہے جبینِ ابنِ زیاد
ادائے مسکنتِ فقر سے ہے غرقِ عرق
غرورِ قیصر و نازکیان و عجب قباد
رواں ہے سوئے خمستاں یبوستِ فقہا
رواں ہے جانبِ دیبا صلابتِ فولاد
چھڑے ہوئے ہیں ترانے وفاق و وحدت کے
میانِ عالمِ ارواح و عالمِ اجساد
دیارِ حسرت و معمورۂ اجل کو سلام
کہ اب نگاہ میں ہے چشمۂ خضر کا سواد
حیات اب نہ جھکے گی بہ پائے غمزۂ مرگ
چراغ اب نہ بجھے گا بہ موجِ عشوۂ باد
پکار دو کہ چلی ہے نقاب اٹھائے ہوئے
دیارِ حزن کی جانب عروسِ خاطرِ شاد
کھلے ہوئے ہیں فضا پہ قضا کے بند و قبا
قدم بڑھائے ہوئے صاحبانِ بست و کشاد

نشیب وادیٔ رنگین ہے مسندِ تبلیغ
فرازِ کوہِ گل افشاں ہے منبرِ ارشاد

صدائے نے میں ہیں اورادِ اولیائے کرام
فضائے گل میں ہیں انفاسِ انبیائے جواد

متاعِ کفر ملے یا سعادتِ ایماں
جلاؤ مشعلِ تحقیق ہرچہ بادا باد

خوشا کہ جوشؔ وہ دورِ عظیم دور نہیں
جب ایک موڑ پہ مل جائیں گے الہ و عباد

شاد عارفی

دیکھنے والا ہو تو

○

شیخ کے دل میں نظر آئینگے اصنام حسیں
زاہدوں کے ذہن میں جام شرابِ انگبیں
عالمانِ بے عمل کے سبز عماموں میں پیچ
رہنمایانِ وطن کی جیب میں چندوں کی کھینچ

صوفیوں کے جبّہ و دستار میں طاعت کی پول
خانقاہوں میں شبابِ دخترِ رز کا مول تول
رنگ و بوئے گلستاں کی تاک میں بادِ خزاں
اور گلچیں سبزۂ بیگانہ خو پہ مہرباں

حسن خلوت کی نگاہوں میں نظر بازانِ عام
عشقِ غم پیشہ کے لب پر عشرتِ سوزِ تمام
طینتِ سرمایہ داری مال کی تائید میں
مفلسوں کی زندگانی موت کی امید میں

مجلسِ شعر و سخن میں ڈوم کی دلداریاں
شاعرانِ قوم کی قسمت میں ناہمواریاں
آسماں کی گردشوں میں عزتِ اربابِ فن
قلبِ شادِ عارفی میں خواہشِ ترکِ وطن

ضیا جالندھری

ہابیل

اولیں ذائقۂ خون سے تھی لب تلخ و خاک

جبیں آہ میں ٹوٹی ہوئی شاخ کے مانند گرا

کن شراروں کی دہک دیدۂ قابیل میں تھی

وہ حسد تھا کہ ہوس، طیش کہ نفرت کیا تھا

اور پھر میرے بدن، میرے لہو میں اترا

اولیں بے بسئ کربِ فنا کا ادراک

بجھ گئی شمعِ نظر مٹ گئے آوازکے نقش

بوئے گل، جوئے صبا، نجم سحر کچھ نہ رہا

لرزشِ موجِ تنفّس کے کرشمے تھے تمام

روئے جاناں، غم جاں، دیدۂ تر کچھ نہ رہا

نسل در نسل یونہی میرے لہو کا پیاسا

نارِ نمرود بھی وہ نخوتِ فرعون بھی وہ

جامِ زہراب بھی وہ، تیشہ بھی وہ، دار بھی وہ

خنجرِ شمر بھی وہ وحشتِ چنگیز بھی وہ

ایشیا میں کبھی افریقہ میں خوں ریز بھی وہ

آج ویت نام کے ہر گوشے پہ بمبار بھی وہ

اور قابیل سے ارشاد کیا تھا تو نے

خونِ ہابیل کی ان ذروں سے بو آتی ہے۔

پھیل کر اب وہی بو سارے جہاں پہ ہے محیط

کیا یہ بو تا بہ ابد میرا مقدر ہوگی

کیا ترے اذن سے قابیل کی خو قائم ہے

کیا یہ خو تا بہ ابد میرا مقدر ہوگی

مصطفےٰ زیدی

بہتاں

کیا یہی ہونٹ ہیں، جو مرے واسطے
انگبیں تھے، مئے ناب تھے، آگ تھے
کیا یہی جسم ہے، جس کے سب زاویے
میرے آغوش میں، راگ ہی راگ تھے

ہاں بڑی چیز ہے راہ و رسمِ جہاں
دوست، خاوند، بہنیں، قفس، پاسباں
ننگ و ناموس — سینے کی چنگاریاں
وہ ترا امتحاں — یہ مرا امتحاں

رکھ لیا اپنے رشتوں کا تو نے بھرم
آبگینہ تھا دل، اس کو میں سہہ گیا
تو مجھے بھائی، کہتی رہی اور میں
کیا بتاؤں، تجھے دیکھتا رہ گیا

خلیل الرحمٰن اعظمی

"خمسہ"

○

ہر ہر سانس نئی خوشبو کی اک آہٹ سی پاتا ہے
اک اک لمحہ اپنے ہاتھ سے جیسے نکلا جاتا ہے

مچل مچل کر سو گئے آنسو پلکوں کے گہوارے میں
کچھ آوازیں جاگ رہی ہیں اب بھی دل کے اندھیارے میں

کچھ زنجیریں ٹوٹ کے شاید اور بھی بھاری ہو جاتی ہیں
کچھ تصویریں روٹھ کے دیکھو اور بھی پیاری ہو جاتی ہیں

پت جھڑ کی اک اک گھڑی تو جیسے تیسے کر کے گزاری
پھول کھلے تو دل کے لہو میں ڈوب گئی ساری پھلواری

تنہائی کا یہ لمحہ بھی کیا کیا نقش بناتا ہے
ان دیکھا سا اک چہرہ دیوار پہ ابھرا آتا ہے

حمایت علی شاعر

سمندر اور انسان

قلزمِ بے کراں ترا پھیلاؤ
زندگی کے شعور کا غماز
تیری موجوں کا پُرسکون بہاؤ
زندگی کے سرور کا غماز
تیرے طوفان کا اُتار چڑھاؤ
زندگی کے غرور کا غماز

سوچتا ہوں کہ تیری فطرت سے
میری فطرت ہے کتنی ہم آہنگ
تیری دنیا ہے کتنی بے پایاں
میری دنیا ہے کتنی رنگا رنگ
تو ہے کتنا وسیع اور محدود
میں ہوں کتنا وسیع کتنا تنگ
تیرے اطراف بھی حصارِ سنگ
میرے اطراف بھی حصارِ سنگ

انجم اعظمی

زرد مہتاب

گرد کی اوٹ میں سورج ڈوبا
زرد مہتاب، مرا خواب
افق سے اُبھرا
رہ گیا دور کہیں
دائرہ حبسِ مسلسل کا، جو دن ٹھہرا تھا
آئی ہے موجِ ہوا رات کی شبنم لے کر
دن کے زخموں کے لیے تحفۂ مرہم لے کر
دل مرا
سوچ کی دہلیز پہ چپ بیٹھا ہے
ایک یلغار
خموشی کی ہے ہر پل، ہر آن
فاصلے صوت و صدا کے کہاں ٹھہرے ہوں گے
کتنے غم
خواب کی صورت ہی سہی
اب کسی زلفِ گرہ گیر سے الجھے ہوں گے
جو در وا زے کھلے ہیں درِ جاناں پہ تو پہرے ہونگے

قتیل شفائی

نیا سفر

جب چاند کی وادی میں اتر جائیں گے ہم لوگ
کرنوں کے تجسس میں بکھر جائیں گے ہم لوگ

گھومیں گے اٹھائے ہوئے ہم اپنا ہی لاشہ
زندہ نظر آتے ہوئے مر جائیں گے ہم لوگ

اس حد کو پہنچ جائے گا تنہائی کا احساس
آپ اپنی ہی پرچھائیں سے ڈر جائیں گے ہم لوگ

دیتی ہی رہے گی یہ زمیں ہم کو صدائیں!
صدیوں کی رفاقت سے مکر جائیں گے ہم لوگ

اتنا تو بتا دو ہمیں بے رحم خلاؤ
منزل پہ نہ پہنچے تو کدھر جائیں گے ہم لوگ

سرشار صدیقی

مسافر

اس سے پہلے بھی
کئی بار، کئی دن کے لیے
مجھ سے بچھڑا ہے کوئی
اور ہر بار دلِ مضطر کو
جب بھی بہلایا ہے، بہلا ہے
قرار آیا ہے
مگر اس طرح سے لگتا ہے مجھے
اب کے بار
لے گیا ساتھ ہی اپنے شاید
میرا سامانِ قرار

ارتضیٰ عزمی

دوہے

○

رادھا ہو یا کل تو اس پر آئے ہے الزام
کوئی نہ پوچھے کاہے بجائے ایسی مُرلیا شام

وقت کا پنچھی اڑے ہے کب سے اپنے پر پھیلائے
پلک نہ جھپکے اس چنتا میں جانے کیا ہو جائے

ساتھ میں گوری کے آنچل میں من ایسے لہرائے
جیسے تیز ہوا میں یارو دیے کی لَو تھرائے

پیا ملن کو چلی تھی گوری سب سے نظر بچائے
رستہ کاٹ گئی اک بلی اب کیا ہو گا ہائے

یوں للچائے سب کے من کو گوری تیرا روپ
جیسے جاڑوں میں من بھائے سب کو نرمل دھوپ

تیرے دھیان کا دامن دل سے آج گیا یوں چھوٹ
جیسے کسی بالک سے جائے اس کا کھلونا ٹوٹ

جس کے من میں رچا بسا ہو ماتر بھوم کا پیار
اس کے ہاتھوں دونوں برابر قلم ہو یا تلوار

بیاکُل من میں جیون آشاؤں ہے آج نڈھال
جیسے کوئی البیلی آئے پہلے پہل سسرال

دوہا ہو یا شعر غزل کا سب کی ایک ہی ریت
دل سے اٹھے تو سب کے من میں اترے ہے سنگیت

اردو میں دوہے کہہ کر ہم ہندی آمیز
سلگ رہی ہے آگ جو من میں کریں ہیں اُسکو تیز

حضور احمد حلیم

نذرِ غالب

غالب ہے اقلیم سخن وجہ شرف تھا
کم یہ بھی نہیں فخر کہ وہ نازِ سلف تھا
قبلے کو وہ کیوں سجدہ گہِ شوق سمجھتا
ادراک کی سرحد سے پرے اُس کا ہدف تھا
دانا تھا کہ تھا ارضِ مدینہ کا پرستار
بینا تھا کہ وہ سُرمہ کشِ خاکِ نجف تھا
پیتا تھا خمستانِ فنا سے مئے الاّ
وہ جامۂ احرام میں یوں جام بکف تھا
رندانِ سبو کش سے بھی تھا اسکو سروکار
خوبانِ پری وش سے بھی اک گونہ شغف تھا
تھی فکر اسے گوہر معنی کے بقا کی
وہ بحرِ غم زیست میں مانند صدف تھا
ہم نے تو سر معرکۂ شعر یہ دیکھا
تھا جو بھی سخن فہم وہ غالب کی طرف تھا

مقصود زاہدی

رُباعیات

○

منہ حسرت و اندوہ کے سِل جائیں گے
سب غنچے تمناؤں کے کِھل جائیں گے
لب اور دل و جاں کو بہم ہونے دو
کونین کے سب رموز مِل جائیں گے

تقدیر کی باتوں سے رہائی تو ملے
اس جسم کی گھاتوں سے رہائی تو ملے
یہ دور کے اسرار بھی سب فاش کردوں
ان پاس کی باتوں سے رہائی تو ملے

جینے کا عجب ڈھنگ نکالا ہم نے
اک تازہ روش پہ خود کو ڈالا ہم نے
ہر روز تراشا کیے ہم ماہ و نجوم
ہر شب کو اک آفتاب ڈھالا ہم نے

—— .:. ——

ثروت حسین

دورویہ خوشبوؤں میں.....

سندھڑی
جیئیں تیرے بیٹے
دورویہ خوشبوؤں میں
دور تک
بہے جائیں
پکھی تیری چونچ میں
مکئی کا تارا رہے
کارونجھر سے
اونٹوں والے آئے ہیں
جھونپڑیاں
مہک اٹھیں
جالوڑ کی مانی سے
گھسوڑ ابھریں
پانی سے

سندھڑی
تیری بیٹیاں
رلیاں بناتی رہیں
گاتی رہیں
رنگین ٹکڑوں کو
وحدت میں لاتی رہیں

اقبال حیدر

درد جوان ہے

دھڑکن دھڑکن ماضی حال سے مستقبل کو رواں دواں ہے
ہر گزرا پل دھواں دھواں ہے
دریا ندی جھیل سمندر دم سادھے ہیں
نفس نفس بے آب ہے لیکن
دل میں تیرا درد جواں ہے

گونگی چٹانوں پر موسم کی بے چہرہ تصویریں ہیں
سرد ہوائیں آبدار شمشیریں ہیں
گیلی ریت پہ بنتی مٹتی دیکھی تحریریں ہیں
یہ تیرے نقش کفِ پا کی شوخی ہے
حد نظر تک قدم جما کر ڈوب گئی
اس سے پہلے سرخ شفق پہ لمحے رات بچھائیں
مد و جزر کی جھنکاروں میں آس گھروندے ڈھ جائیں
بینائی کے تیور بدلیں
کاش یہ مٹی تحریریں تجھ تک لے جائیں

پریشان خٹک
ترجمہ:۔ محسن احسان

میرے پاس آ جاؤ

○

تم آتی ہو کہ نہیں آتی ہو
میرے دل کی دنیا میں اس قدر اندھیرے ہیں
کہ اس میں تمھارے بغیر اجالے نہیں ہو سکتے
میں نے تمھیں دل سے بھلانے کی ہزار کوشش کی
لیکن یہ اس بچّے کی طرح بیقرار ہے جس کو
کبھی سکون میسر نہ ہو
میری آنکھوں نے ہزاروں آنکھیں دیکھی ہیں
لیکن ان آنکھوں نے میری آنکھوں کو جلایا نہیں
لیکن خدا جانے تمہاری آنکھوں میں کیا جادو ہے
میں نے خواب میں بھی ایسی آنکھیں نہیں دیکھیں
میں پلنگ پر پڑا ہوں، دیوانہ ہو گیا ہوں اور اچھل رہا ہوں

میرے دل میں یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ میں تمھیں یاد آرہا ہوں
اے میری یادوں کی شمع
میں تمھاری یادوں کی آگ میں سلگ رہا ہوں
اللہ تمھیں بھی دیوانہ کر دے
کہ میں تمھارے لیے دیوانہ ہو چکا ہوں
میرے چھلنی سینے میں تو اب میرا دکھ بھی نہیں سما سکتا
تم میرے حرم دل پر کچھ اس طرح فرمانروائی کر رہی ہو
کہ اس میں اب اور کسی بت کی گنجائش نہیں
یا تو تم میرے خواب مجھے لوٹا دو
کہ میں پر سکون زندگی بسر کر سکوں
یا اے میرے خوابوں کی ملکہ
تم خدا کے لیے میرے پاس آجاؤ
تمھارے بغیر میرے لیے ایک پل صدیوں پہ محیط ہے
اے میرے شعر کی ملکہ
اور مت انتظار کے دوزخ میں جلاؤ
جلد میرے پاس آجاؤ

(پشتو سے) ـــــــ ٭ ـــــــ

حسن اکبر کمال

موسمِ بہار میں یاد

○

پھول پہنے سارے پیڑوں نے
نئے پتوں سے اپنے تن سجائے
اور مٹی میں بھی جیسے تازگی کی لہر دوڑی

راستے میں جو ملا
خوشبو نے بڑھ کر کی ادا رسمِ ہم آغوشی
ہوائے تازہ نے کیسی لہو میں آگ بھر دی
میرے اندر بھی کوئی گہری تھکن اور نیند سے جاگا
کہا دل نے کہ میں بھی شوخ، کھلتے رنگ کا ملبوس پہنوں

بہت دن سے جسے پہنا نہیں تھا
میں نے جب وہ پیرہن پہنا
تو اس سے
یک بیک خوشبوِ خزاں کی ایسے پھوٹی
میری آنکھیں، میرا چہرہ بجھ گیا
اور سارے منظر زرد، پھیکے پڑ گئے

لطیف ساحل

افسوس حاصل کا

خاردار شاخوں کے
زخم میرے ہاتھوں پر

تم بھی دیکھ سکتے ہو
میں نے بھی درختوں سے

جنگلی پرندوں کے
گھونسلے اتارے ہیں

نئے موسم کی ایک نظم

آنے والے موسم میں
پھول کاشت کرنے کو
تم نے بوئی ہیں قلمیں
اور میں نے موسم میں
خوں کا رنگ بھرنے کو
انگلیاں تراشی ہیں
انگلیوں کو بوؤں گا!
اور تری جدائی پر!
میں کبھی نہ روؤں گا
جب بہار آجائے
تم سجانا پھولوں سے
اپنے گھر کے آنگن کو
میری فکر مت کرنا
موسمی ہواؤں سے
اب میں خوب واقف ہوں
تم سے دور رہ کر بھی
زخم کاشت کر لوں گا

سیّد انوار حیدر

سزائے موت

یہ ایک اجلا صاف کاغذ
جس پہ میں یہ نظم لکھتا ہوں
یہ کہتا ہے کہ
میں پچھلے جنم میں بھی
اسی طرح کا ایک کاغذ رہا تھا
جس پہ
ایک منصف نے
ایک انصاف کے طالب کے حق میں
صرف ایک جملہ لکھا تھا
اور وہ یہ ہے
"سزائے موت دی جائے"

حسن عباس رضا

بچھڑی ہوئی رفاقتوں کے نام

○

مست ہواؤ
سجل فضاؤ
دوشِ صبا پر اڑتی رنگ برنگی چڑیو
کہیں مرا محبوب ملے تو
ایک پیام اسے پہنچانا
اس سے کہنا
کڑی مسافت پر جانے سے پہلے تو نے

جن دروازوں ،
جن دہلیزوں پر بوسوں کی دستک دی تھی
اب وہ تیرے قدموں کی آہٹ سننے کو
ترس چکے ہیں

کاسنی پھولوں والی بیلیں
تیرے کمرے کی کھڑکی کو چھونے لگی ہیں
سرخ امرودوں کے پیڑوں پر
کتنے ساون برس چکے ہیں

اس سے کہنا

اب بھی اکثر
اجڑے صحن کی دیواروں پر
تیری یاد کا سبز کبوتر
پہروں غٹر غوں کی میٹھی سرگم میں

تیرے نام کی مالائیں جپتا رہتا ہے
اس کو جوگ کھلانے
اس کے پاؤں میں جھانجھن ڈالنے والے
خیر ہو تیری
اس سے کہنا
رنجش بہیم کی شدت سے
برسوں کی بے لوث رفاقت کے آئینے
کرچی کرچی ہو جاتے ہیں
پور پور میں چبھ جاتے ہیں
خون کے آنسو رلواتے ہیں
اس سے کہنا
اس سے اور بہت کچھ کہنا
جو کچھ جی میں آئے کہنا
لیکن اس سے یہ مت کہنا
میں بھی دھیان کی روشن صبحوں
کالی شاموں
اس بے مہر کی رہ تکتا ہوں
یہ مت کہنا
یہ مت کہنا

محمد اکرم ناصر

شالامار کے آم کٹنے پر ایک نظم

کٹے پھٹے ہوئے اعضا ادھر ادھر بکھرے
سنا رہے تھے مجھے داستاں زمانوں کی
وہ شہنشاہوں کے جاہ و جلال کے قصے
کہیں یہ ہجر کی باتیں وصال کے قصے
پھٹی کتاب کے اوراق کی طرح پتے
رقم تھیں جن پہ گزشتہ بہار کی باتیں
پڑھی تھیں میں نے بھی لیکن سنا نہیں سکتا
میں اپنے تیرتے آنسو گرا نہیں سکتا
ہجوم دوستاں اس بات سے بھی مانع ہے
یہ پیڑ پیڑ نہیں حرف ہیں کتابوں کے
کہ جن سے قوم کی تاریخ لکھی جاتی ہے
حروف مٹ گئے ماضی سے رابطہ ٹوٹا!
رگوں سے رابطہ ٹوٹا تو جسم ناکارہ
لہو کا رقص تو لازم رہا بدن کے لیے
فریضہ سونپ کر آرائشِ چمن کا جنہیں
تو کتنی صدیوں سے خود محوِ استراحت ہے
تجھے خبر ہے مرے شہ جہاں کہ اب کے برس
وہ آم کٹ گئے آرائشِ چمن کے لیے

نصیر احمد ناصر

نصیر احمد ناصر

دو نظمیں

ایک لامعنی نظم

اور جب خاموشی کے
جنگل میں۔ آوازیں کتوں
کی طرح پیچھا کرتی ہیں
خارش زدہ مریل تنہائی
شاموں کے اتھلے تالابوں میں
خوابوں کے "بیوپے" جنتی ہے
تب سورج کی شاخوں پر
بیٹھے کوّے
اڑ جاتے ہیں!!

لفظوں کی انا

لفظ پرندے ہیں
ہونٹوں کی شاخوں پر آبیٹھیں تو
ایک ذرا سی جنبش سے
اڑ جاتے ہیں
پھر لاکھ بلاؤ
تنہائی کے پنجرے میں
دانہ دانہ آنکھیں چن دو
پتّا پتّا شاخیں بُن دو
ان کا واپس آنا مشکل ہے
ان کا بھی تو آخر دل ہے

صابر بن ذوقی

روشنی کا تجربہ

○

تیرگی کے موڑ پر
چند سکوں کے لیے
جب ملازم میں ہوا
کارگاہِ خبث میں
محسوس مجھکو یوں ہوا
دفتری لوگوں کے منہ میں
بھیڑیوں کے دانت ہیں

○

صابر بن ذوقی

بلا عنوان

○

میں نے اک لڑکی کو دیکھا
لمحہ بھر کو سوچ میں ڈوبا
اس پر کوئی گیت لکھوں میں
لیکن میرے گیت کی لڑکی
میری اپنی سوچ سے باہر
اپنا سب کچھ بیچ چکی تھی
صرف اک "مافیا" کی خاطر

○

منیر نیازی

ترجمہ رفیق نقش

بستی سورج آگے

کوٹھے پر ایک خاندان

تینوں ہیں سب سے چھوٹے ہیں
یا تینوں ہیں سچے
تین فریق ہیں سورج آگے،
مرد، عورت اور بچے
اک دوجے سے ڈرے ڈرے
اکتائے اک دوجے سے
اندر تینوں بکھرے ہوئے ہیں باہر
لگیں اکٹھے — خاکی رنگ
کی عورت اور کچے ہرے رنگ کے
بچے — ایک طرف اک مرد ہے
کوئی فکر نجانے جس کے۔ جسکو سوچ
سمجھ نہ آئے ناں عورت ناں بچے

(پنجابی سے)

نظم

اشفاق احمد

ترجمہ:۔ رفیق نقش

چھاؤنی والے پل سے
پہلے گزرا لڑکا
پھر گزری لڑکی
پھر گزری گوری کار
نیچے گزری تیز گام
اتنا پیارا دن تھا
میں نے چھٹی لے لی

(پنجابی سے)

محمد زہری
رفیق نقش

نظمیں

(۱)

پھول نے
سخت برف کو،
ہرگز نہیں دیکھا ہے
لیکن حکایت اسکی سنی ہے پرانی
شاخ سے
مجھ سے سنو کہ بُرے دور کے زخم نے
— سخت برف کی طرح —
میرے دل کے ساتھ کیا کیا

(۲)

پیاسے کو آب، اور
تھکے ہوئے مرد کو خواب
کرتا ہے سیراب
تشنہ جان و خستہ دل،
آیا
تا قیامت!
پیاسا رہے گا؟
تھکا ہوا جائے گا؟
(فارسی سے)

نظم :۔ قائم نقوی
ترجمہ :۔ افتخار حسین منتظر

"گاڑی"

ملن جدائی کے اسٹیشن چھوڑتی
چھک چھک گزرتی جائے
کسی کو کچھ معلوم نہیں
کہاں جانا ہے
کہاں جا کے اب دم لینا ہے
ہر کوئی اس گاڑی میں چپ چاپ
اک دوسرے کو حال نہ بتائے
اک دوسرے کا حال نہ پوچھے
اپنے آپ کو قسمت کی ڈوری پر چھوڑ کر بیٹھا ہے
لیکن یہ گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی ہے
کسی کو اپنا پتا نہ دے
چلاتی جائے بھاگتی جائے
ملن جدائی والی گاڑی

مظفر ضیاء

سماعت کا زہر

امریکی نظم LINES مصنفہ HEATHER MC HUGH کا اردو ترجمہ

○

کچھ لوگ انتظار میں بیٹھے ہیں اور کچھ
ایسے بھی ہیں جن کو نہیں تاب انتظار
(یہ اس کے باوجود ہوا ہے کہ دوستو)
بازار زندگی میں ہیں اجناس بے شمار
ہاں وہ غروب مہر کے ہنگام کا سماں
یا بڑھ گئی ہیں شہر خموشاں کی وسعتیں
زیر زمیں وہ ریل کی لائن کشاں کشاں
کتنے ہی مرحلوں پہ رکے گی یہاں وہاں
لیکن اسے بھی ختم تو ہونا ہے اک جگہ
گویا کسی خیال کی پرواز ہو بلند
(جس طرح پھر ردائے افکار ٹھہر جائے)

چڑیاں بھی تھک گئی ہیں کہ دن بھر ہوا میں بھٹکیں
سو جائیں گی وہ فون کے تاروں پہ رات کو
یہ تار راز ہائے محبت کے ہیں امیں
اور اب یہ حادثہ کہ وفا کیش سادہ لوح
ششدر ہے اور اپنی سماعت کا نوحہ گر
محبوب سے سنا ہے اسی فون پہ ابھی
جس نے کہا "سپردِ خدا" الوداع کہا
(یعنی سفر وفا کا ہوا ختم اے عزیز!)
لیکن سڑک کے پار دریچے کے اُسطرف
اک سن رسیدہ شخص جو محوِ خرام ہے
محروم ہے سماعت فطری سے وہ غریب
محتاج ہے جو آلۂ برقی کا ہر گھڑی
یہ بے نیازِ موسم و اشجار و خار و خس
اس دھن میں ہے مگن کہ وہ زندہ ہے اور بس!

ستیہ پال آنند

اکیلا

کنکر لڑھکنیاں کھاتا ہوا نالی سے ٹکرایا اور کنارے پر ہی رک گیا۔

وہ اپنے خیالات میں مست نالی پھلانگ کر لگ بھگ پندرہ قدموں تک اسی رفتار سے چلتا گیا۔ پھر اس کی چال دھیمی ہو گئی پھر وہ بالکل ہی رک گیا اور دائیں بائیں اس انداز سے دیکھنے لگا جیسے اپنی کوئی بیش بہا چیز کہیں بھول آیا ہو چند لمحوں کی اس لاشعوری اور ناکام تلاش کے بعد اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ پھر رک گیا۔ جیسے کوئی کتا اپنی ہڈی کہیں دفن کر کے جگہ بھول جائے۔ وہ گھوما۔ دو قدم پیچھے مڑا۔ پھر فیصلہ کن انداز سے چلتا چلتا نالی تک گیا۔ کنکر پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں چمک

اٹھیں۔ کھوئی ہوئی چیز اسے واپس مل گئی۔ اس نے چور نظریں دائیں بائیں راہگیروں کی طرف اٹھائیں اور پھر بجلی کی سی سرعت سے کنکر اٹھالیا۔ خفت سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملا اٹھیں۔

چند قدم چل کر اس نے مٹھی کھول دی۔ کنکر پھر سڑک پر گر پڑا۔ اس نے دائیں پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ کنکر اچھل کر چند گز آگے چلا گیا۔ اس کی آنکھیں پھر چمک اُٹھیں۔ وہ کنکر کو ٹھوکریں لگاتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اب وہ راہ گیروں کی نظروں سے بے نیاز جا رہا تھا۔

چوک پر پہنچتے ہی ایک آخری ٹھوکر سے اس نے کنکر کو آتی ہوئی بس کے نیچے پھینک دیا اس نے ایک لمبی سی سانس لی جیسے مدتوں کی نیند سے بیدار ہو رہا ہو۔ جلدی جلدی آنکھیں جھپکتے ہوئے اس نے ایک بار اپنی پیشانی کو ہاتھوں سے دبایا۔ اسے کچھ راحت کا احساس ہوا۔

چوک کو پار کرنے کے بعد جس سڑک پر وہ مڑا اس پر ٹریفک کا شور کم تھا۔ اس کی رفتار دھیرے ہو گئی اس کی نظر دائیں طرف کی دکانوں پر پھیلتی ہوئی اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ پہلی دکان کا سائن بورڈ تھا "شام برادرز" اس نے زیرِ لب الٹا پڑھا۔ "ماش برادرز" پھر تھا "مشکل اینڈ کو" اس نے زیرِ لب تصحیح کی "لکش اینڈ برادرز" اور وہ بڑھتا گیا۔ یہ وقت گشی کے لیے اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

نئے چوک سے آگے وہ بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ربڑ کے غباروں والا ایک لڑکا اس کے سامنے سے گزرا۔ لال اور چتکبرے غبارے دیکھتے ہی اس کا جی مچل گیا اس نے آواز دیکر لڑکے کو ٹھہرایا۔ لڑکے نے اس کے صاف اور قیمتی کپڑے دیکھ کر اسے اکنّی والا بڑا غبارہ دینا چاہا۔ سر کو انکار کی صورت میں ہلاتے ہوئے اس نے پیسے پیسے والے ۲ غبارے اس کی چھڑی سے توڑ لیے اور پھر اسے اکنّی دیکر باقی پیسے واپس لیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ غباروں والا لڑکا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

دونوں غبارے تاگوں سے ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے وہ بس میں چڑھا۔ دروازے کی ساتھ والی سیٹ پر باپ کی گود میں بیٹھے ایک بچّے کی آنکھیں غباروں کو دیکھ کر چمک اٹھیں۔ اور اس نے معصومیت سے انھیں لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی نظریں بچّے کی نظروں سے ملیں بچّے کی آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ ٹھٹکا لیکن پھر اس نے زبان نکال کر بچّے کا منھ چڑا دیا۔ کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا لیکن کنڈیکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ اٹھی شاید اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا ایک بالکل خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس کے پیچھے آتی ہوئی ادھیڑ عمر فربہ خاتون اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں غبارے اپنی گود میں رکھ کر انھیں ہاتھوں سے دبا لیا۔ اور پھر اپنی ہم نشست کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ ادھیڑ خاتون ساڑی میں ملبوس تھی، اپنی فربہی کی وجہ سے وہ سیٹ

کا آدھے سے زیادہ حصہ روکے ہوئے تھی۔ اس لیے وہ دیوار اور اس کے درمیان پس رہا تھا۔ وہ اس کے کولہوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور ہاتھ سے گود میں رکھے ہوئے غباروں کو دبا رہا تھا۔

اگلے اسٹاپ پر وہ وہاں سے اٹھ کر خالی لیڈیز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک بار پھر اکیلا رہ گیا۔ اس نے غبارے گود سے اٹھا کر سینے سے لگا لیے۔ دھیرے سے اس نے کہا کہ "رائٹ روڈ" پیسے دیکر ٹکٹ لیتے ہوئے اس نے کنڈکٹر کی طرف دیکھا جو اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے زیر لب اسے ایک گالی دی۔ "باسٹرڈ" اور غبارے پھر گود میں رکھ لیے۔

بس اسٹاپ پر اتر کر وہ سیدھا پان والے کی دکان تک گیا۔ غباروں کے تاگے اب بھی اس کے بائیں ہاتھ کی انگلی کے گرد لپٹے ہوئے تھے۔ اس نے دکان کے قد آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی پتلون کی کریز درست کی، کوٹ کی شکنوں کو دور کیا۔ پان چباتے ہوئے وہ گلی میں مڑا۔

سامنے وہی صبح والی لڑکی کھڑی تھی!

لڑکی بیحد موٹی اور کالی تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ برس تھی مگر دیکھنے میں وہ تیس سے کم کی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ ابھی گزشتہ دنوں ہی اس کے خاوند نے اسے مارپیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا اور اب وہ اس گلی میں اپنے بھائی پیٹر کے ساتھ رہ رہی تھی۔ پیٹر جو اس کا دوست نہیں تھا۔

یہ لڑکی اکثر اسے اشارے کیا کرتی تھی۔

وہ جھنجھلا گیا۔ پاس سے گزرتے ہوئے اسے موٹی لڑکی کے پسینے کی بو آئی یہ بو اکثر اسے اپنے آپ سے آتی تھی۔ وہ اس بو سے نفرت کرتا تھا۔

گلی سے گزرتے ہوئے اس کے ذہن میں وہی دو جملے آئے جو بار بار اس لڑکی کو دیکھ کر اس کے ذہن میں چکر کاٹنے لگتے تھے۔

"یہ پیٹر کی بہن ہے"

"پیٹر میرا دوست نہیں ہے"!!

وہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ذرا لڑکھڑایا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے غبارے اپنے سینے سے لگا لیے اور پھر چپ چاپ گزر گیا.... کاش یہ لڑکی پتلی ہوتی۔ اس نے لاشعوری طور پر سوچا۔

اس کے کمرے کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اندر گھسنے سے پہلے اس نے نگاہ پھیر کر اپنے نام کی پلیٹ کی طرف دیکھا۔

"میک سوڈان لعل"

اس نے زیر لب اپنا نام پڑھا۔ مسکرایا۔ پان کی پیک گلی میں پھینک کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ دروازہ اس نے بند کر دیا۔ غبارے چارپائی پر رکھ کر اس نے کوٹ اتار دیا۔ پھر جوتے اتار دیے پھر قمیص اتار دی۔ پھر پتلون بھی اتار دی۔ اب اس کے جسم پر ایک انڈرویئر تھا۔ وہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے غبارے اپنے رخساروں کے دائیں بائیں رکھ لیے اور ہاتھوں سے اسے دبانے

لگا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پہ لٹکی اپنی ماں کی بڑی سی تصویر کی طرف تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

ایک اکیلا تن تنہا، نہ ماں نہ باپ، نہ بہن نہ بھائی۔ مقصودن لعل کرسچین کالونی میں اپنے مکان کے ایک الگ تھلگ گلی میں کھلنے والے کمرے میں رہا کرتا تھا۔ مکان کا باقی حصّہ کرایے پہ اٹھا ہوا تھا اور اس کے گزارے کی سبیل بھی مکان کے کرائے پر ہی منحصر تھی۔

مقصودن لعل!

میک سوڈان لعل!

بار بار اس کا جی چاہا کہ کوئی اسے یہ کہہ کر بلائے۔ کوئی اس سے بات کرے اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے چائے پیئے، یا اسے اپنے گھر میں ہی دعوت دے۔ لیکن اس کی ماں مر چکی تھی۔ اسے مرے ہوئے اب تو ایک برس سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ اور اس ایک برس کے دوران میں ایک دن کے لیے بھی ماں کی یاد نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اسے نہ بھولا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ماں کا مہربان چہرہ اور پتلا کمزور لیکن خوبصورت جسم اس کے سامنے رہتا وہ سوتے میں ممامما کہہ کر چونک اٹھتا۔ ماں صرف ماں.... اس کی بائیس سالہ زندگی کے خلا میں صرف ماں کا وجود ہی ایک ٹھوس مادّے کی طرح سمایا ہوا تھا۔ اور اب تو وہ مادّہ بھی تحلیل ہو کر نہ جانے کہاں کھو گیا تھا اور اب یہ خلا اور بھی زیادہ گہرا۔ وسیع اور بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا اور اس کے اکیلے پن کے احساس نے اب آہستہ آہستہ اسے دنیا سے نفرت کرنا سکھا دیا تھا۔

وہ تین ماہ کا تھا جب اس کا باپ گرجے کی آگ میں جھلس کر مر گیا تھا۔ اس دن سے ہی اس کی ماں گھر میں یوں گوشہ نشین ہو گئی تھی کہ آٹھ برس کی عمر تک وہ خود کو اور ماں کو ہی دنیا کے دو اور صرف دو انسان سمجھتا رہا تھا یہ درست تھا کہ اس کی ماں ہفتہ میں ایک بار بازار بھی جاتی تھی ان کے گھر میں دودھ والا دھوبی اور کئی دوسرے لوگ بھی وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے لیکن وہ ہمیشہ لوگوں سے دور رہتا۔ اپنے خاوند کی موت کے بعد اس کی ماں اسے دنیا کے کسی بھی ذی روح کے سامنے لیجانے سے ڈرتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ کال بیل بجتے ہی اسے کمرے میں بند ہو جانا پڑتا اور اسوقت تک وہیں رہنا پڑتا جب تک کہ نووارد اپنا کام مکمل کر کے لوٹ نہ جائے۔

اس کی ماں بڑی پیار بھری ماں تھی۔ صاف صاف، نرم نرم دبلی پتلی سی اسے اس کی گود میں بیٹھنے سے ایک خاص قسم کی راحت کا احساس ہوتا تھا۔ دس برس کی عمر تک وہ کبھی اکیلا نہیں سوتا تھا اور اس کے بعد بھی جب کبھی ماں اسے اکیلا سلا دیتی تو وہ آدھی آدھی رات گئے اٹھ کر اس کے بستر میں گھس جاتا۔ ماں اس کی زندگی کا لازمی جزو تھی۔

دس برس کی عمر میں اس نے پہلی بار ماں کے علاوہ ایک دوسرے انسان کی شکل دیکھی اور اس دن اس کے ننھے سے دماغ میں

پہلی بار یہ خیال جاگزیں ہوا کہ دنیا میں اس کی ماں اور اس کے علاوہ اور لوگ بھی بستے ہیں۔ یہ شخص ایک پادری تھا۔ جو کچھ دنوں سے ان کے گھر میں آنے جانے لگا تھا۔ پادری اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ اس لیے وہ بہت جلد اس سے گھل مل گیا۔ ایک بار اس کی ماں کی اجازت سے وہ اسے بازار بھی لے گیا بازار میں آدمیوں کی آمد و رفت سے وہ گھبرا گیا اور رونے لگا تب پادری اسے ایک پارک میں لے گیا تھا اور وہاں اپنے ہم عمر بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے چوڑی ہو گئی تھیں۔

اس کی زندگی میں انقلاب گیارہ برس کی عمر میں آیا جب اس پادری نے اس کی ماں سے شادی کر لی۔ اسے وہ دن اچھی طرح سے یاد تھا وہ سب چرچ گئے تھے شمعیں جلائی گئی تھیں کیک کاٹا گیا تھا۔ ان کے بند مکان کی بوجھل فضا میں مبارک گیتوں اور آہٹوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ اس کی ماں نے بڑے اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہنے تھے وہ بڑی اچھی لگ رہی تھی اس دن اس نے بھی پہلی بار سوٹ پہن کر ٹائی لگائی تھی اور رات گئے تک خوش خوش ناچتا رہا تھا۔ پادری کے ان کے گھر میں آجانے کے بعد کا جو ایک برس گزرا وہ اس کی زندگی کا بہترین برس تھا۔ پادری اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اس کا جی ڈیڈی کہنے کو نہ چاہتا اس کے دل کے کسی کونے سے پادری کے تئیں نفرت ابل ابل پڑتی۔

ایک بار اس نے انجانے میں ہی اپنے ڈیڈی کے سوٹ کو قینچی سے بالکل کاٹ دیا۔ بعد میں اسے اپنے کیے پر بہت پشیمانی ہوئی تھی لیکن کبھی نہ جانے کیا بات تھی کہ بعض اوقات وہ اس کے پاس بیٹھتے ہی رو دیتا یاد رہی اس کے لیے نئے نئے کپڑے اور مٹھائیاں لاتا۔ وہ خوش بھی ہوتا۔ اس کا دل نئے ڈیڈی کو پیار کرنے کیلیے بھی چاہتا مگر...... اور ایک بار خواب میں اس نے خود کو دو منزلہ چھت سے ڈیڈی کو دھکا دیتے ہوئے بھی دیکھا تو وہ کئی دنوں تک خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔

اب وہ اسکول بھی جانے لگا تھا کئی بار لڑکوں کے ساتھ کھیلوں میں بھی شریک ہوتا تھا۔ طبعاً وہ خاموشی پسند تھا۔ اس لیے وہ لڑکوں میں مقبول نہ ہو سکا اور پھر جب اس کا نیا باپ ہیضہ کا شکار ہو کر مر گیا اور اس کی ماں پھر بیوہ ہو گئی تو اسے بھی اسکول سے اٹھا لیا گیا۔ اس وقت سے لیکر ماں کی وفات تک وہ اس کے گھٹنوں تلے ساتھ رہا تھا۔ ایک دن کے لیے بھی وہ اس سے جدا نہیں ہوا تھا۔

اور اب وہ تنہائی اس کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی تھی اس کے ذہن میں ہزاروں ناسور انجانے میں ہی پکے پک کر جڑیں بنا گئے تھے اور اب وہ خون جگر سے انھیں پال رہا تھا اور مضبوط بنا رہا تھا۔

ماں کی وفات کے بعد وہ گھر میں ہی ایک علیحدہ کمرے میں اٹھ آیا اور باقی کا حصہ کرائے پر دیدیا۔ وہ صبح سے لیکر شام تک اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ شام کے وقت نکلتا ڈرتے ڈرتے ایک چکر بازار حسن کا کاٹتا اور بغیر کچھ لیے رات گئے گھر لوٹتا

اور پھر سو جاتا...... سوتے میں اسے عجیب عجیب بے ہنگم خواب دکھائی دیتے۔ ان کا مرکزی نقطہ اس کی ماں ہی ہوتی اور جب ایسے خوابوں سے وہ ہڑبڑا کر جاگ پڑتا تو ساری ساری رات بیٹھ کر دعائیں مانگتا رہتا اپنے ناکردہ گناہوں پر پشیمان ہوتا رو اور پھر تھک کر سو جاتا۔

ایک، اکیلا تن تنہا، مبک سوڈان لعل!

لیکن تنہائی اب بہت بار ثابت ہو رہی تھی وہ اس بوجھل کمبل کو اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ ایک پل کے لیے۔ ایک لمحے کے لیے۔ بس صرف ایک لمحے کے لیے۔

اسے ایک ساتھی کی اشد ضرورت تھی۔

اور پھر ایک شام نہ معلوم کون سی کشش کے زیرِ اثر وہ سیڑھیاں چڑھ ہی گیا۔

پہلی منزل پر دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ لوگ دروازوں کے بیچوں بیچ کھڑے تھے اور آ جا بھی رہے تھے وہ دائیں طرف کے دروازے میں داخل ہوا اس کا دل دھڑک رہا تھا...... پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں لیکن وہ اندر گھس ہی گیا۔ اس کی آنکھیں روشنی سے چندھیا گئیں ایک بڑا سا گول کمرہ تھا سامنے صوفوں پر گوشت پوست کی سجی سجائی دکانیں لگی تھیں، دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے کیبن تھے گراموفون پر کوئی عشقیہ ریکارڈ بج رہا تھا۔

وہ ٹھٹھک گیا۔

اس نے صوفے پر نگاہ دوڑائی۔ سبز ساڑھی۔ گہری سرخ لپ اسٹک موٹی۔ کاش یہ پتلی ہوتی۔ اس کے لاشعور نے سوچا۔ نیلی قمیص

ٹری لائین شلوار۔ موٹی اور بھدی (یہ پیٹر کی بہن ہے اور پیٹر میرا دوست نہیں ہے!) گلابی اسکرٹ اچھی بہت اچھی لیکن اس کے ہونٹ ذرا موٹے ہیں..... اس کی ماں کے ہونٹ تو پتلے ہیں..... چھی اس نے کیا ردی بات سوچی ہے آج رات اکیلے میں خود کو دو تھپڑ لگانے چاہئیں۔ اس کے دماغ میں گونجا۔

"آئیے صاحب!"

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ایک بوڑھی عورت اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس نے کہا "جی.... جی" اور اسے اندر کی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر پیچھے بڑھ گیا وہ ایک کمرے میں داخل ہوتے یہاں بھی صوفے بچھے تھے لیکن تنہائی تھی اس کے ہاتھ کے اشارے پر وہ چابی لگی ہوئی گڑیا کی طرح ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے رومال سے پسینہ پونچھا بوڑھی عورت چلی گئی۔

ایک لڑکی داخل ہوئی وہ اس کے سامنے آئی پتلی بالکل پتلی گڑیا سی ہلکا ہلکا غازہ جس سے اس کا گندمی رنگ چھپ نہیں رہا تھا۔ ہونٹ بھی پتلے تھے۔ ہلکے پیازی رنگ کی ساڑھی پہنے تھی۔

ایک لمحے کے لیے وہ اس کے سامنے ٹھہری۔ پاؤں پر گھومی گویا اپنا جسم اسے دکھا رہی ہو۔ پھر اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے۔ لڑکی نے دس کا اور ایک روپے کے دو نوٹ اٹھاتے ہوئے زیر لب کہا۔

"یہ کمرے کا!" اور پھر اسی پھرتی سے چلی گئی۔

اس کے دماغ میں بگولے رقص کر رہے تھے۔!

اسے معلوم نہیں کب وہ واپس آئی کب وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر ایک کیبن میں لے گئی وہ دیر تک نیم بیہوشی کی سی حالت میں رہا۔ لیکن جب اسے ہوش آیا تو وہ ممّا... ممّا کہہ کر رو رہا تھا اور وہ اسے تھپکیاں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

کچھ نہیں ہوگا..... گھبراؤ نہیں..... تم آؤ تو....

او گاڈ! کیسے بچے سے پالا پڑا ہے!

شوکت صدیقی

کاغذ کا کفن

صبح کے اخبارات آدم جی جوٹ ملز کے فسادات کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔

سہ پہر کو سرفراز خان نے آل پاکستان انجمن جمہور اسلام (رجسٹرڈ) کی مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں پونے تین افراد نے شرکت کی تھی۔ یعنی ایک تو وہ خود۔ دوسرا ان کا بی اے فیل پرائیویٹ سیکرٹری اور اس کے علاوہ ان کا ۹ رسالہ لڑکا ورنہ شرکائے جلسہ کی تعداد نہ صرف پونے چار تک پہنچ جاتی بلکہ خاصی لمبی چوڑی بحث بھی ہو جاتی۔ اس ہنگامی اجلاس میں تین قراردادیں منظور کی گئیں۔

پہلی قرارداد میں مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کو دشمن اسلام قرار دیا گیا تھا۔

دوسری قرارداد میں متحدہ محاذ کے لیڈروں کو غدار بتایا گیا تھا۔

تیسری قرارداد میں صوبائی وزارت کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

جلسہ کی کارروائی اور تین قراردادیں اسی شام کو اشاعت کے لیے تمام اخبارات کو پہنچا دی گئیں۔ دوسرے روز اخباروں میں یہ تمام کارروائی شایع ہوگئی۔ انجمن کے کنوینر کی حیثیت سے انھوں نے ایک بیان بھی جاری کیا۔ جس میں انھوں نے شدید غم و غصّہ کا اظہار کیا تھا۔ یہ بیان بھی چھپ گیا تھا۔ تیسرے روز انھوں نے ایک پوسٹر نکالا جو ہر گلی کوچے کی دیواروں پر چسپاں کر دیا گیا یہ پوسٹر اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ دارالخلافہ میں رہنے والے بنگالیوں نے گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔

سرفراز خاں کا یہ سارا غم و غصہ ان مہاجرین کی ہمدردی میں تھا جو آدم جی جوٹ ملز کے فسادات میں مارے گئے تھے یہ بات دوسری ہے کہ منٹگمری میں جب مہاجرین پر گولی چلی تھی تو انھوں نے حکومت کے اس اقدام کی پر زور تائید کی تھی۔ اسی طرح جب جالیہ سندھ میں سرخ پوشوں پر اندھا دھند فائرنگ ہوئی تو انھوں نے سرخ پوشوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کو ہندوؤں کا ایجنٹ قرار دیا تھا اور جب ختم نبوت کے مسئلہ پر لاہور میں قتل عام ہوا تو ان دنوں وہ بیگم کے غرارے کی تعریف کیا کرتے تھے جس کے اندر موقع پڑنے پر آدمی روپوش بھی ہوسکتا تھا۔ سرفراز خاں نے وہ کتاب نہیں پڑھی تھی جس کے اشتہار پر جلی حروف میں لکھا ہوتا بنے گھر بیٹھے لاکھوں روپیہ کمائیے۔ مگر کیمیا گری کا ایک ایسا نایاب

نسخہ ان کے ہاتھ ضرور آ گیا تھا کہ وہ گھر بیٹھے لاکھوں روپیہ کماتے تھے۔ وہ ادھیڑ عمر کے آدمی تھے اور سخت باتونی آدمی تھے وہ جنم کے مسلم لیگی تھے اور مسلم لیگی کی حیثیت سے مرنے کا قصد رکھتے تھے یوں انھوں نے سماجی بہبود کے کاموں کے لیے انجمن جمہور اسلام (رجسٹرڈ) کے نام سے ایک جماعت بھی بنا ڈالی تھی جس کے وہ خود کنوینر تھے اور مجلس عاملہ کو بھی انھوں نے نامزد کیا تھا رجسٹریشن آفس میں انجمن کے اراکین کی تعداد ۲۰ ہزار درج تھی مگر اس کے جلسوں میں ۲۰ افراد بھی شریک نہیں ہوتے تھے۔ سنا ہے کہ جب وہ دہلی میں تھے تو چونگی کے ناکہ پر محرر تھے قیام پاکستان کے بعد وہ ایک مڈل اسکول میں مدرس ہو گئے اچھے بھلے روزی لگے تھے شامت اعمال ایک نازک اندام طالب علم کو دل دے بیٹھے۔ پھر یہ وارفتگی اس قدر بڑھی کہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان سے ایک ایسی حرکت سرزد ہو گئی کہ اسکول سے بہت بے آبرو ہو کر نکلے۔ اس کے بعد انھوں نے مدرسی کا پیشہ ترک کر کے ڈاکٹری شروع کر دی۔ اور رنچھوڑ لائن میں ہومیو پیتھ ڈاکٹر کی حیثیت سے مطب کرنے لگے۔ مگر ڈاکٹری کچھ چلی چلائی نہیں البتہ ان کا مطب رفتہ رفتہ محلہ کے سیاست دانوں کا اکھاڑہ بن گیا۔

ان میں کچھ پنشن یافتہ بوڑھے تھے، بے روزگار نوجوان تھے اور دفتروں میں کام کرنے والے کلرک تھے۔ جو ان کے مطب میں بیٹھ کر اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے، خبروں پر قیاس آرائیاں کرتے تھے اور اس طرح سیاسی گرما گرمی پیدا ہو جاتی تھی خوب بحثیں ہوتی بڑے بڑے معرکہ ہوتے سچ پوچھیے تو ان کی سیاسی تربیت ان ہی ہنگاموں سے ہوئی اور ان ہی سے متاثر ہو کر

ان کے دل میں انجمن جمہور اسلام رجسٹرڈ کا افتتاحی اجلاس ہوا اور اس کی کارروائی اخبارات میں شایع ہوئی۔ یہیں سے ان کی لیڈری کی ابتدا ہوئی اور انھوں نے باقاعدہ بیانات جاری کرنا شروع کر دیے جو کسی نہ کسی اخبار میں چھپ بھی جایا کرتے تھے۔ لیکن بیانات کی اشاعت میں ان کے پڑوسی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ بڑا عاشق مزاج قسم کا نوجوان تھا۔ اور ایک اردو اخبار میں بازاری نامہ نگار (کمرشیل رپورٹر) تھا۔ اس کا قیام اسی بلڈنگ میں تھا۔ جس میں ڈاکٹر سرفراز کا مختصر سا فلیٹ تھا اور چوری چھپے ان کی بڑی لڑکی سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا۔

سرفراز خان کا بیان جب کسی اخبار کے دفتر میں جاتا تو سب ایڈیٹرز آل پاکستان جمہور اسلام کے لیڈر کا نام دیکھ کر کہتے۔

بھائی جمہور نے پھر ایک عدد بیان دے مارا۔

اس سالے کو سیاسی ہیضہ ہو گیا ہے۔

بیان چھپ جائے گا تو کم از کم ایک درجن اخبار کی کاپیاں ضرور خریدے گا۔

اخبارات کے دفتروں میں ان کو عام طور پر بھائی جمہورے کہا جاتا تھا اکثر ان کے بیانات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک کر کوئی دل جلا اس پر پوری پان کی پیک تھوک دیتا کچھ لوگ بیت الخلاء جاتے ہوئے ان کے بیانات کو خاص طور سے اٹھا کر لے جاتے اور ان سے سنیٹری کا کام لیتے۔

ڈاکٹر سرفراز کو ان ناشائستہ حرکتوں کا پتا بھی چل جاتا تب بھی وہ باز آنے والی آسامی نہیں تھے۔ اب لیڈری کا ان کو چسکا لگ چکا تھا۔ سرکاری افسروں میں تھوڑا بہت رسوخ بھی پیدا ہو چکا

تھا۔ اور جب سے آدم جی جوٹ ملز میں فسادات ہوئے تھے۔ ایک وزیر باتدبیر کے بنگلہ پر بھی ان کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ جس روز مشرقی بنگال میں دفعہ ۹۲ الف نافذ کی گئی اس روز انھوں نے ایک لمبے چوڑے بیان کے علاوہ ایک قد آدم پوسٹر بھی شایع کیا جس میں متحدہ محاذ کے معزول وزیروں کے خلاف ہر سیاسی گالی استعمال کی تھی۔

اسی ہفتہ کو ۵۰ ہزار کا امپورٹ لائسنس ملا جو منٹوں میں ڈیڑھ لاکھ کا فروخت ہو گیا۔

اسی طرح جب ملک بھر میں تخریب پسندوں کی گرفتاریاں عمل میں آئیں تو انھوں نے حکومت کی تائید میں ایک دو تین نہیں بلکہ پورے سات بیانات جاری کیے اور بھوکٹ میں ایک پٹرول پمپ کا پرمٹ حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ ان کے بڑے صاحبزادے کو فورڈ فاؤنڈیشن سے بیرونی تعلیم کا اسکالرشپ ملنے کے امکانات بھی قوی ہو گئے۔

یہ دور سرفراز خان کو بہت راس آیا۔ ایوان حکومت میں ان کی خاصی رسائی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی ٹوٹی تو سرفراز خان نے فوراً بیان جاری کیا کہ گورنر جنرل نے ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ جب ون یونٹ بل پاس ہوا تو انھوں نے اس کی بھی حمایت کی محمد علی بوگرا وزارت عظمیٰ سے برطرف ہوئے تو سرفراز خان ان کی حکومت کو ناکارہ قرار دیتے ہوئے نئے وزیر اعظم چودھری محمد علی کی سوجھ بوجھ اور اعلیٰ صلاحیتوں کا قصیدہ ایک بیان کی صورت میں چھپوا ڈالا۔ جب تک وہ وزیر اعظم کے عہدے پہ رہے وہ ان کے ہر اقدام کی تعریف کرتے رہے اور عوامی لیگ

کے لیڈر کی مخالفت کرتے رہے۔ لیکن جب چودھری محمد علی گئے اور سہروردی وزیر اعظم ہو کر آئے تو سرفراز خاں کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گئے اور بیگم کے غرارے کی تعریف کرنے لگے جس میں موقع پڑنے پر آدمی چھپ بھی سکتا تھا۔ یہ روپوشی کا دور زیادہ عرصے نہ رہا اور ایک روز مہاجرین کی آبادکاری پر انھوں نے ایک علاحدہ بیان پھر جھاڑ دیا۔ اس کے بعد نہر سوئز کا مسئلہ آ گیا۔ سرفراز خاں نے ان دنوں مصر کی حمایت میں بڑے بڑے مجاہدانہ بیانات جاری کیے انگریزوں کو قاتل اور لٹیرا کہا۔ مگر جب انھوں نے حکومت کی پالیسی بدلتے دیکھی تو وہی جمال ناصر جس کو انھوں نے عالمِ اسلام کا نجات دہندہ کہا تھا موردِ عتاب ہو گیا۔

سرفراز خاں اپنے بیانات کی بدولت ایک بہت بڑے سیاسی مہرہ بن گئے۔ بالآخر بازاری نامہ نگار کو دھتکار کر انھوں نے بعض اخبار نویسوں سے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ہر دور میں انھوں نے ایک نہ ایک وزیر سے نباہے رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے مخالفین ان سے خائف رہتے تھے وہ بڑے بڑے سیاسی مسائل کے علاوہ اکثر بعض افراد کے خلاف بھی بیان دے ڈالتے اور پوسٹر لگوا دیتے تھے اور انجمن جمہور اسلام کے جلسوں میں قرار دادیں پاس کروا دیتے تھے۔ انجمن جمہور اسلام جس کے وہ ابھی تک کنوینر تھے اور جس کی مجلس عاملہ کے اراکین میں اپنی مرضی کے مطابق ردوبدل کرتے رہتے تھے۔

اللہ کا دیا ان کے پاس سب کچھ تھا۔ ایک چھوڑ تین کوٹھیاں تھیں۔ ایک میں خود رہتے تھے دو کرایے پر اٹھا دی تھیں۔ ہر سال تازہ ترین ماڈل کی کار خریدتے تھے۔

پٹرول پمپ کے علاوہ کئی غیر ملکی فرموں کی ان کے پاس ایجنسیاں تھیں، لڑکے لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ بیگم اپوا کی لیڈر ہوگئی تھیں خود میٹرو پول اور بیچ لگژری ہوٹل میں ڈنر دیتے تھے اور اعلیٰ حکام سے رسوخ پیدا کرتے تھے اپنی تقریبوں کے سلسلوں میں ان کو پینے پلانے کا بھی شوق پیدا ہو گیا۔ ٹانک۔ پی پی کر جوانی نے زور مارا۔ سوسائٹی گرلز کو صرف پیاسی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتے مراسم پیدا کرنے کی توفیق اس لیے نہیں ہوئی کہ انگریزی غلط بولنے پر کئی بار سر محفل ٹوکے گئے تھے۔ بھرم بہر حال قائم رکھنا تھا لہذا انہوں نے بال روم جانے کی کبھی جرأت نہ کی اور مشرقی موسیقی کے رقص میں دلچسپی لینے لگے اس طرح نیپئر روڈ کی ایک طوائف سے ان کے تعلقات پیدا ہو گئے.... اور اس بری طرح اس پر فریفتہ ہوئے کہ اس کے بغیر گھڑی بھر کو چین نہ آتا۔ مگر وہ سخت بے وفا نکلی ان کو جل دیکر ایک سندھی وڈیرے کے پہلو میں جا بیٹھی۔

ڈاکٹر سرفراز خان کچھ عرصہ تک تو اس کو منانے کی کوشش کرتے رہے اس کے پاس اپنے پیغام بھجوائے مگر جب وہ کسی طرح ملتفت نہ ہوئی تو ایک روز خود اس کے پاس جا پہنچے مگر اس نے سیدھے منھ بات تک نہ کی اور دروازے پر ہی سے ٹرخا دیا۔

ان کو سخت طیش آیا اسی جلال کے عالم میں انہوں نے نیپئر روڈ کی طوائفوں کے خلاف ایک بیان دیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان کو شہر سے باہر لیجا کر بسایا جائے اس لیے کہ وہ ناچ

ہنگامے کی آڑ میں پیشہ کراتی ہیں۔ جب یہ بیان اخبارات میں چھپا، دوپہر کو انھوں نے رنڈیوں کے خلاف پوسٹر شہر بھر میں ہر جگہ چسپاں کرا دیا۔ جن اخبارات کے ایڈیٹروں سے ان کے مراسم تھے ان سے مل کر تحبہ کے خلاف اداریے بھی لکھوا دیے۔

اس ہنگامے کا یہ اثر ہوا کہ طوائفیں تو شہر سے نکالی نہ گئیں مگر پولیس نے ان کی کڑی نگرانی شروع کر دی۔ آئے دن طوائفوں کے بالاخانوں پر پولیس کے چھاپہ مارنے کی خبریں آنے لگیں طوائفیں اس نئی مصیبت سے بوکھلا گئیں۔

ان کے چودھریوں کا ایک وفد جا کر سرفراز خاں سے ملا ڈھیروں مکھن لگایا مگر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ بلکہ ان کے جانے کے بعد انجمن کے نام پر ایک قرارداد لکھوائی اور اخبارات کو بھیج دی جس میں انھوں نے طوائفوں کے خلاف اور بھی سخت لہجہ اختیار کیا تھا اس قرارداد کے چھپتے ہی پولیس کی سختی اور بڑھ گئی جاپانی روڈ کی بھیتجر رنڈیوں کا تو سارا کاروبار ہی چوپٹ ہو گیا۔

چند روز بعد کا ذکر ہے بڑی خوشگوار رات تھی باہر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ہوا میں مہک تھی اور سرفراز خاں بیٹھے اپنے دفتر میں تھے سامنے پرائیویٹ سکرٹری موجود تھا اور وہ مولانا شفائی کے خلاف ایک انتہائی اشتعال انگیز بیان لکھوا رہے تھے دراصل وہ کانگرس کانفرنس کی کارروائی پر سخت برہم تھے ابھی انھوں نے بیان شروع ہی کیا تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور چند تیز طرار کی قسم کی عورتیں دندناتی ہوئی اندر آگئیں۔ وہ سب جاپانی روڈ کی نکھائیاں تھیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ان میں سے ایک نے سرفراز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

کیوں بے حرامی تیرا ہی نام ڈاکٹر سرفراز ہے۔
سرفراز خاں سخت برہم ہو کر بولے۔ کون ہو تم؟ بھئیں یہاں آنے کس نے دیا۔

"ابے ہم کو کون روک سکتا ہے تیری تو......"

انھوں نے کسی عورت کی زبان سے اس قدر وزنی گالی نہیں سنی تھی۔ بھونچکا ہو کر اس کا منھ تکنے لگے۔

اسی وقت ایک ٹکھیائی نے ڈانٹ کر کہا۔ سالے منھ کیا دیکھتا ہے۔ وہ بڑی لحیم شحیم عورت تھی کسی زمانے میں پولیس کانسٹبل رہ چکی تھی اور بلا زمت سے برطرف ہو کر نائیکہ کا پیشہ کرتی تھی۔ سرفراز خاں اس کو دیکھ کر پہلے تو ذرا ڈرے پھر انھوں نے اس کو ڈانٹا۔

فوراً کمرے سے باہر نکل جاؤ ورنہ میں ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔

"ابے یہ گیدڑ بھبکی کسی اور کو دینا۔ میں چھاتی پر چڑھ کر تیرا خون پی جاؤں گی بھڑوے۔ حرامی تو نے سمجھا کیا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ شیرنی کی طرح سرفراز خاں کی طرف جھپٹی۔ پرائیوٹ سیکرٹری نے جو یہ صورت حال دیکھی تو کھڑکی سے کود کر سر پٹ بھاگا۔ ادھر رنڈیوں نے سرفراز خاں کو گھیر لیا اور ایک نے سینڈل اتار کر تعداد کا تعین کیے بغیر وہ پینترے بدل بدل کر ہاتھ مارے کہ ڈاکٹر سرفراز خاں فرش پر گر پڑے۔ مردمار قسم کی لحیم شحیم رنڈی کود کر سینہ پر چڑھ بیٹھی اور برابر کھڑی ہوئی ایک رنڈی سے ڈانٹ کر بولی۔

"موت ری حرامی کے حلق میں"

سرفراز خاں نے گھبرا کر اس رنڈی کی طرف دیکھا مگر وہ رنڈی ہوئی تو کیا ہوا بہر حال عورت تھی اس کی ہمت نہ پڑی وہ رنڈی

جو ان کے سینے پر سوار تھی اس نے اس رنڈی کی بزدلی پر ایک عمدہ سی گالی دی اور سرفراز خاں سے بولی۔

" اچھا سالے میں تیرا دوسرا انتظام کرتی ہوں "

پھر اس نے ان کا جبڑا بڑے زور سے کھنکھار ماری اور ان کے حلق کے اندر تمباکو والے پان کی پیک تھوک دی اور ان کے سینے پر سے اتر کر علیٰحدہ ہو گئی۔

سرفراز خاں فرش پر پڑے ہوئے بری طرح ابکائیاں لیتے رہے ان کا خیال تھا کہ شاید اب یہ بلائیں ٹل جائیں۔ مگر وہ اسی طرح ڈٹی رہیں۔

ایک نے ان کی کمر پر زور کی ہٹ لگائی اور اونچی آواز سے بولی۔۔۔۔۔ " سیدھا کھڑا ہو سالے، بہت ہو چکا نخرا "

وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔ نائیکہ نے کہا۔

کیا ارادہ ہے ؟

سرفراز خاں گھبرا کے بولے۔

" کا ہے کے متعلق "

وہ بولی۔

" واہ بھولی کے سالے کو یہ پتا نہیں کہ ہم اس کی جان کو رونے کیوں آئے ہیں "

وہ گردن جھکائے ملزموں کی طرح خاموش کھڑے رہے ایک نے بڑھ کر ان کی گدی پر زنانے کا ایک ہاتھ دیا "

سالے پوسٹر لگاتا ہے، اخبار میں ہمارے خلاف ادھم مچواتا ہے اب کیسا مسکین بنا کھڑا ہے۔ اور ایک دم اس کو طیش آ گیا۔ پاجامہ اتار، تیری تو۔۔۔۔۔۔ اس نے ایک

زور دار گالی دی۔

سرفراز خاں بدحواس ہو کر گڑگڑانے لگے۔

خدا کی قسم اب تمھارے خلاف کوئی بیان نہیں دوں گا۔

لحیم شحیم رنڈی بڑے بڑے دیدے نکال کر گرجی۔ اور جو تو نے پھر یہ حرامی پن کیا تو؟"

وہ بولے اگر تمہارے خلاف ایک لفظ بھی کہوں تو میری پانچوں اولادیں کام نہ آئیں۔

ذرا دیر تک خاموشی رہی۔ پھر اسی رنڈی نے کہا۔

"اچھا تو فی الحال تم مرغا بن جاؤ"

سرفراز خاں مرغا بن گئے۔

اس نے ان کے چوتڑوں پر اس قدر کس کے ایک لات ماری کہ وہ دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد سرفراز خاں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اس کا بولٹ چڑھا کر صوفے پر بے دم ہو کر گر پڑے اور دیر تک پڑے ہانپتے رہے۔

ایک مستند راوی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر سرفراز خاں سیاست سے کنارہ کش ہو گئے ہیں اور آج کل حج بیت اللہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

جمال ابڑو

ترجمہ:- بشیر موریانی

بدمعاش

وہ ایک بڑا بدمعاش تھا۔ اول نمبر کا۔ جھوٹ، دغا، فریب، چوری، لوٹ مار، اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ چٹکیوں میں جرم کر لیتا۔ اس کے پاس رحم بھلا کہاں سے آتا؟ غصہ میں گھورا دیکھتا رہتا۔ ایک بھوں نیچے، آنکھ مچی ہوئی، دوسری بھوں اوپر، دانت ایک ساتھ ملے ہوئے۔

چیتے کی طرح اپنے شکار کو تاکتا رہتا۔ پلک جھپکنے میں حملہ کرتا۔ آنتیں باہر۔ ڈائن جیسی کلہاڑی کندھے پر رکھ کر شیر کی مانند جنگل میں پھرا کرتا۔ بدقسمتی سے اگر کوئی للکارتا۔ تو وہ گردن اٹھائے خاموشی سے اسے دیکھتا اور گھورتا رہتا۔ سر سے پاؤں تک دو تین مرتبہ اسے دیکھ لیتا۔ پھر گرجتا، چیتے کی طرح کود کر شکار پر ٹوٹ پڑتا۔ کلہاڑی کی ٹپک ٹپک سیکنڈوں کام تمام

ہو جاتا۔

پتلی کمر، چوڑا سینہ کندھے اوپر کو اٹھے ہوئے، مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے، شوریدہ آنکھوں کے ساتھ وہ مست پھرا کرتا۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔

بچپنے سے ضدی تھا۔ اس کا والد اسے اتنا پیٹتا کہ ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ مگر وہ کہاں راہِ راست پر آتا۔ بڑے زور سے چلاتا اور چیختا۔ اسے لاتیں اور گھونسے برداشت کرنے پڑتے۔ والدہ ہوتی تو اسے والد کے پنجے سے چھڑاتی۔! بالآخر اس نے چلانا بند کیا۔ پیٹتا رہتا مگر خاموش رہتا۔ چاہتا تو وہ یہ تھا کہ۔ باپ کی ڈاڑھی نوچ لے۔ مگر نسبتاً کمزور تھا۔ اڑوس پڑوس کو اس نے تنگ کر دیا اپنی عمر کے لڑکوں کو پیٹ کر نکل جاتا۔ بچوں کے والدین شور مچاتے آتے۔ ان کے ہاتھ پڑ جاتا تو خوب مرمت کر دی جاتی۔ ان کا اپنا تو وہ تھا نہیں! اگر یوں نہ ہوتا۔ تو اس کے والد سے اس کی شکایت کی جاتی۔ والد خود سے ہی بیزار تھا۔ وہ پوری کسر اسے پیٹ کر نکال لیتا۔ جرم دوسروں کا۔ پٹتا وہ تھا۔

"میں مفت میں تھوڑا ہی پیدا ہوا تھا"۔ اسے اتنا غصہ آجاتا، اتنا غصہ آجاتا...... بہت غصہ آتا اسے کہتا تھا۔

"ذرا ٹھہرو۔ مجھے بڑا ہونے دو۔!"

اس نے کسی بنیے کے چمکدار کپڑوں کو چھو لیا تھا! بنیے نے اسے چپت لگا دی تھی۔ والد نے بھی گھونسہ جڑ دیا تھا۔ والد پر اسے بڑا غصہ آیا تھا...... "سُودرا" چھوٹا تھا۔ برداشت کر گیا۔

یتیم، میلی کچیلی قمیص، پھٹی ہوئی پگڑی، تھوڑا سا اناج تک نہیں تھا۔ جس سے وہ کچھ اور خرید لیتا۔ دوسرے بچے چھو لیا!

بھر بھر کھاتے رہتے۔ یہ اکیلا، سر پہ بازو رکھے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ انہیں دیکھا کرتا۔ مٹی کی چکی، مٹی کی گاڑی، مٹی کا اونٹ مع رنبی کے۔ یہ سب چیزیں وہ دیکھا کرتا۔ جی اس کا بھی چاہتا تھا کہ وہ انہیں کم از کم چھو کر دیکھے۔ پر بھلا کون ایسا تھا جو اسے چھونے دیتا۔ اس کی ناک سرخ ہو جاتی۔ ایک طرف کو دوڑ جاتا۔ کسی کونے میں منہ چھپائے، دیواروں پر لکیریں ڈالنے لگتا۔ بسورتا رہتا اور ناک پونچھتا رہتا۔

بڑی حسرتوں کے بعد اس نے کھلونا چرایا۔ اسے چھپا چھپا کر رکھتا۔ چوری چھپے اس سے کھیلا کرتا۔ اور پھر چھپا لیتا۔ چھوٹا سا، کافور کا گڈا بڑی آنکھوں والا، جیسے اس کا بھائی ہو۔ کس بیدردی سے اس کے والد نے وہ اس سے چھین لیا۔ بسور بسور کر، چھلانگیں لگا کر اس نے کھلونا واپس چھیننے کی کوشش کی۔ بیچارا گڈا والد کے پاؤں تلے روندا گیا۔ وہ بہت چیخا، والد کو "حرامی" تک کہہ ڈالا۔ والد نے لاتیں بھی ماریں۔ وہ خوب رویا۔ ٹوٹا ہوا کھلونا لیے وہ اکیلے میں بھی رویا۔ ٹکڑے چن کر، کپڑے میں لپیٹ کر اسے رکھ لیا۔ اس روز کے بعد وہ پھر کبھی نہیں رویا۔

والد اسے ایک نظر نہ بھاتا تھا، بھلا اس کے جسم کا کون سا حصہ تھا جس پر اس نے اس کے جوتے نہ کھائے ہوں۔ بڑا ہوا تو اس نے لاٹھی اٹھائی۔ کہا "خبردار جو میرے قریب آیا۔ تو...."

والد سمجھ گیا۔ خاموش رہا۔ دوسرے لوگوں سے تو اسے ازلی بیر تھا۔ بھلا کون تھا جو اس سے اچھی طرح پیش آیا تھا؟

اس کی نس نس میں نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، لوگوں کو پیٹتے، لوٹتے ستاتے اسے خیال تک نہ آتا۔

"اس کے ساتھ انھوں نے کیا کم ظلم کیے تھے۔" وہ نفرت سے بھرا ہوا تھا جتنی نکالتا پھر بھی آتی باقی رہتی۔ نہ کم ہوتی نہ بڑھتی۔
اس کے پاس ایک کتا تھا۔ وہ جب مرا تو اس نے آنسو بہائے۔
ایک مرتبہ وہ پکڑا گیا تھانہ پر گھسیٹ کر لایا گیا۔ ابھی کچا تھا ڈر گیا۔ کہنے لگا۔

"یا خدا! اس مرتبہ میری جان بچاؤ تو توبہ کر لوں گا۔" لیکن جب اسے مرچیں لگائی گئیں۔ اور پیشاب پلایا گیا۔ تو اس کا خوف جاتا رہا۔ وہی ایک بھوں نیچے، آنکھ میچی ہوتی۔ ایک بھوں اوپر...
پھر تو وہ کئی مرتبہ پکڑا گیا۔ مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔ آنکھ اٹھا کر کسی طرف دیکھا۔ تو اس کا حلق خشک ہو جاتا۔ ایسے ویسے پولیس افسر کی ہمت نہ پڑتی۔ کہ اس سے کچھ کہہ سکتا۔
ایک باوقار آدمی کی چوری کے سلسلے میں وہ پکڑا گیا۔ پولیس پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس سے کہا گیا "مال واپس کرو" اسے اس کے گھر لے گئے۔ اس کی بہن کو ننگا کر دیا گیا۔ اور اسے حکم دیا گیا "بال نوچو"
مقدمہ سے بچ نکلا۔ بہن کو منہ نہیں دکھایا۔ باوقار آدمی کو قتل کر دیا۔ ان پولیس افسروں کو قتل کیا اور روپوش ہو گیا۔ کیسا روپوش؟ وہیں تھا لیکن پولیس سے زیادہ طاقتور تھا۔
دہشت پھیلا دی اس نے۔ آدمی مرا گویا کتا مرا۔ جب انسانوں کے گلے میں سے خون کے دھارے پھوٹ بہتے اور کٹی ہوئی رگوں سے خون ابل آتا۔ اور وہ خون کے کیچڑ میں پاؤں پٹختے اچھل پڑتے۔ تو وہ کھڑا ہوا نظارا کرتا رہتا۔
ایک بھوں نیچے، آنکھ میچی ہوئی اور ایک بھوں اوپر۔

اس نے باراتیں لوٹیں ۔ دولہا دلہن قتل کیے ۔ نوٹوں کی گڈیاں جلائیں ۔ شعلوں کو دیکھا کیا ۔ ایک بھوں نیچے آنکھ میچی ہوئی ۔ ایک بھوں اوپر ۔

ایک دوست سے ناراض ہوا ۔ اس بیچارے کی آنتیں نکال باہر کیں ، اس کے جسم کے ٹکڑے کر ڈالے پھر بڑے زور سے چلاتا رہا ۔ دن گزرا ، رات گزری ، اس نے روٹی نہیں کھائی ۔ واپس آ کر اس کی فاتحہ پڑھی ۔ مونچھیں اس کی لٹک گئیں ۔ خون میں نہائی ہوئی کلہاڑی قتل کی جگہ دفن کر دی گویا اپنے ظلم اور ہستی کو دفن کر دیا ۔ اور پھر ۔ پکڑا گیا ۔ ایک مقدمہ سے بھی نہیں چھوٹا ۔ ایک سو دس میں پھنس گیا ۔ مٹی کی روٹی موبل میں پکی ہوئی دال ۔ چرس اور بھنگ کا بیوپار ، بچہ بازی پر جھگڑے ، دونوں ملے ہوئے ، قیدی خواہ افسر ، گالی گلوچ ، کتے کا سا سلوک وہ گدھے کی طرح کام کرتا رہا ۔ ماتھے پر بل ڈالے ۔ خاموشی سے محنت و مشقت برداشت کرتا رہا ۔ دو چار ہی روز مشکل سے گزرے تھے ۔ اور وہ باہر ، پتھر کو کوٹتے ہوئے اس نے خوانخواہ جمعدار کے ڈنڈے کھائے ۔ اس نے گردن موڑ کر بھنویں سکیڑ کر ، اس کی طرف دیکھا ۔ جمعدار کو جیسے تاؤ آ گیا ۔ گالیاں برس پڑیں ۔ کہا ۔ " دیکھتے کیا ہو ؟ " اس کی دونوں آنکھیں رح گئیں ۔ دانت کچکچا کر وہ گرجا ۔ چھلانگ لگائی اور ٹوٹ پڑا ۔ جمعدار کی بانہیں نکال کر رکھدی ۔ ہنگامہ برپا ہو گیا قیدیوں کی اللہ نے سنی ۔ سپاہیوں کی بندوقیں چھوٹ گئیں ۔ وہ بھاگ گیا ۔

اس نے اپنی کلہاڑی کھود کر نکال لی ۔ بغور اسے دیکھا

گویا انسانی سروں کو شمار کر رہا تھا۔ اس کی باچھ ٹیڑھی ہو گئی۔ ناک سکڑ گئی۔ آنکھ مچ گئی۔ نفرت سے وہ مسکرایا۔ کلہاڑی کو اوپر اٹھا کر چوم لیا۔ اس کے پھل کی تیز دھار انگوٹھے سے معلوم کی۔ نئے سرے سے اس نے قتل شروع کر دیے۔ سوئے ہوؤں کو مارا۔ بے گناہوں کا خون کیا۔ گھر جلا ڈالے عورتوں کی چیخیں بچّوں کے آنسو۔ آگ کے شعلے۔ دیکھ دیکھ کر وہ چلا پڑتا۔ مڑ مڑ کر دیکھتا۔ نہ خوشی نہ ناراضگی۔ وہی آنکھ مچی ہوئی۔ باچھ مڑی ہوئی بھنویں نیچے اوپر۔ پچک کرکے تھوکتا۔

ایک مرتبہ دن دھاڑے لوٹ مچائی۔ پورے گاؤں کو مٹھی میں لے لیا۔ جو جہاں سو وہاں، خوفزدہ اور خاموش وہ گردن اٹھائے۔ بھنویں تانے ہوئے آ جا رہا تھا۔ صحن سے گزرتے ہوئے ایک کھلونا اس کے پاؤں تلے آ گیا۔ ڈھائی سال کے بچے نے ماں کی گود میں سے پکار کر کہا۔

"گندہ" حلامی، اس نے مڑ کر دیکھا۔ ماں نے بچّے کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اسے سینے سے چمٹا لیا۔ بیچاری کی آنکھیں بھر آئیں۔ بچّے کو اور مضبوطی کے ساتھ چمٹا لیا۔ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کیا کچھ نہیں تھا ماں کی آنکھوں میں! وہ پتھر بنا کھڑا رہا۔ بچّے کو دیکھا۔ ماں کی گود کو دیکھا۔ کس طرح بچّہ ماں کی گود میں بانہیں لپیٹے، دم سادھے پڑا ہوا تھا۔ وہ دیکھتا رہا۔

اس کی تنی ہوئی بھنویں۔ آہستہ آہستہ سیدھی ہو گئیں۔ اس نے جھک کر ٹوٹا ہوا کھلونا اٹھا لیا۔ ٹکڑے چن کر وہ

آگے بڑھا۔ اور عورت کے ہاتھ میں تھما دیے۔

اسی چوری میں وہ پکڑا گیا۔ اس کے کچھ ساتھی مارے گئے۔ کئی ایک نے اس پہ بک دیا۔ عورت نے گواہی دی۔ ٹوٹا ہوا کھلونا پیش ہوا اسے عمر قید کی سزا ملی۔

وہ خاموش تھا، بالکل خاموش۔ اس کی بھنویں سیدھی تھیں۔ آنکھیں معمولی سی گویا دور دور کچھ دیکھ رہا ہو عورت کو بچے کو اور اپنے ٹوٹے ہوئے کھلونے کو۔ اس کے کانوں میں آوازیں آرہی تھیں "گندہ حلامی"۔

اسے سینٹرل جیل بھیجا گیا۔ لُولا جمعدار جیلر بن چکا تھا۔ اس نے اس کو کس کر بندھوایا۔ اس کو ننگا کروا کے ڈنڈا لگوایا۔ اس کو سینٹرل جیل کے درخت میں الٹا لٹکایا گیا۔ علی الصبح وہ مر گیا۔ اسے اتارا گیا۔ ڈنڈا نکالا گیا۔ خون جاری ہو گیا۔ لُولے جیلر نے اسے ٹھوکر ماری اور کہا "بد معاش"

کوثر چاندپوری

لہو کا دریا

پرویز میڈیکل اسٹور کی پروپرائٹر مس منیزہ کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ ہو گی۔ لیکن بورڈ پر نام سے پہلے "مس" کا لفظ دیکھ کر اکثر خریداروں کو خیال ہوتا ہے کہ منیزہ کوئی اور دوشیزہ ہو گی اسٹور میں جو ادھیڑ عورت کام کرتی ہے وہ ملازم ہو گی۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے۔ منیزہ اب تک تجرد کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کے حالات سوائے ایک مستقل گاہک مسٹر باقر کے اور کسی کے علم میں نہیں۔ باقر ہمیشہ بیمار رہنے والے ایک معزز شہری ہیں اور پرویز میڈیکل اسٹور میں آئے دن آتے رہتے ہیں۔ عام طور پر وہ منجم اور جفّار کی حیثیت سے متعارف ہیں اور بہت معزز سمجھے جاتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن وہ ضرور ہی میڈیکل اسٹور میں آتے ہیں۔ باتیں بہت کم کرتے ہیں۔ بولنے سے پہلے

مسکرانا ان کی عادت میں شامل ہے۔ بہت احتیاط سے لکڑی کا زینہ چڑھ کر اوپر آتے ہیں اور پرچہ کاؤنٹر پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دوائیں جب پلاسٹک کی خوبصورت تھیلی میں بند کر کے بل کے ساتھ رکھ دی جاتی ہیں تو وہ کرسی سے کھڑے ہو کر جیب سے پرس نکالتے ہیں پھر قیمت دیکر چپکے سے چلے جاتے ہیں۔ مہینوں سے ان کا یہی معمول ہے۔ کسی نے منیزہ کے سامنے ذکر کر دیا کہ باقر صاحب کو نجوم اور جفر میں مہارت ہے۔ منیزہ کو ان سے بات کرنے کا بہت اشتیاق ہو گیا۔ حسب معمول وہ ہفتہ گزار کر میڈیکل اسٹور میں آتے تو منیزہ نے تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا اور ادب سے بولی۔

کچھ پوچھنا چاہتی ہوں، زحمت نہ ہو تو کوئی وقت بتایئے دولت خانہ پر حاضر ہو جاؤں گی۔

اس سے اچھا دولت خانہ میرے پاس نہیں۔ یہیں بیٹھ کر آپ کی باتیں سنے لیتا ہوں۔

بڑی عنایت ہے آپ کی، میرے آفس میں تشریف لے آیئے۔

ضرور چلوں گا، اصل میں مجھے آپ کے چہرے پر ٹریجڈی کے نقوش دیکھ کر خیال ہو رہا تھا کہ آپ سے کچھ گفتگو کرنے کا موقع نکالوں گا۔

مسٹر باقر آفس میں چلے گئے۔ کچھ کہنے سے پہلے منیزہ نے کافی پینے کی درخواست کی۔

ایک پیالی کافی پیش کرنا چاہتی ہوں۔

کوئی مضائقہ نہیں۔

اس دفعہ باقر صاحب نے آفس کے در و دیوار پر اچٹتی

سی نگاہ ڈالی۔ ایک طرف کسی حسین نوجوان کا پورٹریٹ آویزاں تھا جس پر پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔ اور پھر دیکھتے ہی رہے۔ انھیں اس میں منیزہ کی زندگی کے متعدد عنوانات نظر آئے اتنی دیر میں کافی آگئی اور منیزہ نے پیالی بھر کر میز پر رکھدی۔ باقر صاحب نہایت سلیقے سے اسے سپ کرنے لگے۔

"پسند آئی" منیزہ نے سوال کیا۔

کیوں نہیں، کافی میں تلخی نہ ہو تو اسے کافی نہیں کچھ اور کہا جائے گا۔ اس کی ہلکی اور گوارا سی کڑواہٹ مجھے ہمیشہ اچھی حالت معلوم ہوا کرتی ہے۔

شکریہ! منیزہ نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔

کافی ختم ہوتے ہی وہ بولی، اجازت ہو تو اپنا ہاتھ دکھاؤں۔

دکھلیئے۔

منیزہ نے گورا چٹا نازک ہاتھ باقر صاحب کی سنہری عینک سے ڈھکی ہوئی آنکھوں کے آگے بڑھا دیا۔ وہ دیر تک اس کی لکیریں دیکھتے رہے ہاتھ کو الٹ کر بھی دیکھا اور دھیرے سے گویا ہوئے۔

ہاتھ بہت اچھا ہے۔ آپ کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے معلوم ہوتا ہے جس کی مالی حالت اچھی ہے۔ اور یہ لکیر انھوں نے انگلی سے چھو کر کہا۔ رومان کی کہانی سنا رہی ہے۔ اس کا ریشمی ڈورا جلد ہی ٹوٹ گیا ہے۔ لکیر فوراً ہی کٹ گئی ہے۔ مگر اس سے رومان ختم نہیں ہوا وہ ایک مستقل المیے میں تبدیل ہو کر سسک رہا ہے۔ آگے آپ خود ہی اپنے حالات تفصیل سے بتایئے۔

اب یہ اور بتایئے باقر صاحب، منیزہ نے پورٹریٹ کی سمت انگلی سے اشارا کرتے ہوئے سوال کیا کہ ڈاکٹر پرویز جن کی یہ تصویر ہے زندہ ہیں یا...... اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ جیسے کسی نے زور سے گلا دبا دیا ہو۔

باقر صاحب نے تصویر اپنے سامنے رکھ لی اسے نگاہیں جما کر دیکھتے رہے اور انگلیوں پر کچھ گنتے رہے اور وثوق کے ساتھ سرد لہجے میں بول اٹھے۔

پرویز زندہ ہیں مگر بہت دور ہیں۔ آگے آپ کتاب حیات کھول کر اس کے دو چار سبق سنایئے۔

منیزہ نے لمبی انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہنا شروع کیا میرے والد مسٹر شہاب مشہور وکیل تھے اب ان کی جگہ میرے بڑے بھائی آفتاب بار ایٹ لار اسی شہر میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ میں ان کے کئی برس بعد پیدا ہوئی تھی، ماں باپ دونوں بے حد مجھ سے مانوس تھے۔ انھوں نے میری تعلیم کا بہت معقول بندوبست کیا تھا، یوریین ٹیوٹر برسوں مجھے پڑھاتی رہی، آہستہ آہستہ میں کالج تک پہنچ گئی۔ والد نے خاص طور پر میرے استاد سے کہا تھا کہ میرا بہت خیال رکھا جائے۔ اس زمانے میں مجھے پردے کا بہت اہتمام کرنا پڑتا تھا۔ ممی بغیر برقعے کے باہر نہیں جانے دیا کرتی تھیں۔ پہلی دفعہ برقعہ ہی میں میں کالج گئی۔ مسز نعمانی نے مزاح کے موڈ میں تھیں دیکھتے ہی بولیں "منیزہ تو کی دختر شہاب برہنہ ندیدہ تر آفتاب" میں اس پیروڈی کو سن کر بے اختیار ہنس پڑی پروفیسر نعمانی ہمیشہ مجھ پر مہربان رہا کرتی تھیں۔ ترقی کے دو وارنٹ پہلے ہی قدرت نے کاٹ دیے تھے۔ اب ایک اور آگیا یعنی

وہ مجھے اپنی تیسری لڑکی سمجھنے لگی تھیں۔ کالج کے ایک فنکشن میں شرکت کر کے میں گھر لوٹ رہی تھی کہ گاڑی ٹرک سے ٹکرا گئی۔ والد کو فون کیا گیا وہ بھیا کو لیکر جلد ہی آ گئے اور مجھے ہسپتال میں داخل کر دیا۔ ڈاکٹر دتّہ نے معائنہ کر کے کہا کہ خون دیا جائے گا۔ دیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں بیہوش نہیں تھی سب کچھ سن رہی تھی بھیا نے کہا کہ جتنے خون کی ضرورت ہو میری رگوں سے نکال لیا جائے۔ لیکن ان کا خون میرے موافق نہیں تھا اور تاخیر مناسب نہیں تھی ڈاکٹر پرویز کرنل دتّہ کے اسسٹنٹ تھے اور آپریشن ٹیبل کے قریب موجود تھے ایک دم رپورٹ دیکھ کر بول اٹھے۔

میرا خون ان کے لیے بالکل موزوں ہے۔

کرنل دتّہ نے ایک خاص اندازِ نگاہ سے دیکھ کر — آپ ہی دیجیے۔

پرویز کا خون میری رگوں میں داخل کر دیا گیا۔

نہ جانے اس میں کتنی روح بھری ہوئی تھی کہ میں تر و تازہ ہو گئی۔ ایک ایک بوند مجھے زندہ کرتی جا رہی تھی۔

چند روز وارڈ میں رکھ کر مجھے ڈسچارج کر دیا گیا۔ پرویز مجھے دیکھنے گھر آتے رہے۔ دو ایک دفعہ کرنل دتّا بھی آئے انھوں نے ایک ٹانک بھی لکھ دیا تھا اس سے تندرستی بحال ہو گئی اور بقول ممّی کے میں دوبارہ جی اٹھی، پرویز بڑے شریف اور مہذب نوجوان تھے ان کے مردانہ حسن میں وقار کے ساتھ ساتھ دلکشی بھی تھی۔ جسم نہایت سڈول تھا۔ اعضا سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

بھیا پرویز سے جلد ہی گھل مل گئے۔ ممّی کو ان کا بہت

ہی خیال رہتا تھا۔ جب کوئی اچھی چیز پکاتیں ان کو ضرور بھیج دیا کرتیں شام کا کھانا تو وہ اکثر ہمارے ہی یہاں کھایا کرتے تھے۔ پرویز خاندان کے ایک فرد معلوم ہونے لگے تھے۔ اکثر عزیزوں کو یہ خیال بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ ممیّ انھیں داماد بنانے والی ہیں۔ ایک رات ڈنر ٹیبل پر لوگ بیٹھنے ہی والے تھے میں بھی ایک کرسی کی طرف بڑھنے ہی والی تھی کہ ممیّ نے آنکھ کے اشارے سے روک دیا۔ مجبوراً میں کمرے میں چلی گئی اور مطلب سمجھ کر زور زور سے میرا دل دھڑکنے لگا۔ چھاتی میں دھونکنی سی لگ گئی۔ ممیّ نے والد اور بھیا کے سامنے ڈاکٹر پرویز کو مخاطب کیا۔

بیٹا میں تمھیں گود لینا چاہتی ہوں۔

آفتاب کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں۔

میرا مطلب نہیں سمجھے تم پرویز!

اوہ معاف کیجیے ممیّ بڑا غبی ہوں ذرا دیر میں سمجھا آپ چاہتی ہیں کہ میں منیزہ کو اپنا لوں، تجویز بہت اچھی ہے، حسن و جمال میں منیزہ کا جواب نہیں ہے۔ میں اپنے کو خوش قسمت سمجھتا اگر آپ کا حکم مان سکتا؟

— مگر کیا۔ میں اگر مگر ایک نہیں سنوں گی۔

سننا پڑے گی ممیّ۔ میں کہہ رہا تھا کہ میرے اور منیزہ کے بیچ میں لہو کا دریا حائل ہے۔

کیسا دریا؟

ان کی نسوں میں میرا لہو دوڑ رہا ہے وہ میری شریک حیات نہیں بن سکتیں۔ عمر کے لحاظ سے آپ کچھ بھی کہیں مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا اور ان کا رشتہ باپ بیٹی کا ہے۔ میں کمرے میں بیٹھی

ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ پرویز کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میرا سارا بدن سن ہو گیا۔ جیسے انھوں نے اپنا خون سود سمیت میرے جسم سے نکال لیا ہو۔ میں نیم بے ہوش سی ہو گئی۔ بیٹیل ٹاک جاری رہی۔ بھیا اور والد بالکل نہیں بولے۔ ممّی اور پرویز میں بحث ہوتی رہی۔ ممّی نے علمی دلائل اور سماجی مثالوں سے انھیں قائل کرنا چاہا۔ مگر پرویز نے جو کہہ دیا تھا اسی پہ جمے رہے۔ ان کا مجسمہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا ان کی ہر چیز مجھے پسند تھی، ان کا لہجہ، نرم نرم الفاظ سنجیدہ مگر شرمگیں سی مسکراہٹ سے جوہی کے شگوفوں کی سی بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی رہتی تھی۔ غرض ان کی ہر آن میرے دل و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ صرف یہ ہٹ کہ میں ان کی بیوی نہیں بن سکتی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ وہ عام طور پر رات کو ہمارے یہاں آیا کرتے تھے لیکن میں ہر لمحہ اور ہر پل ان کے پیروں کی آہٹ پر کان لگائے رہتی تھی، ان کے انتظار میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ نہ آتے تو سینے میں ایک آگ سی دہک اٹھتی۔ اور میں نے اسی آگ کو محبت سمجھ رکھا تھا۔ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی سانس لینے لگتا۔ ایسا لگتا کہ مر رہی ہوں۔ اسی درمیان میں پرویز کا ترقی کے ساتھ دوسرے ضلع میں تبادلہ ہو گیا۔ چلتے وقت وہ اپنی عادت اور معمول کے خلاف ۱۱ بجے دن کو رخصت ہونے آئے۔ انھیں فوراً نئی جگہ پہنچنا تھا۔ بڑی عجیب شان سے آئے گھبرائے اور بوکھلائے ہوئے مگر ہونٹوں پر وہی دلفریب مسکراہٹ، آنکھوں میں شرافت کی چمک اور چہرے پہ شگفتگی پھولوں کی سی شگفتگی اور تازگی جی چاہا خوب لپٹ کر روؤں اتنے آنسو بہاؤں کہ لہو کا دریا پانی

ہو جائے۔ لیکن یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ عورت کتنی ہی ترقی پسند ہو مشرقیت اس کی روح سے چمٹی ہی رہتی ہے۔ ان کے جاتے ہی میں انفرادیت پسند بن گئی سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ تنہا کمرے میں پڑی رہتی۔ لائبریری میں رومانی ناولوں میں کھوئی رہتی۔ المیہ ناولوں کا پڑھنا میرا دلچسپ مشغلہ تھا۔ انہیں پڑھتے پڑھتے کبھی روتی کبھی ہنستی اچھی خاصی ہسٹیریا کی مریضہ بن گئی۔ وہ چلبلاپن اور ظرافت کا موڈ بالکل غائب ہو گیا۔ اسی سال والد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایک آفت سے مر کر بھی نہیں بچی تھی کہ دوسری آفت آن پڑی ممی نے بھیا کی شادی کر دی تھی میری انہیں بہت فکر تھی لیکن مجھے حیات انددواجی سے نفرت ہو گئی تھی ممی سے صاف کہدیا تھا کہ میں مرتے دم تک شادی نہیں کروں گی اس موضوع پر کبھی مجھے نہ چھیڑا جائے۔ پرویز عید پر صرف گھنٹہ بھر کے لیے آئے پھر کبھی انھوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ خط سے معلوم ہوا کہ امریکہ جا بسے ہیں ویزا تیار ہو چکا ہے جلد ہی چلے جائیں گے۔ وہ چلے گئے ان کے جاتے ہی میں نے یہ اسٹوڈ کھول لیا دن بھر شیشوں کو جوڑ کر ان کی تصویریں بناتی رہتی ہوں۔ پتا نہیں انھوں نے بیاہ کیا یا نہیں اور نہ جانے کس حال میں ہیں۔

باقر صاحب نے اہم ہی الفاظ نوٹ کر لیے اور بولے۔ کل ان کے متعلق کچھ بتاؤں گا۔ اگلے دن باقر صاحب آئے اور کہنے لگے ڈاکٹر پرویز بچو انہیں عورتوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں ویسے بہت کامیاب ہیں اقتصادی حالات بھی اچھے ہیں لیکن خاموش رہتے ہیں۔ سکون میسر نہیں آتا لہو کے دریا کو تیر کر پار کرنا ان کے امکان میں نہیں۔

رام لعل

ریل کا مال

اقبال چند گھنٹہ دوستوں کی محفل میں تاش کھیلتے کھیلتے حسبِ معمول اپنے بارے میں باتیں بھی کر رہا تھا۔

دو کل میں پرتاب گڑھ سے مال گاڑی لے کر لوٹا تو بھیراواں اسٹیشن پر مجھے بیس مسافروں نے گھیر لیا۔ ان کی لکھنؤ کی گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ سب کی گٹھری میں بیٹھی تھی۔ میں بھلا ایسے موقعوں سے کب چوکتا ہوں؛ بھرے سب کے سب بریک میں! بیس روپے مار لیے!"

یہ کہہ کر وہ زور سے ہنس پڑا اور داد طلب نگاہوں سے اپنے ساتھیوں کی طرف بھی دیکھا۔ گورا چٹا رنگ، چاندی کی سفید بال کا بار بار ناک کے بانسے پر کھسک آنے والا موٹے فریم کا چشمہ، یک پتا پھینک کر بولا۔

آج صبح منّی کو امین آباد لے گیا۔ ایک دوپٹہ لیا اُس نے، ایک شیشی نیل پالش کی دھوپ کا چشمہ اور کئی چھوٹی چھوٹی الم غلم چیزیں!

امر سنگھ نے ترپ لگا کر سارے پتے سمیٹ لیے اور کہا۔

"تمھاری نوکری مزے کی ہے کھنہ اوپر سے بھی کافی آمدنی ہو جاتی ہے! اپنا حال تو بہت بُرا ہے۔ مہنگائی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ دن بھر دفتر میں گر گٹ گر گٹ کرتے گزرتی ہے۔ لوٹتا ہوں تو گھر میں بیوی گر رگٹ گر رگٹ شروع کر دیتی ہے۔

یہ سن کر ساری محفل ہنس پڑی۔ کھنہ نے بھی قہقہہ لگایا۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا۔ بولا "میری نوکری ہے تو بیشک مزے کی۔ لیکن کچھ اپنا دل گردہ بھی مضبوط ہونا چاہیے۔ سب گارڈ تھوڑے ہی کما سکتے ہیں! سالے دکشت کو دیکھو۔ درجن بھر بچوں کا باپ ہو گیا۔ پیسہ کمانا آج تک نہیں آیا۔ سوسائٹی سے قرض لے کر پس گیا ہے۔"

رام داس نے بیڑی کا کش کھینچا اور بہت سنجیدگی سے بولا۔ "تمھارا اور دکشت کا کیا مقابلہ! وہ بیچارا اُوپر سے ایک پیسہ تک نہیں کما سکتا لیکن شکل وصورت سے چور معلوم ہوتا ہے۔"

سب ہنس پڑے۔ کھنہ نے عینک کو ناک کے بانسے پر جمایا اور کہا "ایک دن یہی ہوا یا صل! ہم دونوں بریک سے نکلے۔ میرے تھیلے میں کچھ ٹماٹر اور انار تھے۔ اس کے تھیلے میں یونی فارم۔ سامنے سی آئی ڈی کا انسپکٹر کھڑا تھا۔ لیکن میں بالکل نہ گھبرایا۔ اس سالے کا رنگ بالکل زرد! خیریت ہوئی باہر آ گئے۔ میں نے اس کی گردن پر دھول جمائی سالے! تجھے کیا ہو گیا تھا؟

بولا۔ تمھارے پاس جو تھیلا تھا میری جان اسی وجہ سے نکلی جا رہی تھی۔ تو یہ حال ہے اس کا ایک تو اپنی شکل و صورت اچھی ہے دوسرے جذبات پر اتنا قابو ہے۔

"کیوں نہیں! کیوں نہیں کھنہ صاحب! رستوگی نے بھی بیڑی سلگا کر ہاں میں ہاں ملائی۔

رام داس نے سارے پتے سمیٹتے ہوئے کہا۔

"کھنہ اب شادی کر ڈالو منّی کی! سیانی ہو گئی"

"کر ڈالوں گا بھائی! کون سی جلدی پڑی ہے۔ ابھی تو انٹر میں داخلہ لیا ہے۔ بی اے کرنے تب تک چار پیسے بھی جمع ہو جائیں گے۔

رام صورت نے ہتھیلی پر رکھا ہوا تمبا کو پھانکا اور صلاح دی۔

"تمھارے لیے پیسہ کمانا کون بڑی مشکل ہے گارڈ صاحب! اب کوئی روز ایک آدھ گار بیج ڈالو نا کپڑے یا سیمنٹ کی"

کھنہ کو غصہ آ گیا۔ دور ریلوے کوارٹروں سے پرے ایک ٹیم کی آڑ میں سر جھکائے سرخ سگنل پر نظر جما کر بولا۔

"میں ایک ہی بار میں ہڑپ کر جانے میں یقین نہیں رکھتا۔ کم کھاتا ہوں لیکن دامن بچا کر: یہاں تو قدم قدم پر سی آئی ڈی کے آدمی چھپے کھڑے رہتے ہیں! ابھی پچھلے ماہ کا قصہ ہے میں نے ایک خالی ویگن کے اندر بکھری ہوئی مونگ کی دال کی سو میننگ بوری میں بھروالی۔ اٹھوا کر اپنی بریک میں لے آیا تو ریلوے پروٹیکشن فورس کا ایک حوالدار لپک کر آیا۔ بہت باتیں کیں سالے نے۔ مجھے بند کرا دینے کی دھمکیاں تک دے ڈالیں۔ میں بھی اس کی ایکٹنگ دیکھ دیکھ کر دل میں ہنستا رہا۔ جب دیکھا کہ اب تو سچ مچ ہی رپورٹ کر دے گا۔ میں نے ایک روپیہ اس کی جیب میں ڈال

دیا۔ بس ساری ہیکڑی بھول گیا۔ سچ کہتا ہوں دم ہلاتا ہوا بریک سے نیچے اتر گیا۔

گوردت مصرا جو الگ چارپائی پر لیٹا ان کی باتیں خاص طور سے سن رہا تھا اُٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ بولا۔

کھنہ صاحب آپ کو یاد ہوگا پار سال جب ایک لوٹے ہوئے بکس میں سے بولٹ نکالنے پر ایک سینگ نے میری رپورٹ کی تھی اور دو سو روپے دے دلا کر کسی طرح جان بخشوائی تھی۔ پچھلے مہینے وہی سینگ کپڑے کی ایک گانٹھ کاٹتے ہوئے دھر لیا گیا۔"

کھنہ نے زور سے ترپ کا پتا پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ریل کا مال ہے پیارے! سمجھو ایک جنگل ہے جنگل! جو شکار مار کر لے جائے وہی شیر ہے!"

رام صورت نے کہا۔

"اس دن لوگا ڈصاب! بریک میں بڑے زوروں کی لونڈیاں پھنسائے رہے!!

"ارے وہ بھی ریل کا مال تھا رام صورت! ریل میں کیا نہیں مل جاتا۔"

بہت سارے قہقہوں کے درمیان جوزف نے بھی کچھ کہا جسے کوئی نہ سن سکا۔ رام صورت نے اس سے پوچھا۔

"کا کہت ہو جوزف صاب! تم بھی کسی لونڈیا کے چکر میں ہو کا؟"

جوزف کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ جاگی۔ بولا۔

"لونڈیا۔! میاں اپنی میم صاحب کے لیے ایک سایہ بنوانے کے لیے پیسے نہیں سالی ہر وقت کان کھاتی رہتی ہے۔"

"ارے جوزف بھائی! اپنی میم صاحب کو میرے پاس بھیجو نا

اس کی سب خواہش پوری کردوں گا۔“

”تو تو سالا حرامی ہے۔“

قہقہوں کا شور کم ہوا تو رام صورت نے جوزف سے کہا۔

”اپن گر بیبن کی تو ایسے ہی بیٹھے گی! یہاں کوئی سہرا گارڈ، کوئی ٹکٹ بابو، کوئی مال بابو! یہ لوگ شادی بھی کرتے ہیں اپنے بچوں کی تو راجا لوگوں کی ٹکر کی۔“

”کھنہ تم نے پہلی دو لڑکیوں کی شادی خوب دھوم دھام سے کی تھی۔“

”دھوم دھام! اوپر کی آمدنی سب کو تھوڑی ہی نصیب ہوتی ہے۔“

جوزف کی آنکھوں میں شدید اداسی اتر آئی۔

کھنہ نے جواب دیا۔

”اگر چار پیسے پاس نہ ہوں تو لڑکیوں کے لیے اچھے بر بھی نہیں ملتے۔ ریل کے بابو بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔“

معاً گوارٹروں کے پھاٹک پر سائیکل کی گھنٹی بجی۔ سب ادھر دیکھنے لگے۔ ”آگیا بھئی ادمی! اب کھیل جمے گا۔“

”آؤ بھئی ادم پرکاش! تمہارے بغیر تاش میں جی نہیں لگ رہا تھا۔“

”کہاں گیا تھا تو ادم! میں تیری تلاش میں دو بار اسٹیشن پر گیا تھا۔ دن کی ڈیوٹی تھی نا آج تیری۔“

درمیانے قد کے پتلے بدن اور خوبصورت شکل و شباہت کے نوجوان نے ان کے قریب پہنچ کر سائیکل کو ایک دم بریک لگادی ایک پاؤں ان کی ایک چارپائی پر ٹکادیا تھا۔ آگے ہینڈل پر پڑے نیلے گرم کوٹ میں سے سگریٹ تلاش کرتے ہوئے

ایک چبھتی ہوئی نگاہ کھنہ پر ڈالی۔ اور پھر امر سنگھ سے کہا۔
"ڈیوٹی یہاں کون سالا کرتا ہے! ہم تو یہاں کے داماد ہیں۔ داماد! اپنا کام دن بھر حرام خوری! ادھر ادھر سے دو چار بلا ٹکٹ مسافر پھانس لینا، دس بیس بنانا اور پھر اپنا ریسٹوران اور چائے!"

رام صورت نے کہا "کیوں نہیں عیش کرے گا سالے! نہ جورو نہ کوئی اور!"

"آپ بیٹھو تو اوم پرکاش! دو چار ہاتھ فلاش کے ہو جائیں"۔ کھنہ نے اسے دعوت دی۔

"یار میں تو پانچ ابھی ہار کے چلا آرہا ہوں!"

وہ سائیکل سے اتر کر پھر بیٹھ گیا۔

کھنہ رام جی داس اور گوردت مہر آگے آگے سرک گئے۔ باقی پیچھے ہٹ گئے۔ تماشائی کی سی حیثیت سے بیٹھ گئے کسی کے چہرے پر اداسی تھی کسی کے مسرت۔ جوزف رام صورت کی گود میں سر رکھے بیڑی پیتا رہا۔ رام صورت تمباکو پھانک پھانک کر جوزف کے کان میں کھنہ اور دوسرے لوگوں کی اوپر کی آمدنی کے قصے سناتا رہا۔ اس سے قبل بھی وہ کئی لوگوں کو حسد اور حسرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ سُنا چکا تھا۔

سکّے چھن چھن بج رہے۔ نوٹ ڈالا جارہا تھا۔ بلائنڈ پر بلائنڈ کی جارہی تھی ہاتھوں میں بلا کی پھرتی آگئی تھی۔ اور آنکھوں میں ایک شدید حریص چمک!

"ارے تم بھی کو دونا میکسیمہ! تم تو پارسل بابو ہو"
دونا بھائی! ہم تو بس نام کے پارسل بابو ہیں۔ اوپر کی کمائی

ہمارے لیے پاپ ہے۔"

"واہ کیا کہنے سوامی جی یوں کیوں نہیں کہتے کہ کبھی چانس نہیں ملتا۔"

اس پر سب نے قہقہہ لگایا۔ سکینہ کھسیا گیا۔ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔

اچانک اُدھر سے تین لڑکیاں گزریں۔ سب کی توجہ اُن پر مرکوز ہو گئی۔ ان میں ایک لڑکی کھنّہ کی تھی۔ اونچی پیتلی باپ کی طرح سرخ و سفید، گردن میں پیازی نائیلون کا دوپٹہ ڈالے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھائے، قمیص کی طرح لمبی سیاہ چوٹیاں لہراتی ہوئی وہاں سے گزری۔ اوم پرکاش نے صرف ایک جھلک دیکھ کر ہی ڈبل بلائینڈ کر دی۔ اسی وقت وہاں مقبول آگیا۔ پرانا لیکن خوب اچھی طرح پریس کیا ہوا کوٹ اور پتلون پہنے بغل میں دو موٹی موٹی کتابیں دبائے بالوں کو کئی روز سے بغیر تیل لگائے سنوارتا رہا تھا۔

"آؤ مولانا! کوئی تقریر کرو گے یا یوں ہی تشریف لے جاؤ گے؟"

اوم پرکاش کے مذاق پر سب ہنس پڑے۔ رام صورت نے چونے کی ڈلی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہاری یونین کا کیا ہے مقبول بھائی! کچھ تنخواہ ونخواہ بڑھی کہ ناں؟"

"یہ کیا تنخواہ بڑھوائیں گے رام صورت! ان کا تو بس کام ہے ادھر ادھر سے چندہ بٹورنا، دوسرے تیسرے مہینے الٹی سیدھی اپیلیں اور پوسٹر چھاپ دینا اور بس! ہو چکا یونین کا فرض پورا! موقع ملے تو افسروں سے مل ملا لینا اور آگے بڑھ جانا

جیسے رام چند اب ویلفیر انسپکٹر بن چکا ہے"۔
کھنہ نے ہار کر پتّے پھینک دیے۔ اور پھر تتّیسی نکال کر سب کی طرف دیکھنے لگا ناک کے بانسے پر بہت نیچے کھسک آتے ہوئے چشمے کے ساتھ۔ اور پھر مقبول کی طرف دیکھ کر بولا۔
"اماں کچھ کہو ورنہ اپنا رستہ ناپو، تمھارے منحوس سائے نے تو مجھے ہرا دیا ہے"۔
مقبول ایسے ہتک آمیز جملے سن کر سرخ ہو گیا۔ بولا۔
تم لوگوں کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ تم لوگ اکٹھے ہو کر پہاڑ سے ٹکرا سکتے ہو۔ یہ بری عادتیں چھوڑ دو یہ تمھیں اندھیرے اور تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یونین کی میٹنگ میں شرکت کیا کرو تمھیں اپنے سامنے بہتر تنخواہ اور اعلیٰ زندگی کا تصور رکھنا چاہیے"۔
"اماں جاؤ کسی دن اس کلرکی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ ہمارا تاش کا مزہ کرکرا کر دیا!"
رام جی داس کی ڈانٹ سن کر مقبول سر جھکائے اپنے کوارٹر کی طرف ہو لیا۔ اسی وقت اوم پرکاش نے ایک اور بازی جیت کر سب پتّے اور اپنے روپے اپنی طرف گھسیٹ لیے کھنہ جھلا کر بولا "میرا دھیان تو پتّوں کی طرف رہا ہی نہیں تھا۔"
"ہاں کھنہ صاحب! وہ مقبولوا بیچ میں آکر کھڑا ہو گیا تو سب کچھ چوپٹ ہو گیا۔
یہ کہہ کر رام صورت نے جوزف کو کہنی سے دبایا اور ہنس دیا۔ جوزف نے بیڑی کے دھوئیں سے ایک حلقہ بنایا

جو سب کے عین سر پہ پہنچ کر فضا میں دھیرے دھیرے تحلیل ہونے لگا۔

"میں کچھ روپے اور منگوا لوں گھر سے" یہ کہہ کر کھنہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے منّی کو آواز دی۔ اُس کا کوارٹر نکڑ پہ تھا باپ کی آواز سن کر منّی باہر نکل آئی۔ ایک اچٹتی نگاہ اوم پرکاش پر ڈالی۔ پھر سرخ چہرے کے ساتھ باپ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کہیے ڈیڈی!"

"بیٹا ذرا اپنی ماں سے دس بیس روپے لے آؤ۔"

"منّی چند ہی منٹوں بعد بیس روپے لے کر آ گئی۔ اس کا چہرہ اسی طرح لال تھا۔ وہ اوم پرکاش کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ باپ کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر خوشامد کے لہجے میں بولی۔"

"آپ بھول تو نہیں گئے ڈیڈی! آج پکچر دیکھنے جانا ہے۔"

"پہلے تاش سے تو فرصت ملے منّی!"

"منّی ایک ادا سے سر جھٹک کر وہاں سے چلی گئی۔"

تاش کا میدان پھر گرم ہو گیا دو ساتھی کھیلنے کے لیے اور شامل ہو گئے۔ ریلوے کوارٹروں پہ آنے جانے والوں کا سلسلہ ہر وقت لگا رہتا تھا۔ کوئی ڈیوٹی پوری کر کے کاندھے پہ کوٹ ڈالے تھکا ماندہ بے دلی سے قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا، کوئی اپنی تازہ پریس کی ہوئی یونیفارم میں چمکتے ہوئے بوٹ پہنے لیکن شیو چہرے کے ساتھ مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ چوراہے پہ تاش کھیلنے والوں کے پاس کوئی نہ کوئی

رک ہی جاتا تھا۔ جس کے پاس تھوڑا سا بھی وقت اور روپیہ ہوتا وہ اپنی قسمت آزمانے دو چار بازیاں کھیلنے کے لیے بیٹھ ہی جاتا تھا۔

شام ہو گئی۔ رام جی داس کی بیوی ترکاری کا تھیلا لا کر خاوند کے پاس پٹک گئی۔ کہہ گئی۔

"کچھ پکوانا ہو تو لا دو ورنہ میں تو پڑ کے سو رہی ہوں۔"

امر سنگھ خود نہیں کھیل رہا تھا پھر بھی تماشائی کی حیثیت سے وہاں کتنی دیر سے جما ہوا تھا۔ گورو دتہ کو اس کا بوڑھا باپ کتنی بار پکار چکا تھا۔ رام صورت کی ماں اس کے بن ماں کے دو بچے اس کے پاس چھوڑ کر رسوئی بنانے چلی گئی تھی۔ جوزف کی بیوی کے دو دوست آ گئے تھے تو جوزف کو مجبوراً ان کے ساتھ اٹھ کر جانا پڑا۔

ہارتے ہارتے اوم پرکاش بھی سب روپے ہار گیا۔ وہ چوٹ کھا کر جلدی سے اٹھا۔ یہ کہتے ہوئے "ابھی کوئی مت ہلے میں اور روپے لے کر آتا ہوں کوارٹر سے"

کھنہ خوش تھا کہ اس کی شکست کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ اُس نے بہت سے روپے جیت لیے تھے۔

اوم پرکاش نے لوٹنے میں دیر لگا دی۔ ایک لڑکے کو اسے بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس لڑکے نے لوٹ کر واویلا کیا۔ "وہاں تو بھیڑ لگی ہے کسی نے منی کو چھیڑا ہے!"

سب کے سب اٹھ کر ادھر بھاگے۔ تاش کی گڈی وہیں پڑی رہ گئی۔

اوم پرکاش پسینہ پونچھتا ہوا اپنے کوارٹر سے نکلا۔ اُس کی

پتلون کی ایک جیب پھولی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا بھئی اوم پرکاش"

اوم پرکاش رام جی داس کو ایک طرف لے گیا۔ اُس کے کان میں رازدارانہ لہجے میں بولا۔

"سالے بڑے انٹلکچول بنتے ہیں۔ رہتے مفلسوں کی طرح ہیں لیکن عشق بڑے لوگوں کی لڑکیوں سے کرتے ہیں۔ لیکن میں اسے کامیاب تھوڑی ہونے دوں گا۔ اُس پر میرا حق ہے صرف میرا!"

یہ کہہ کر اوم پرکاش پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ رکھے مقتول کے پاس گیا جو بھیڑ کے درمیان لوگوں کو یہ بتانے میں مصروف تھا میں نے کھنہ صاحب کی لڑکی کو ادھر سے روتے ہوئے جاتے دیکھا اس کے پاس دوپٹہ نہیں تھا۔ میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ "کیا ہے امنی!"

"تم جھوٹ بولتے ہو! تم نے منی سے کوئی اور بات کہی تھی۔ میں اسے ابھی بلا کر یہاں لے آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اوم پرکاش جلدی جلدی کھنہ کے گھر کی طرف چلا۔ اس کا ہاتھ اب بھی پتلون کی پھولی ہوئی جیب پر تھا۔

.... ⁂ ....

ریاض تاثیر

دو طوفان

یہ چٹھی رساں معلوم نہیں کس وقت آتا ہے۔

یہ خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکتا ہے۔ اور میں جلدی سے گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں۔ ساڑھے دس بجے ہیں — یہ ابھی ساڑھے دس ہی ہوئے ہیں۔ لیکن یہ تو بڑی دیر کی بات ہے۔ جب میں نے گھڑی دیکھی تھی۔ اس وقت دس بجکر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اور آج یہ کہیں گھڑی تو نہیں رک گئی۔ میں بڑی بے دلی سے کلائی کان تک لے گیا۔ گھڑی بڑی مستعدی سے چل رہی ہے۔ ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ کتنے سکون سے چل رہی ہے۔ جیسے اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔

لیکن یہ چھٹی رساں معلوم نہیں کب آتا ہے ۔ کسی روز تو ساڑھے گیارہ بجے ہی پہنچ جاتا ہے اور کسی روز اس سے پانچ دس منٹ آگے پیچھے ۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے آنے میں ابھی پورا ایک گھنٹہ باقی ہے ۔ ایک گھنٹہ پورے ساٹھ منٹ ۔ اور میرے لیے ایک ایک منٹ اتنا طویل ہو رہا ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا ۔

___ میں پھر گھڑی دیکھتا ہوں ۔ تین منٹ اور گزر گئے ہیں . تین منٹ اور کم ہو گئے ہیں ۔ خیر یہ وقت بھی گزر جائے گا ۔ پھر چھٹی رساں آئے گا وہ مجھے وہ پارسل پہنچا دے گا ۔ شامی مصوّر کی زندگی کی بہترین تصویر کا پارسل ۔ جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے ایک عرصے تک صبح ناشتے میں انڈے کھانے چھوڑ دیے تھے اور اپنی زندگی کی اس پہلی خرید کی ہوئی تصویر کے لیے میں نے اس طرح پیسے جمع کیے تھے ۔

شامی کی تصویریں بڑی عجیب ہوتی ہیں ۔ شبنم کی طرح لوچدار اور ___ شگوفوں کی طرح حسین ۔ لیکن معلوم نہیں شامی کی تصویروں میں اتنا حسن کہاں سے آ جاتا ہے ۔ شامی آرٹسٹ تھا لیکن اس کی اپنی زندگی بڑی گھناؤنی تھی ۔ وہ بڑا ہوس پرست انسان تھا . لیکن میں نے ہمیشہ اس کی تصویروں کو اس کی زندگی سے ہٹ کر دیکھا ہے ۔ معلوم نہیں میں نے اس کی پہلی تصویر کہاں اور کس وقت دیکھی تھی ۔ یہ عرصہ کی بات معلوم ہوتی ہے ۔ اور یہ تصویر ___ اس تصویر کے متعلق تو شامی نے خود لکھا تھا کہ زندگی بھر وہ جن لڑکیوں سے مل چکا تھا ان میں سب سے زیادہ حسین ۔ معلوم نہیں اس تصویر میں کیا ہے لوگ

اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور میں باوجود کوشش کے یہ تصویر آج تک نہیں دیکھ سکا۔

خیر آج تو یہ ابھی کچھ دیر میں ہی مجھ تک پہنچ جائے گی لیکن یہ چٹھی رساں معلوم نہیں کس وقت آتا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے یا اس سے پانچ دس منٹ آگے پیچھے۔

میں ایسے ہی آسمان کی طرف دیکھتا ہوں۔ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے بے ڈول سے ٹکڑے تیر رہے ہیں۔ پچھلے تین دن کی بارش کے بعد مطلع آج ہی صاف ہوا ہے اور نیلی دیوارو پر اب جہاں کہیں بھی دھوپ پڑتی ہے۔ پانی کے ہلکے ہلکے انجرات اڑ رہے ہیں میں اس صحن کی مشرقی دیوار کے ساتھ سائے میں کرسی بچھائے بیٹھا ہوں۔

میں نے ایک دفعہ پھر کلائی اٹھا کر وقت دیکھا۔ پونے گیارہ ہو چکے ہیں۔ بارہ طویل منٹ اور گزر گئے۔ انتظار کتنی عجیب چیز ہے۔ یعنی میں نے پرانے دن کتنے سکون سے گزارے ہیں۔ شامی نے یہ تصویر آج سے کئی سال پہلے بنائی تھی اور اس تمام عرصہ میں گو کہ یہ تصویر دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا رہا ہوں لیکن پھر بھی میں نے اپنے آپ کو کبھی اتنا بے چین نہیں محسوس کیا جتنا کہ آج۔ آج تو دل جیسے سینے میں اچھلا پڑتا ہے۔ آج تو دل کی ایک ایک دھڑکن محسوس ہو رہی ہے۔ یہ کم بخت گھڑی کی سوئیاں کتنی سکون سے چل رہی ہیں۔

میں گھڑی والی کلائی اپنے سامنے رکھ لیتا ہوں۔
ایک منٹ — دو منٹ — تین منٹ۔ گیارہ بجنے میں

پانچ منٹ باقی ہیں۔ اب تو بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ جہاں دو گھنٹہ کا یہ طویل عرصہ کٹ گیا ہے۔ یہ آدھ پون گھنٹہ بھی کٹ جائے گا۔ سورج اب کافی بلند ہو گیا۔ دیوار کا سایہ سمٹ کر بہت چھوٹا رہ گیا ہے۔ اور دھوپ کی تپش اب سایے میں بھی محسوس ہو رہی ہے۔ میں آہستہ سے کرسی سے اٹھتا ہوں۔ اور کرسی کو بلند کرنے کے بعد دائیں ہاتھ میں اٹھائے اپنے کرائے کے مختصر سے مکان کے دائیں کمرے کی طرف بڑھتا ہوں ــــ یہ کمرہ میں سونے کے لیے استعمال کرتا ہوں۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے کرسی ایک طرف دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے میں کمرے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتا ہوں کمرے کو میں نے امکان بھر کوشش سے رہنے کے قابل بنا رکھا ہے۔ کارنس پر پرانے ساتھیوں کی تصویریں ہیں۔ کچھ تصویریں کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ لٹک رہی ہیں۔ اسی جنوبی دیوار کے ساتھ ایک چارپائی پڑی ہے جس پر دودھیا چادر بچھی ہوئی ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک تپائی رکھی ہے جس پر بڑی طشتری میں چنبیلی کے پھول ہیں۔

میں آ کر چارپائی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر میں چارپائی پر اس حالت میں دراز ہو جاتا ہوں کہ گھٹنوں کے نیچے میری ٹانگیں چارپائی سے نیچے لٹک رہی ہیں اور میرا سر کمرے کی جنوبی دیوار کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس کمرے میں میں نے اپنی زندگی کے کئی روشن اور تاریک دن گزارے ہیں کبھی اس طرح چارپائی پر نیم دراز ہو کر اور کبھی تکیے میں منھ

چھپا کے۔

دور جیل میں گیارہ کا گھنٹہ بجنے کی آواز آتی ہے۔ میں مزید اطمینان کے لیے گھڑی دیکھتا ہوں ۔ واقعی گیارہ بج گئے ہیں ۔ مجھے جیسے یقین نہیں آتا۔ اور اب تو بس پھر کوئی آدھ ایک گھنٹے کی بات ہے۔ اور پھر میرے ہاتھوں میں شامی کی تصویر ہوگی ۔ شامی کی تصویر جس کے لیے میں نے ایک عرصے تک انڈے کھانے چھوڑ دیے تھے۔ اور اسی طرح تھوڑی تھوڑی جمع کی ہوئی رقم میں نے اس ان دیکھے شاہکار کے لیے بھیجدی تھی۔

یہ میری زندگی کے چند اہم ترین لمحوں میں سے ایک ہوگا میں کتنی بے چینی سے پارسل کھولوں گا اور پھر تصویر کو دیکھنے کے بعد میری حالت کیا ہوگی۔ میں کتنی بے چین نظروں سے اسے دیکھوں گا۔ اور پھر کچھ دیر بعد میرے دل کی دھڑکنوں کو بھی سکون آجائیگا۔ جیسے طوفان آنے کے بعد دریا بڑی آہستہ خرامی سے بہنا شروع کر دیتا ہے۔

دریا ۔۔ میں کوئی مناسب ترکیب ڈھونڈنے لگتا ہوں۔ لیکن چھٹی رساں معلوم نہیں کس وقت آتا ہے۔

دس منٹ اور گزر گئے۔ اب تو ایک ایک لمحہ مصیبت ہوتا جارہا ہے۔ میں اپنی آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ اور دل میں گننا شروع کر دیتا ہوں ۔ تاکہ یہ اوٹ پٹانگ واہی تباہی سوچنا بند کر دوں ۔ معلوم نہیں کتنے سو اعداد گن چکا ہوں ۔ میں اپنی آنکھوں پہ سے ہاتھ ہٹاتا ہوں۔ میں ایک دفعہ پھر گھڑی دیکھتا ہوں۔ اب تو ساڑھے گیارہ

بجنے میں صرف تین منٹ باقی ہیں۔ تو بہت ممکن ہے کہ دس منٹ تک چٹھی رساں پہنچ جائے میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں ـــ میں بڑی بے چینی سے کمرے کا چکر کاٹتا ہوں ـــ

مزید وقت میں بیرونی دہلیز پہ کھڑا ہو کر گزارنا چاہتا ہوں۔ میں برآمدے سے گزر کر صحن میں آجاتا ہوں اور پھر بڑی کاہلی سے دھوپ میں سے گزر کر بیرونی دروازے تک پہنچ جاتا ہوں۔

میں نے دروازے کی دستی پہ ہاتھ رکھا ہے۔ میں دروازہ کھولتے کھولتے رہ جاتا ہوں ـــ میں ایک دفعہ پھر وقت دیکھتا ہوں۔ گیارہ بجکر بتیس منٹ ہو گئے ہیں ـــ میں بڑی تیزی سے دروازہ کھولتا ہوں۔ میرا ایک ہاتھ دروازے پہ ہے اور میں کھلے دروازے پہ کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اور میں گلی میں دیکھ رہا ہوں۔ چٹھی رساں عموماً اس طرف سے آتا ہے۔

دو منٹ اور گزر گئے ہیں۔

اور وہ دور کوچے میں چٹھی رساں نظر آتا ہے۔ میں اسے دیکھتے ہی بھاگنے لگتا ہوں ـــ میں بھاگتے بھاگتے اچانک رک جاتا ہوں۔ شاید کسی کے دیکھ لینے کے ڈر سے ـــ اب میں تیز تیز قدموں سے چل رہا ہوں ـــ چٹھی رساں میری طرف دیکھتا ہے ـــ اور پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھنے لگتا ہے۔

"آپ کا ایک پارسل ہے"

چٹھی رساں ایک چھپے ہوئے کاغذ پر پنسل سے نشان بناتے ہوئے مجھے دستخط کرنے کو کہتا ہے۔ میں جلدی جلدی دستخط کرتا ہوں۔ چٹھی رساں مجھے پارسل تھما دیتا ہے۔

"ٹھہریے آپ کا ایک خط بھی ہے۔"

میں خط لے کر جیب میں ڈال لیتا ہوں۔

میں پارسل یوں کا توں لیے اپنے کمرے میں آجاتا ہوں مجھے اپنے سینے میں دل کی دھڑکنیں تیز تر محسوس ہو رہی ہیں۔ میں پارسل میز پر رکھتا ہوں اس پر بہت سی رسیاں لپٹی ہوئی ہیں۔ اور کئی ایک مہریں بڑی بے ترتیبی سے لگی ہوئی ہیں۔ میں بلیڈ لیکر رسی کاٹتا ہوں ــــ میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر کانپنے لگتے ہیں۔ میں رسیاں اور کاغذ کھولتا ہوں۔ گتے کا ایک بڑا خوبصورت سا ڈبہ بر آمد ہوتا ہے۔ ڈبہ کھولنے پر کاغذ کی لاتعداد تہیں بر آمد ہوتی ہیں۔ اور کاغذوں کی آخری تہ کے نیچے میری آرزوؤں کا مرکز ہے۔ یہ وہی تصویر ہے جس کے لیے میں نے ایک عرصے تک انڈے کھانے چھوڑ دیے تھے۔

میرے ہونٹ مسرت سے کپکپا رہے تھے۔

یہ ایک نوجوان لڑکی کی تصویر ہے جو ایک جھیل کے کنارے دلدل میں شلوار کے پائینچے اڑسے کھڑی ہے۔ ہوا سے اس کے دوپٹے کے پلو اڑ رہے ہیں۔ پس منظر میں بادلوں کے بے ڈول ٹکڑے تیر رہے ہیں۔ بادل کچھ اس انداز سے بنائے گئے ہیں کہ لڑکی کا دوپٹہ اور ان میں لڑکی بہت زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے یہ واقعی شامی کی زندگی کی حسین ترین لڑکی ہوگی۔ اس کے ہونٹوں پر مونالیزا کی سی مسکراہٹ بکھری ہوئی ہے۔

شاہی نے اس تصویر کو کوئی نام نہیں دیا۔ اسے ناموں سے چھوڑ دیا ہے۔ وہ اسے کیا نام دے سکتا تھا۔ یہ تو حسنِ مجسّم ہے مجھے امید ہے یہ لڑکی شاہی کو کہیں اس کی تصویروں کی نمائش میں ملی ہوگی یا۔ پھر اس نے اسے بہت دنوں تک اپنے قریب رکھا ہوگا اور اس تصویر سے اس نے اسے غیر فانی بنا دیا لیکن! لیکن!؟؟

میرے خیالات بھٹکنے لگتے ہیں۔

شاہی کی اپنی زندگی بہت گھناؤنی ہے۔ میں نے گھبرا کر گھڑی دیکھی ہے۔ ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ اور یہاں چھٹی رساں نے مجھے ایک رقعہ بھی تو دیا تھا۔ میں جلدی سے جیب سے خط نکالتا ہوں۔ میں خط لکھنے والے کے بارے میں کسی قسم کے اندازے لگانے کے بجائے لفافہ چاک کرتا ہوں۔ سیالکوٹ سے انوار بھائی کا خط ہے۔

انھوں نے اپنی آمد کے متعلق لکھا ہے، وہ آج ہی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ بھابی بھی اُن کے ساتھ آرہی ہیں۔ گاڑی یہاں سوا بارہ بجے کے قریب پہنچتی ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن سے پھاٹک تک کا فاصلہ نصف گھنٹے کا ہے۔ تو اس کا مطلب ہوا کہ وہ یہاں ایک بجے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ میں ایک دفعہ پھر گھڑی دیکھتا ہوں۔ ایک بجنے میں بیس منٹ ہیں۔ لیکن انوار بھائی نے مجھے دو ایک روز پہلے کیوں نہ اطلاع دیدی۔ ممکن ہے ان کا پروگرام ہی کچھ اچانک طور پر بن گیا ہو۔ یا ممکن ہے میں ایک دفعہ پھر خط پڑھتا ہوں۔ خط بڑا ہی مختصر ہے۔ انور بھائی کے پہلے خطوں سے بھی زیادہ مختصر۔

"مجھے افسوس ہے کہ اتنے دنوں تمھیں خط نہیں لکھ سکا۔ تمھاری بھابی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ اب وہ بخیر ہیں۔ ہم دونوں تمھارے پاس پہنچ رہے ہیں۔ ان کی تصویر نہ بھیجنے کے لیے نادم ہوں۔ لیکن اب تو وہ خود ہی تمھارے پاس پہنچ رہی ہیں۔ تصویر کی کیا ضرورت ہے۔ باقی باتیں ملنے پر ہوں گی"

خدا حافظ

بھابی کو میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ در اصل انوار بھائی کی شادی ہی کچھ اس قسم کے حالات میں ہوئی تھی کہ میں شامل نہ ہو سکا۔ اب تو میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ انوار بھائی اس چالیس سے بھی اوپر کی عمر میں شادی کریں گے لیکن چھ ماہ ادھر مجھے بالکل اچانک طور پر ان کا خط ملا۔ جس میں انھوں نے اپنی اس عجیب و غریب حالت میں ہونے والی شادی کے بارے میں لکھا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ زلفی ان سے دو ہفتہ پیشتر لاہور میں ملی تھی اس کے بعد انھوں نے اپنی کسی بھی بات سے متعلق کچھ نہیں لکھا تھا۔ بس یہی کہ دو ہفتہ کے غور کے بعد انھوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور وہ اس بندھن میں بندھ گئے۔ انھوں نے زلفی کی تصویر بھیجنے کا وعدہ کیا تھا جو اس چھ ماہ کے عرصے میں بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ اور اب تو وہ۔ بس ابھی کوئی دیر میں خود میرے پاس پہنچ رہے ہیں۔ زلفی بھابی کے ہمراہ۔ میرے لیے یہ کس قدر خوشی کا موقع ہوگا۔ میں نے پھر گھڑی دیکھی ہے۔ ایک بجنے والا ہے۔ بس وہ میرے پاس پہنچ ہی رہے ہوں گے۔ میں جلدی سے دوسرے کمرے میں پہنچتا ہوں۔ اور کمرے کی چیزیں درست کرنے لگتا ہوں۔

اور ــــ باہر دروازے پر دستک ہو رہی ہے ــــ میں دوڑ کر باہر پہنچا ہوں۔

"سلام انوار بھائی ــــ اور ــــ اور بھابی۔"

وہ ایک ڈھیلا سا لباس پہنے ہوئی ہے۔ دوپٹہ بڑی بے پروائی سے اس کے کندھوں پر لٹک رہا ہے۔ اور اس کے کناروں پر اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ اس کی آنکھوں میں ملکوتی حسن ناچ رہا ہے۔ اور اس کے ہونٹوں پر مونالیزا کی سی مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ اور اس کے چہرے پر ــــ میں کوئی مناسب ترکیب ڈھونڈنے لگتا ہوں۔

"کہو کیسے ہو؟" ایک کوئل کی سی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے۔ "اوہ اندر چلیے۔"

میں انھیں بائیں کمرے میں لے آیا ہوں۔ میری آنکھوں میں آنسو جھولنے لگتے ہیں۔ میں نے انھیں کرسی پر بٹھا دیا ہے۔

"میں ابھی حاضر ہوا۔" میں یہ کہہ کر پھر دائیں کمرے میں آ گیا ہوں۔ میرے ذہن میں خیالات کا طوفان اُمڈ رہا ہے۔ زلفی ــــ یہ تصویر اور شامی مصور ــــ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ لیکن انوار بھائی کو اس کا کچھ علم نہیں ہونا چاہیے۔

میں لپک کر جلدی سے تصویر اٹھاتا ہوں ــــ اور ایک ہی جھٹکے میں اسکے دو ٹکڑے کر دیتا ہوں۔ اور خود اوندھے منہ بستر کے تکیے میں منھ چھپا لیتا ہوں۔ ساتھ کے کمرے میں زلفی کی مترنم ہنسی کی آواز اب بھی آ رہی ہے۔

ــ ۲ ــ

جمیل زبیری

درد کی انجمن

لوگوں نے بڑے بڑے خوبصورت مکانات اور بنگلے تعمیر کرا لیے ہیں۔ بڑی اونچی اونچی بلڈنگیں کھڑی کر لی ہیں۔ لیکن جہاں میں رہتا تھا۔ اس کے سامنے کا حصّہ بالکل ہوائی جہاز کے اگلے حصّہ کا نمونہ تھا۔ اتنا مشابہ کہ اگر ہم سامنے کی طرف اس کو دیکھیں تو بالکل ایسا احساس ہوتا تھا جیسے کسی ہوائی جہاز کے اگلے حصّے کے سامنے کھڑے ہوں۔ اس میں دونوں جانب دو بڑی کھڑکیاں تھیں۔ اس کے رنگ بھی بالکل پی آئی اے کے ہوائی جہازوں کی مانند تھے۔ البتہ اس میں اس سمت کوئی دروازہ نہ تھا۔ ادھر سے گزرتے ہوئے مجھے بھی اکثر سوچا کرتا تھا کہ بھلا مکان بنانے کا یہ کون سا

ڈھنگ ہے اور دل ہی دل میں مالک مکان کی اس حماقت پر ہنستا تھا۔ مکان کی چہار دیواری کے قریب قریب گھنی جھاڑیاں لگی تھیں۔ ایسی گھنی جھاڑیاں جن میں کبھی کوئی پھول نہیں کھلتا۔ ان کی بڑھوار کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس گھر میں مالی کا کوئی گزر نہیں تھا۔ میں نے ہمیشہ وہاں سناٹا ہی دیکھا اور کبھی کسی شخص کو اس مکان سے برآمد ہوتے یا اندر جاتے نہیں دیکھا۔ لیکن وہ مکان خالی نہیں تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر کبھی پردے پڑے ہوتے تھے کبھی وہ بند ہوتی تھیں اور کبھی پردے ہٹے ہوتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس مکان میں کوئی رہتا ضرور ہے۔ مگر زندگی کے بظاہر کوئی آثار نہ تھے۔

لیکن کچھ عرصے بعد اس گھر میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ایک روز وہاں صفائی ہوتے ہوئے بھی دیکھی، اور مکان کی چہار دیواری کے باہر خاردار جھاڑیاں پڑی دیکھیں جنہیں کاٹ کر صاف کر دیا گیا تھا۔

پھر ایک شام جب سورج غروب ہو گیا تھا اور رات کی سیاہی آہستہ آہستہ اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس بختہ "ہوائی جہاز" کی کھڑکی میں ایک انسانی چہرہ دیکھا۔ ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی ــــ اس کو دیکھا میرا تجسس بڑھا۔ اور ایک عجیب سا احساس ہوا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی چیز سرسراتی ہوئی سی محسوس ہوتی۔ نہ معلوم یہ کسی طرح کا خوف تھا یا کچھ اور ــــ

بہرحال اس وقت میں مکان کے سامنے سے تیزی سے گزر گیا۔ اور دل ہی دل میں اس گھر اور اس کے مکینوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

کئی ہفتے یوں ہی گزر گئے۔ پھر ایک روز شام کو جب میں واپس آ رہا تھا تو دور ہی سے مجھے شور کی آواز سنائی دی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس مکان کی جانب چلا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے، کوئی چیخ رہا تھا، کوئی دوڑ رہا تھا، کسی کے ہاتھ میں ریت تھی، کسی کے ہاتھ میں بالٹی۔ اس ہوائی جہاز نما عمارت کے پچھلے حصے میں آگ لگی ہوئی تھی، اُسے بجھایا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ ایک طرف جہاں کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ جھکے ہوئے تیز تیز کچھ بول رہے تھے۔ میں غیر ارادی طور پر مجمع کو چیرتا ہوا اُنکی طرف بڑھتا رہا پتھروں پر کوئی دس برس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کے سر اور منہ سے خون نکل کر جم گیا تھا اور وہیں اس لاش کے کنارے ایک شخص بالکل ساکت سر پکڑے بیٹھا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ شاید اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ میں نے قریب ہی کھڑے ہوئے ایک شخص سے آہستہ سے پوچھا "کیا ہوا" اس نے کہا "مکان میں آگ لگ گئی ہے اور یہ لڑکا اس کھڑکی سے گر کر مر گیا ہے۔"

فائر بریگیڈ آ چکا تھا اور اب آگ پر قابو پا لیا گیا تھا۔ میں نے غور سے اس ہوائی جہاز نما عمارت کی طرف دیکھا۔ لیکن مجھے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ یہ عمارت اتنی اونچی نہ تھی کہ وہاں سے نیچے گر کر کوئی مر جائے، پھر یہ لڑکا

مر کیسے گیا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ لوگ اس کی لاش اٹھا کر اندر لے گئے، جو شخص اب تک اس کے قریب خاموش بیٹھا تھا اب لوگ اس کو سہارا دیکر آہستہ آہستہ اندر کی طرف لے جا رہے تھے۔ مجمع میں مجھے ایک جانی پہچانی شکل دکھائی دی۔ میں کوشش کر کے اس کے قریب پہنچا۔ اور اس سے اس شخص کے متعلق پوچھا، اس نے بتایا کہ جسے لوگ سہارا دیکر اندر لے گئے ہیں وہ اس لڑکے بختاور کا باپ ہے احمد دین۔ اتنا کہہ کر وہ بھی گھر کے اندر چلا گیا اور میں اسی طرح حیران کھڑا رہ گیا۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے، پھر آہستہ آہستہ مجمع چھٹنے لگا۔ اور محلے کے لوگ واپس چلے گئے۔ کچھ لڑکے چہار دیواری پر بیٹھے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

اتنے میں ایک شخص اندر سے دو کرسیاں لیے ہوئے باہر آیا اور لڑکوں سے کہا "آپ لوگ بھی اندر سے کرسیاں لے آیئے" آہستہ آہستہ کچھ کرسیاں، ایک چوکی اور ایک پلنگ باہر ڈال دیے گئے اور ان پر لوگ بیٹھ گئے۔ میں نے بھی ایک کرسی لے لی۔ اب بالکل خاموشی ہو گئی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ اندر سے کسی کے رونے کی آواز نہیں آئی۔ ایک بچے کی موت تو ایسی نہیں ہوتی۔ ذرا دیر بعد ایک کار میں کچھ خواتین بختاور کے چچا کے ہمراہ آئیں اور وہ لوگ اندر چلے گئے۔ اس کے بعد رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی زور زور سے کہہ رہا تھا۔ انھیں رلاؤ۔ انھیں مارو۔ ان سے کہو تمھارا بیٹا مر گیا ہے۔ تمھارا بیٹا مر گیا ہے۔ کافی

دیر بعد چلا چلا کر رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ احمد دین چلا چلا کر کہہ رہا تھا "اس کے بہت چوٹ لگ گئی ہے۔ بختاور بیٹے تمھارے کہاں زیادہ چوٹ لگی ہے۔ بولو۔ بیٹے بتاؤ۔ بتاؤ۔

پھر بختاور کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔ لوگ اس کا جنازہ اٹھا کر لے گئے۔ اس کے باپ کا تڑپنا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ یہی کہے جا رہا تھا۔ اسے کہاں لے جا رہے ہو۔ ڈاکٹر کو یہیں بلا لاؤ۔ اس کے چوٹ لگ گئی ہے۔ انھیں لوگوں نے مضبوطی سے تھام لیا اور اندر لے گئے۔ انھیں جنازے کے ساتھ نہیں جانے دیا گیا۔ میں قبرستان سے واپس گھر آ گیا۔ پتا چلا کہ پورے محلے میں اسی کا چرچا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے حالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فضا میں ایک عجیب سی پراسرار کیفیت تھی۔ مجھے رات بھر نیند نہ آئی۔

اگلے دن صبح ہی میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ باہر کرسیوں پر چار پانچ آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک صاحب سے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی۔

احمد دین ایک خوش باش، باذوق اور محنتی آدمی تھے جس وقت ان کی شادی ہوئی تھی ان کا پورا گھر بھرا ہوا اور آباد تھا۔ ان کے والد و والدہ، ان کے نانا اور ان کی خالہ سب ہی زندہ تھے۔ ان کی بیوی نہایت سلیقہ مند اور سمجھدار عورت تھی۔ پھر نہ معلوم اس خاندان کو کس کی نظر کھا گئی۔ یکے بعد دیگرے کئی اموات ہوئیں جس میں ان کے نانا، ان کے ماں باپ ایک ایک کر کے سب ہی فوت ہو گئے۔ میاں بیوی اکیلے رہ گئے۔ کچھ عرصے بعد ان کے ہاں ایک بچہ ہوا جس کا انھیں بڑا ارمان تھا۔ مگر

کچھ ہی دن بعد وہ بچہ پیلا ہونا شروع ہوا۔ انھوں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر وہ نہ بچ سکا۔ اور ایک دن وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی میں دبا آئے۔ پھر ہر دو سال بعد ان کے ہاں بچے پیدا ہوتے رہے اور اسی طرح مرتے رہے یہاں تک کہ پانچ بچے ختم ہو گئے۔ ان کی بیوی دکھ برداشت کر کر کے دیوانی سی ہو گئی۔ انھوں نے علاج کے لیے کوئی جتن نہ چھوڑا یہاں تک کہ جادو۔ اور لوٹنے ٹوٹکے تک کیے۔

پیروں کے مزاروں پر گئے، منتیں مانیں، تعویذ گنڈے کیے مگر سب لاحاصل۔ کچھ عرصے بعد ان کے ہاں پھر ایک لڑکے کی ولادت ہوئی۔ انھوں نے پھر ایک نئے عزم اور نئی امیدوں سے اسے پالنا شروع کر دیا۔ ہر قسم کی احتیاط برتی۔ ہزاروں روپیہ صرف کیا۔ بچے کا خون بدلوایا گیا۔ کیوں کہ اب یہاں اسپتالوں میں چند ہوشیار ڈاکٹروں نے بچے کو ہسپتال میں رکھا اور جب بچہ خطرے کی عمر سے نکل گیا تو دونوں میاں بیوی کی خوشیاں پلٹ آئیں۔ انھیں پھر سے زندہ رہنے کا سہارا مل گیا۔ سارا کام کاج چھوڑ کر وہ دونوں دن بھر بچے کے ساتھ کھیلتے اس کا دل بہلاتے۔ یہاں تک کہ وہ دو برس کا ہو گیا۔

دن سکون سے گزر رہے تھے کہ ایک دن ان کی بیوی کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور بس چند گھنٹوں میں ہی سب کچھ ختم ہو گیا۔ جس بچے کی خاطر زندہ رہی تھی اُسے چھوڑ کر آج وہ بھی چلی گئی ——!

احمد دین بختاور کو ماں بن کر پالتے رہے۔ اب ان کی زندگی کا صرف ایک ہی مرکز تھا انھیں بچے سے اتنی شدید محبت تھی کہ

وہ لمحہ بھر کے لیے اس سے جُدا ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسے خود اسکول پہنچاتے اور خود ہی اپنے ساتھ واپس لاتے۔ انہیں کسی پہ بھروسا نہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ گھنٹوں کھیلا کرتے جب وہ اور بچّوں کے ساتھ کھیلا کرتا تو سامنے بیٹھے اُسے دیکھا کرتے اور اُن کے دل میں مسرتوں کے سوتے پھوٹتے رہتے۔ وہ کبھی کبھی اس سے پوچھتے "بیٹا تو بڑا ہو کر کیا بنے گا"

"میں پائلٹ بنوں گا ابّا" وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا۔

"نہیں پائلٹ اچھی ملازمت نہیں ہوتی" وہ کہتے۔

"میں پائلٹ ہوں ابّا۔ دیکھیے میں یوں ہوائی جہاز اُڑاؤں گا" وہ اشارے سے بتاتا "پھرور.... پھرار.. وہ جیسے پی آئی اے کا جہاز اڑتا ہے نا........ بس اسی طرح اڑایا کروں گا۔

وہ اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتے اور چُپ ہو جاتے وہ دل ہی دل میں سوچتے ابھی بچّہ ہے سمجھتا نہیں کہ پائلٹ کی زندگی کتنی پُرخطر ہوتی ہے۔ ان کے ماں باپ کے دل ہر وقت مٹھی میں ہوتے ہیں۔ خیر کوئی ہرج نہیں جب بڑا ہو گا تو اسے سمجھالیں گے۔

ایک شام بختاور اپنے ہم عمر دو بچّوں کے ساتھ کھیل رہا تھا احمد دین سامنے بیٹھے ہوئے اسے کھیلتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ چند منٹوں کے لیے وہ مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ جب واپس لوٹے تو بچّے غائب تھے۔ وہ ایکدم گھبرا گئے۔ انھوں نے بختاور کو پکارا ادھر اُدھر دیکھا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا سوچا شاید کھیلتے کھیلتے

گیٹ کے باہر چلا گیا ہو۔ باہر آکر دیکھا، مگر وہ کہیں نظر نہ آیا سڑک پر سناٹا تھا۔ ان کے سانس کی رفتار تیز ہونے لگی وہ تقریباً دوڑتے ہوئے پڑوس میں گئے وہاں جاکر پوچھا۔ بختاور وہاں بھی نہیں تھا۔ پھر وہ سڑک کی دوسری جانب گھر پر گئے جہاں کے بچوں کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا۔ زور زور سے گھنٹی بجائی ایک ملازم باہر نکلا۔ انھوں نے بچوں کے بارے میں اس سے پوچھا۔ اس نے کہا۔

"دونوں بچے گھر پہ ہیں۔ مگر بختاور یہاں نہیں آیا۔"

پھر کہاں ہے وہ۔ ان بچوں کو باہر بلاؤ میں ان سے پوچھوں گا۔ احمد دین نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

ملازم دونوں بچوں کو بلا لایا۔ احمد دین نے بڑی محبت سے ان سے پوچھا۔

"بیٹے بختاور تمھارے ساتھ کھیل رہا تھا وہ کہاں گیا۔"

ایک بچہ بڑی معصومیت سے بولا۔

"وہ تو ایک آدمی کے ساتھ اپنے چچا کے پاس چلا گیا تھا۔"

"چچا۔ کون چچا۔ اس کے چچا تو آج کل باہر گئے ہوئے ہیں۔" بچے نے کہا۔

"اس آدمی نے کہا تمھارے چچا وہاں دکان پر کھڑے ہیں۔ اور تمھیں بلا رہے ہیں۔ بس وہ اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

احمد دین وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ پھر وہ زور زور سے چیخنے اور رونے لگے۔ اس گھر کا ملازم گھبرا گیا۔ گھر کے تمام

لوگ باہر آ گئے۔ اڑوس پڑوس کے کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بہت سی عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل آئیں۔ لوگ بچے کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے، کوئی کار لیکر بھاگا، کوئی سائیکل پر اور کوئی اسکوٹر پر۔ اس تمام عرصے احمد دین تقریباً بے ہوش پڑے رہے۔

لوگ آس پاس تلاش کر کے واپس آ گئے۔ پھر کسی نے جاکر پولیس اسٹیشن رپورٹ درج کرائی۔ کچھ لوگ مختلف ہسپتالوں میں ڈھونڈتے رہے۔ ریڈیو سے اعلان ہوا۔ "ایک بچہ جس کی عمر چھ سال ہے سفید قمیص شلوار پہنے ہے، آنکھیں بڑی بڑی اور نیلی ہیں۔ ماتھے پر ہلکا سا چوٹ کا نشان ہے۔ کل شام سے غائب ہے۔ اگر کسی صاحب کو۔ اس کے متعلق علم ہو تو کسی قریبی پولیس اسٹیشن پر اطلاع دیں یا اس پتے پہ پہنچا دیں اطلاع دینے والے کو دس ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اعلان ختم ہو گیا۔" پھر ملے جلے فلمی گانے بجنے لگے۔ بچہ اغوا ہو چکا تھا۔ دس ہزار بھی لیکر پولیس کے جنگل میں کون پھنستا ہے۔

رات گزر گئی۔ پھر اگلا دن اور پھر اس سے اگلا دن۔ اخباروں میں اشتہارات معہ تصویر شائع ہوتے رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے کون نہیں جانتا کہ بیگار کیمپ جگہ جگہ کھلے ہوئے ہیں۔ اغوا شدہ بچوں اور دماغی طور پر ماؤف لوگوں کو فقیر بنا کر ان سے بھیک بٹورنے کے بڑے معقول انتظامات ہیں۔ ان کیمپوں میں بچوں کو رکھا جاتا ہے اور ان سے بیگار لی جاتی ہے۔ اغوا ہونے والی بچیوں کو دلالوں کے ہاتھ کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے اور آخر کار وہ طوائفوں کے کوٹھوں پہ پہنچ

جاتی ہیں۔۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔ کیونکہ prostitution تو بالکل
ختم ہو سکتا ہے۔ لیکن اب طوائفوں نے کوٹھے چھوڑ کر کوٹھیاں لے لی ہیں اور دھندا جاری ہے پہلے کوٹھے صرف ایک علاقے میں ہوتے تھے۔ اب ہر علاقے میں کوٹھیاں ہیں۔ آخر پیٹ بھی تو پالنا ہے۔ اور پیٹ پالنے کی کوئی نہ کوئی سبیل تو ہونی چاہیے۔

احمد دین اسی طرح روتا رہا اور بچے کو شہروں شہروں اور گلیوں گلیوں ڈھونڈتا رہا۔ بچے کے نام کا صدقہ و خیرات دیتا رہا ـــ مگر سب بے سود۔

پھر اپنے بچے کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس نے یہ گھر تعمیر کروانا شروع کیا۔ جس کا اگلا حصہ پی آئی اے کے جہازوں کی طرح تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ بختاور کو پائلٹ بننے کا بڑا شوق تھا میں اسے منع کرتا تھا۔ مگر میں اسے کیوں منع کرتا تھا۔ پائلٹ بننا تو ابھی بہت دور کی چیز تھی۔ کاش وہ واپس آجائے۔ میں اب اسے کبھی منع نہیں کروں گا۔ وہ پائلٹ ہی بن جائے۔

جب مکان تعمیر ہو گیا تو احمد دین گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھا اس جہاز نما عمارت کو دیکھا کرتا۔ اور اسے تصور میں بختاور، پائلٹ کا لباس پہنے جہاز کے کاک پٹ میں بیٹھا دکھائی دیتا۔

انہیں دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک روز احمد دین ایک سڑک کے کنارے کھڑا کسی رکشہ یا ٹیکسی کا انتظار

کررہا تھا۔ قریب ہی فٹ پاتھ پر ایک فقیر لیٹا تھا۔ اس کے سر سے پاؤں تک ایک میلی سی چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ صرف اس کے ہاتھ باہر نکلے ہوئے تھے جو بھیک مانگنے کے لیے فضا میں بلند ہوتے تھے۔ پھر ایک عجیب طرح کی آواز اس کے حلق سے نکلتی تھی اور ہاتھ پھر نیچے گر جاتے تھے۔ احمد دین کی توجہ اس آواز کی طرف مبذول ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر اس آواز پر غور کرتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ اٹھنے اور بھیک مانگنے کا عمل میکانکی سا تھا۔ ذرا دیر کے بعد اس کے ہاتھ اٹھنے بند ہو گئے اور وہ بالکل ساکت ہو گیا۔ احمد دین نے دیکھا فوراً ہی ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شخص جو غالباً اس علاقے میں فٹ پاتھ پر پڑے ہوئے معذور فقیروں پر نظر رکھنے کے لیے معمور تھا اور جس نے لال کنارے کی ہرے رنگ کی لنگی باندھی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر ایک انگوچھا پڑا ہوا تھا۔ اس فقیر کے پاس آیا اور اس نے اس کی کمر میں ایک لات ماری، فقیر کے دونوں ہاتھ پھر اسی طرح اٹھنے لگے اور وہی عجیب سی صدا آنے لگی۔ احمد دین سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے بڑھ کر اس شخص کا بازو پکڑ لیا۔ اور اس سے پوچھا۔ "ارے بھئی اس بیچارے کو کیوں مارتے ہو۔"

"چلو چلو تم اپنا کام کرو تم سے کیا مطلب۔" اس نے غصّے سے احمد دین کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ایک معذور انسان کے ٹھوکر مارتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تم کتنے ظالم اور بے حس انسان ہو۔"

جھگڑا بڑھنے لگا۔ فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے لوگ جمع

ہو گئے۔ احمد دین سب کو چیخ چیخ کر بتانے لگا۔ لوگ اس آدمی کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے مگر وہ ان سے بچ کر بھاگ نکلا۔ کچھ دیر تک دو چار لوگوں نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن وہ گلیوں میں جا کر کہیں گم ہو گیا۔ اسی دوران کسی نے اس فقیر پر سے چادر اٹھا دی۔ لوگوں نے دیکھا وہ ایک معذور لڑکا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں بیکار تھیں۔

لڑکے نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں۔ اور دونوں ہاتھ پھیلا کر چلا چلا کر پھر بھیک مانگنے لگا۔

احمد دین نے بھی اسے دیکھا۔ انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انھیں تو اس طرح کا ہر لڑکا بختاور معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھتے رہے۔ ان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھنے لگی۔ وہ بختاور تھا۔ وہ بختاور ہی تھا۔ پھر وہ لوگوں کو ادھر ادھر ہٹا کر زمین پر بیٹھ گئے اور بختاور کو سہارا دیکر اٹھایا۔ اور کلیجے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور منہ سے ایک کراہ جاری تھی۔ "میرا بختاور۔ میرے پیارے بیٹے۔ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تیرا کیا حال بنا دیا ہے۔ ان لوگوں نے"

پھر انھوں نے ان لوگوں سے کہا۔

"جائیں آپ لوگ جائیں۔ یہ بختاور ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے میں اسے لے جاؤں گا۔" وہ اس کو اٹھانے لگے بھیڑ بھاڑ دیکھ کر ایک سپاہی وہاں پہنچ گیا۔ لوگوں نے اسے پورا واقعہ بتایا۔ اس نے آگے بڑھ کر احمد دین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پوچھنے لگا کہ "یہ تمھارا بچہ ہے۔"

"وہاں یہ میرا لخت اور ہے"
"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟" سپاہی نے پوچھا۔
"کیا یہ بتانے کے لیے بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ یہ میرا کھویا ہوا بیٹا ہے جسے لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے"
"وہاں ثبوت تو دینا ہو گا۔ تمہیں تھانے چلنا پڑے گا"
احمد دین بولا۔ "چلو جہاں کہو میں چلنے کو تیار ہوں۔ مگر اسے ساتھ لے چلو"

اب تماشائیوں کو بھی احمد دین پر ترس آنے لگا تھا۔ سب نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر اُسے اٹھا کر سپاہی کے ہمراہ وہ تھانے چلے گئے۔ ایک تھانے سے دوسرے تھانے ٹیلیفون ہوئے۔ کئی سال پرانی رپورٹ نکلوائی گئی۔ کسی کے مشورے پر احمد دین تھانے کے انچارج کو ایک طرف لے گئے جہاں اس سے کچھ دیر راز دارانہ باتیں ہوتی رہیں۔ لوگوں نے احمد دین کو جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھا ۔۔۔ اور پھر وہ اپنے لختِ جگر کو لیکر گھر پہنچ گئے۔

پھر اس کا علاج شروع کیا گیا ڈاکٹروں نے اپنی سی کوشش کی گو اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگیں تو ٹھیک نہ ہو سکیں، لیکن وہ کوئی کوئی لفظ بولنے لگا۔

اور جب احمد دین نے اسے باہر لیجا کر ہوائی جہاز نما عمارت کا وہ حصّہ دکھایا جو انھوں نے اس کی یاد میں بنوایا تھا تو لختِ جگر پہلی دفعہ ہنسا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان میں اس عمارت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ابّا ابّا"۔ پھر اس نے اپنی طرف اشارہ

کر کے کہا۔

"پائلٹ .... ابا..... پائلٹ۔"

احمد دین کا کلیجہ کٹ گیا۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ..... اور آہستہ سے بولے۔

"بیٹے یہ ہوائی جہاز ہے۔ تم اس کے پائلٹ ہو۔"

محمود احمد قاضی

وائٹ پیپر کا ایک باب

وہ جب درّے کے راستے ادھر آئے۔
تو ان کی چمکیلی پشت والے گھوڑوں کے سم یہاں کی مٹی میں بھیگ چکے تھے۔ انھوں نے اپنی چوڑی پیشانیوں پر آئے پسینے کو اپنی تلواروں کی میانوں سے پونچھا۔ مگر گھوڑوں کی پیٹھ سے نیچے نہ اترے۔

اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیر کر وہ مسکرائے۔ کہ جیسے حاکم تخت پر بیٹھ کر آسودگی کے ساتھ مسکراتے ہیں۔
وہ تھکے ہوئے تو بجید تھے مگر اپنے سامنے پھیلے سبز میدانوں کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ انھوں نے سونے کے لیے بھی گھوڑے کی پیٹھ ہی پسند کی۔
جب وہ سو رہے تو اونچائی کا فخر ان کے چہرے کے ہر

مسام سے پھوٹتا تھا۔

اور اسی وقت سامنے سبز میدانوں کے درمیان چکنی مٹی سے لیپے ہوئے چبوترے پہ شیدے، فیقے اور حنیفے کی ماں دن بھر کی مشقت کے بعد تھک کر لیٹی تھی ـــــــ وہ اس وقت بھی پیٹ سے تھی۔

ابھی اسے کئی اور بیٹوں کو جنم دینا تھا۔

جب ماں نے نیند کی پہلی جھپکی لی تو اس کے بیٹے گندم کی کٹائی کا کام ختم کر کے چبوترے کی طرف چل پڑے ـــ ماں کے پاس پہنچ کر تینوں نے اس کی پیشانی کو چوما اور ماں سوتے میں مسکرائی ـــ تب ماں کی پیشانی سے چاند طلوع ہوا اور سارے میں ٹھنڈک چھا گئی۔

لڑکوں کے چہروں پر گندم کی لالی تھی۔

باپ ذرا پرے بیٹھا ہوا کپاس کی چھڑیوں کی مدد سے ٹوکرے بناتا ہوا بہت خوش ہوا۔ انھوں نے سونے کے لیے بھی گھوڑے کی پیٹھ ہی پسند کی تھی۔

مگر یہ سب زمینوں کو اپنی باہوں میں لیکر سوتے تھے۔ کہنے کو تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر گھوڑے کی پیٹھ اور زمین کی چھاتی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایسا فرق کہ شیدے فیقے اور حنیفے کی تو ماں تھی کہ جسے ابھی بہت سے بیٹوں کو جنم دینا تھا۔ مگر ان کی کوئی ماں ہی نہ تھی کہ ....

سرمئی صبح کو جب گھوڑے والوں کی آنکھ کھلی تو انھوں نے شیدے، فیقے اور حنیفے کو گندم کی کٹائی میں مصروف پایا۔ چبوترے پر ماں سوت کات رہی تھی ـــــ باپ

ٹوکرے بنا رہا تھا۔ وہ بار بار مڑ کر اپنے بیٹوں کی ماں کے پھولے ہوئے پیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ اس کے پیٹ سے سورج جھانک رہا تھا ۔۔۔ باپ کا چہرہ اس سورج کی روشنی سے دمک رہا تھا ۔۔۔ گھوڑے والوں میں سے ایک جو ذرا زیادہ چالاک اور پھرتیلا تھا۔ اس نے تینوں بیٹوں کے سر پر پہنچ کر اچانک چابک لہرایا ۔۔۔ وہ تڑپ کے ایک طرف ہو گئے ۔۔۔ گھوڑا سوار ہنستا ہوا چابک ہوا میں لہراتا ہوا جدھر سے آیا تھا ادھر چلا گیا۔

تینوں بہت دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ شام کو جب کٹی ہوئی گندم کے گٹھے انھوں نے سر پر اٹھائے۔ تو انہیں محسوس ہوا کہ آج ان سے گندم کم مقدار میں کاٹی گئی تھی وہ شرمندہ اور خجل نگاہوں کے ساتھ چبوترے کی طرف آئے ۔۔۔ باپ ٹوکرے بیچنے کے لیے کسی دوسری جگہ گیا ہوا تھا ۔۔۔ ماں حسب معمول سو رہی تھی۔۔۔ آج پہلی بار تینوں بیٹوں نے پیشانی کو نہیں چوا ۔۔۔ اور علیحدہ علیحدہ ہو کر کچھ سوچنے لگے۔

ماں اکیلی چبوترے پر سوتی رہی ۔۔۔ اس کی پیشانی کا چاند بجھا ہوا تھا۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز نے ہی اسے جگا دیا تھا۔

ماں نے کہا۔

شہیدے ۔۔۔ زمین پر پاؤں دھرے بغیر میرے قریب مت آنا ۔۔۔ فیقے ۔۔۔ جیفے! ماں چلّاتی رہی۔

جب گھوڑے کے اگلے دونوں پیر ماں کی چھاتی پر آٹکے۔

تو جو کچھ ماں نے دیکھا —
وہ صرف اس کی آنکھیں ہی بیان کر سکتی ہیں۔
کیوں کہ تاریخ کی کتابوں میں تو کچھ اور ہی لکھا ہے۔!!

سلطان جمیل نسیم

سنگ زادوں کی بستی میں

پھر یوں ہوا کہ سمندر کی گستاخ لہروں نے ساحل کے گریبان پر ہاتھ ڈالا، اور ساحل نے وہ ہاتھ جھٹک کر ہچکولے کھاتی ہوئی بادبانی کشتی کو سینے سے لگا لیا۔

اس کشتی میں سے ایک بوڑھا اترا جس کے بالوں پر سمندر کے جھاگ اڑتے تھے۔ جس کے پیروں میں لہروں کا ارتعاش سمٹا ہوا تھا۔ اور جس کی آنکھیں موتی دیکھنے کی تمنا میں صدف کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔

بوڑھا جب ساحل پر اترا تو اسے عجیب سماں نظر آیا۔ ساحل پر سنگریزوں کے بجائے لفظ بکھرے پڑے تھے لٹے پٹے۔ ٹوٹے پھوٹے۔ معنی کی آب کھو دینے والے لفظ۔ بوڑھا کچھ آگے بڑھا تو اسے وہ لفظ بھی نظر آئے

جن میں معنی کی چمک بھی تھی اور فقروں کی ساکھ بڑھا دینے کی قوت بھی۔

بوڑھے کی صدف جیسی آنکھوں نے لفظوں کے موتیوں کو پرکھنا شروع کر دیا۔ ایسے الفاظ جن کے معنی کی آب بالکل اتر چکی تھی۔ بوڑھے نے ان کو اٹھا کے ایک جانب رکھا کہ وہ ان کی عظمت رفتہ سے آگاہ تھا اور ثابت و سالم۔

آبدار لفظ وہ اپنے قلم جیسے ہاتھوں سے اٹھاتا رہا۔

ایک اجنبی بوڑھے کو دیکھ کر ساحل پہ موجود لوگ اس کے اطراف اکٹھا ہو گئے مگر وہ اپنے کام میں مشغول رہا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ لفظ چُنتا ہے اور اپنی جھولی میں ڈالتا ہے اور اس کی جھولی کسی بھوکے پرندے کی مانند ان لفظوں کو اس طرح اپنے پوٹے میں جگہ دیتی جا رہی ہے کہ وہ بوجھل ہی نظر نہیں آتا۔

جوں جوں وہ بوڑھا آگے بڑھتا جاتا تھا۔ لوگوں کی تعداد میں فاصلے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

جب وہ بستی میں پہنچا تو اس کے چاروں طرف ایک مجمع تھا۔ ایک بھیڑ تھی۔ اور اس ہجوم کی آنکھوں میں استعجاب و تجسّس کے ہزار واٹ کے بلب جل اٹھے تھے۔ اس روشنی میں انہوں نے بوڑھے کا جائزہ لیا تو وہ ان کو بالکل ویسا ہی نظر آیا جیسا وہ تھا۔ تب انھوں نے بلب بجھا دیے۔ اور سرگوشیوں کے زیرو پاور کے قمقمے روشن کر دیے۔

بوڑھے نے بستی کے لوگوں کے چہرے دیکھنے کے بجائے اونچی اونچی عمارتوں کو دیکھا۔ کارخانوں کی بلند و بالا چمنیوں پر نظر ڈالی۔

"وہ عجیب بستی ہے" بوڑھے کے ذہن پر سوچ کی پھوار پڑنے لگی۔
پھر اس نے ان لوگوں کے چہرے کی طرف دیکھا جو اس کو اپنے حلقے میں لیے ہوئے تھے۔

"ارے — یہ آدمی ہیں یا ہندسے" بوڑھے نے آنکھیں میچ کر دوبارہ کھولیں پھر وہ سمجھ گیا کہ یہاں لفظ کیوں بے قیمت ہیں۔ یہاں آدمی ہندسے کھاتا ہے۔ ہندسے جمع کرتا ہے۔ ہندسے بولتا ہے اور ہندسے لکھتا ہے۔ یہاں عمارتوں کی بھی تعداد ہے اور لوگوں کی بھی — یہاں مردم شماری بھی ہوتی ہے اور خانہ شماری بھی۔ یہاں کھیتوں میں سرمائے کی کھاد ڈالی جاتی ہے۔ محنت بوئی جاتی ہے۔ اور ہندسوں کی فصل کاٹی جاتی ہے۔

یہاں کارخانوں کی بھٹی میں مشقت اور سرمایے کا ایندھن ڈالا جاتا ہے۔

سرمایا دھواں بن جاتا ہے اور محنت ہندسوں میں ڈھل جاتی ہے۔

یہاں عمارتوں کی بنیاد ہندسوں پر رکھی جاتی ہے۔
بوڑھے نے خلاؤں کو آنکھوں میں سمیٹکر آہستہ سے کہا۔
"پروردگار — اپنی مصلحتیں تو ہی بہتر جانتا ہے کہ تو نے اس شہر پر ہندسوں کا عذاب نازل کیا ہے۔"

جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے تو وہ اس کے قریب ہوئے کہ شاید کچھ سن سکیں۔ مگر جب کچھ سمجھ نہ پائے تو انھوں نے پوچھا۔

"تم کون ہو؟"
پوچھنے والے لہجوں میں سکوں کی کھنک تھی۔ بوڑھے

کے لہجے میں صدیوں کے دکھوں کی جھنکار تھی۔

"میں تمہاری کھوئی ہوئی میراث ہوں"

میں روایتوں کے دیس سے آیا ہوں۔

اور میں جزیرۂ علم و ادب کی جانب سفر کر رہا ہوں۔

پھر ان لوگوں میں جو سب سے زیادہ سیانا تھا آگے بڑھا اور اس نے پوچھا۔

"بڑے میاں ــ جو کچھ ہم نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ میراث کسے کہتے ہیں ــ جزیرۂ علم و ادب اور روایتوں کا دیس کہاں ہے ــ ہمیں یہ سب کچھ معلوم نہیں"

بوڑھے نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بکھرے الفاظ سمیٹتا رہا۔

وہ سیانا پھر بولا۔

"تم یہ کیا بے قیمت چیزیں سمیٹ رہے ہو۔ ان پر ہماری عمارتوں سے اڑنے والی دھول اور ہمارے کارخانوں سے اٹھنے والے دھوئیں کی کالک جم چکی ہے۔ ہم تو ان سے بڑے پریشان ہیں کہ جب ان پر جمی ہوئی راکھ اُڑتی ہے تو ہماری شفاف پوشاکوں کو کثیف کر دیتی ہے اور تم ان کو اس طرح اٹھا رہے ہو جیسے یہ کوئی قیمتی پتھر ہوں ــ اگر تم ضرورت مند ہو تو پیسے مانگو ــ بھوکے ہو تو ــــ بھی پیسے مانگو کہ یہاں پانی بھی بے قیمت نہیں ملتا ــ"

یہ سن کر بوڑھے کے سینے میں ہوائیں سنسنانے لگیں۔ پر ملنے مستولوں کی طرح اس کے بازو جھولنے لگے ــ اس کا سارا وجود ڈانوا ڈول سا ہو گیا ــــ مگر اس نے

ضبط کی پتوار تھامی اور کہا۔

"تمہارے گلے میں لاعلمی کے طوق پڑے ہیں اسی لیے تمہاری رنگت سونے جیسی ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ہیروں کی چمک سما گئی ہے۔ تمہاری صداؤں میں دولت کی جھنکار بس گئی ہے اس لیے تمہاری سماعتوں میں حرف سننے کی استطاعت نہیں رہی ——"

وہ سیانا پریشان ہو کر بولا۔

"بڑے میاں —— تم نے جو کچھ کہا وہ ہم نہیں سمجھ سکے۔ اس لیے کہ ہم نے صرف اُتنے لفظ محفوظ رکھے ہیں جن سے ہماری ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ باقی ہم نے پھینک دیے ہیں —— ہماری دانش گاہیں اس بات کی تحقیق میں مصروف ہیں کہ ہم جلد از جلد کیسے ان باقی لفظوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ ابھی تم نے جو کچھ کہا۔ ان میں سے بہت سے لفظ ہمارے ذہن کے لاکرز میں محفوظ ہیں —— ہم —— سونے، ہیرے اور دولت کی قدر و قیمت سے خوب واقف ہیں —— مگر اور تم نے جو کچھ کہا وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا"

پھر ان لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"کیا تم کسی خزانے کی بات کر رہے تھے؟"

دوسرے نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا تمھیں کسی سونے یا چاندی یا ہیرے کی کان کا پتا معلوم ہے؟"

اب بوڑھے کے ہاتھ سے بے نیازی کی لاٹھی چھوٹ گئی۔

وہ وہیں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور اس کی صدف جیسی آنکھیں آنسوؤں کے موتیوں سے بھر گئیں۔

"میرے خدا — تو مجھے استقامت عطا فرما کہ میں ان لاعلموں کے شہر سے یہ سارے لفظ سمیٹ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی کشتی میں اس جزیرے تک لے جا سکوں جہاں قرطاس قلم الفاظ کی بھوک میں تڑپ رہے ہیں۔"

ان لوگوں میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا —

"کیا اس بوڑھے نے خدا کا نام لیا ہے —؟"

"ہاں — اس نے بھوک کا نام بھی لیا ہے۔"

"مجھے تو یہ کوئی بزرگ آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن مجھے یہ کمیونسٹ لگتا ہے۔"

"نہیں مجذوب ہے بیچارا —"

"مجذوب ہے؟"

"ہاں"

پھر اس غول میں سے دو آدمی نکلے اور بوڑھے کے قریب بیٹھ گئے اور بڑی لجاجت سے کہنے لگے۔

"بابا — یہ جو ڈھیر سارے لفظ یہاں بیکار پڑے ہیں یہ سب ہم اٹھا کر تمھاری جھولی میں ڈال دیں گے — کوئی نمبر بتا دو بابا۔"

"نمبر —!"

"ہاں بابا — بتا دو نمبر —"

بوڑھے نے غور سے ان دونوں کو دیکھا، مسکرایا اور کہا۔

"تمھیں نمبروں کی کیا ضرورت ہے۔ تمھاری بستی میں روشنی کھا کر اندھیرا اگلنے والی فلک بوس عمارتیں دو چار نہیں سیکڑوں ہیں۔ جن میں ہزاروں نمبروں کے کمرے موجود ہیں —

تمھارے صنعتی کارخانے دس بیس نہیں ہزاروں ہیں جو نمبر ڈھالتے ہیں — پھر تمھیں ......

پھر انھوں نے بوڑھے کی بات اچک لی۔

"دو چار — شکریہ بابا — دس بیس — مہربانی — بابا مہربانی —"

اور دو چار — دس بیس کی گردان کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

بوڑھے نے حیرت سے انھیں بھاگتے ہوئے دیکھا — پھر گردن جھکا کر تمام بکھرے ہوئے لفظ اپنی جھولی میں ڈالے اور ساحل کی طرف پلٹ گیا۔

مجمع میں سے کسی نے کہا —

وہ جا رہا ہے۔

ہاں — وہ جا رہا ہے۔

اسے روک لو —

کیا خبر وہ لفظ قیمتی ہوں جو وہ اٹھا کر لے جا رہا ہے۔

ناسمجھ ہو۔ لفظوں کی قیمت کون چکاتا ہے۔

اور جب بپھرے ہوئے سمندر کی زبان اس کی بوسیدہ کشتی کو چاٹ گئی تو بستی والوں نے اپنی دانش گاہ کا رخ کیا۔

جب دانش گاہ کے سربراہ نے ساری داستان سنی تو کہا۔

"آپ لوگوں کا شکریہ کہ یہ اطلاع یہاں تک پہنچائی۔ آپ کی خواہش کے مطابق میں ابھی دانش گاہ کے بڑے افسران کی ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کیے دیتا ہوں جو کھوئی ہوئی میراث — جزیرۂ علم و ادب نے

روایتوں کا دیس ـــــ قرطاس و قلم کی بھوک اور بادبانی کشتی میں آنے والے بوڑھے کے بارے میں پوری پوری معلومات جمع کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس تمام تحقیقات میں طویل عرصہ اور کثیر سرمایہ لگے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا گرانٹ کمیشن ہماری ضرورتوں کا خیال رکھے گا۔

فردوس حیدر

بے نام مہرے

آج پھر وہ دیر سے گھر آیا۔
تمام دن تقریریں کرتے ہوئے اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔
اسے مکمل اعتماد تھا کہ اس کی سیاسی پارٹی کا منشور دوسری تمام سیاسی پارٹیوں سے بہتر ہے اس نے منشوروں اور نظریوں کے ہجوم میں پورے شعور سے نظریے کا انتخاب کیا تھا اور اپنا منشور مرتب کیا تھا اسے سیاست کے نام پر انسانوں کا استحصال پسند نہ تھا۔ وہ عوام کو احمق نہیں معصوم جانتا تھا وہ معاشی ناہمواریوں اور غیر منصفانہ تقسیم دولت کا شدید مخالف تھا مگر سرمایہ داروں سے جبراً سب کچھ چھین لینے کے حق میں بھی نہ تھا۔ وہ ایک مستحکم معاشی نظام اور مثالی معاشرے کے وجود کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تعصب سے دور رکھتا تھا کہ

اسے آدمیت کا احترام عزیز تھا، وہ اپنی پارٹی کے بُرے افراد کو بُرا اور مخالف پارٹی کے اچھے افراد کو اچھا کہنے کی جرأت رکھتا تھا۔ اور وہ مطمئن تھا کہ اس کی پارٹی کے کارکن فعال ہیں اور تعصّب دور کرنے میں اس کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

"تعصّب ہماری قوم کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے" اس نے دبے پاؤں صحن میں قدم رکھتے ہوئے سوچا اور اس کی نظر اپنے والد اور چچا پر پڑی جو ملگجے اندھیرے میں شطرنج کی بساط بچھائے اپنی نظریں مہروں پر گاڑے ماحول سے بے خبر بیٹھے تھے اسے اپنے گھر کے ان دو بزرگوں سے سب سے زیادہ یہی گلہ تھا کہ وہ عملی سیاست میں حصّہ نہ لیتے تھے۔

"شطرنج۔ مہرے۔ بساط" یہ سارے الفاظ تو ہمیشہ سیاست سے تاریخ کے صفحات پر منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اور یہ میرے بزرگ جیسے صدیوں سے اسی طرح ایک مہرہ دوسرے مہرے سے لڑاتے رہے ہیں، ان کے خانے بدلتے رہے ہیں۔ لیکن نہ انھوں نے ان مہروں کی چال بدلی اور نہ بساط کے خانے ..... اور خود ایک مہرہ بن گئے جو ملگجے اندھیرے میں اپنے اپنے خانوں میں رکھے ہوتے ہیں اور وہ اپنی مقررہ چال پر چال چل رہے ہیں۔ اُس نے ناگواری سے اُن پر ایک سرسری نظر ڈالی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ اس کی الماری کے سامنے کھڑی کپڑے سنبھال رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر اس نے گھوم کر دیکھا تو اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں مگر اُس نے مصنوعی خفگی کا خول چڑھا لیا۔

"ریاض ۔۔۔ آج پھر سارا دن جلسے ہی میں گزار کر آئے ہو نا؟" اُس کے لہجے میں خفگی اور افسردگی دونوں شامل تھے۔

"تمھیں کس نے بتایا؟"

"تمھارے کپڑوں کی مٹی، بالوں کی پریشانی اور چہرے کی تھکن نے۔ اس کے بعد کسی اور گواہی کی ضرورت ہے؟"

وردہ کے جواب کے بعد مزید بحث کی گنجایش نہ رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے شلوار قمیص ہاتھ میں لی اور غسلخانے کی طرف چلا گیا۔

وردہ شاید نہیں جانتی کہ زندگی بڑی قیمتی اور بڑی مختصر ہے اسے برتنا اور شعوری طور پہ برتنا ہر انسان کی ذمہ داری ہے۔ مگر وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ مجھے سکون دے۔ میں جلدی گھر لوٹ آؤں، اور میرے کپڑوں پر افراد کے قدموں سے اڑائی ہوئی دھول نہ ہو، میرے بال میرے تفکرات کی طرح اُلجھے ہوئے اور پریشان نہ ہوں اور میرے چہرے پر جھوٹی طمانیت ہو۔ وردہ کو کیا معلوم کہ جاننا سب سے بڑی اذیت اور نہ جاننا بڑی راحت ہے۔

جب وہ نہا کر باہر نکلا تو وردہ باورچی خانے میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چولھے میں جلتی ہوئی آگ نے سرخی اور پسینے کی بوندیں اکٹھا کر دی تھیں اور اس کے اس طرح بیٹھنے سے اسے احساس ہوا کہ شاید وہ بھی شطرنج کا ایک بے ضرر مہرہ ہے جو صرف سیدھا اور ایک ہی گھر چلتا ہے۔ وہ بھی اس کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ اسے علم تھا کہ وردہ کو اس کا دیر سے گھر آنا پسند نہیں وہ اسے بچپن سے جانتی ہے اور

عنقریب اس کی بیوی بن جائے گی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ پھر بھی اس معاملے میں وہ بے بس تھا۔ سیاسی تحریک میں حصّہ لینا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ملک و قوم کی خاطر وہ اپنی محبّت کا گلا گھونٹنے کے لیے تیار تھا۔

"انسان کو صرف اپنے لیے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔" اس نے وردہ کو قائل کرنا چاہا۔

"اگر یہ بات درست ہے تو آپ کو میرا زیادہ خیال ہونا چاہیے۔ کالج یونین کے صدر ہونے کی حیثیت سے آپ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی مقبولیت اور نیک نامی کے لیے کر رہے ہیں۔ اس طرح آپ اپنے لیے جی رہے ہیں۔" وردہ نے چڑ کر کہا۔

"پگلی تم اور ہم دو تو نہیں۔ تم تو ہر لمحہ میرے ساتھ ہوتی ہو۔ تم خود سوچو طالب علم مختلف سیاسی پارٹیوں میں تقسیم ہو چکے ہیں۔ ان کے آپس کے اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں اور وہ مختلف خانوں میں بٹ کر طلبا کی قوت کمزور کر رہے ہیں اور بد دیانت سیاست دانوں کے آلۂ کار بنتے جا رہے ہیں۔ اگر ہر شخص ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا لے گا تو مفاد پرستوں کو من مانی کرنے کا موقع ملے گا۔" ریاض نے ایک ہی سانس میں کہا۔

وردہ دوپٹہ کا بکل مار کر اٹھی اور مسکرا کے ریاض کی طرف دیکھا۔ ریاض نے وردہ کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھی، تو اسے سارا ماحول خوبصورت نظر آنے لگا۔ اس نے وردہ کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"اب کیا ہوا؟"

"نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔" وردہ نے آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"گویا قائل ہو گئیں اور خفگی ختم۔" ریاض نے خوش ہو کر کہا۔ اور دونوں کھلکھلا کے ہنس دیے۔

ریاض دنیا بھر کی خوشیاں وردہ کے دامن میں بھر دینا چاہتا تھا مگر اس کے لیے ابھی وقت درکار تھا۔ الیکشن ختم ہوتے ہی وہ شادی کرے گا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا اور اس کا دماغ ایک بار پھر سیاسی سرگرمیوں میں گھوم گیا۔

"کل — آنے والا کل ہمارا ہے — اسے بہتر بنانا ہمارا کام ہے۔ ہم اسے خوب سے خوب تر بنائیں گے کل ہمارا ہے۔ نوجوان نسل کا۔ جو قوم کی نمائندہ ہے۔ جو ملک کی بقا اور تعمیر کی ذمہ دار ہے۔"

تقریر کے لیے خوبصورت اور موثر الفاظ اس کے ذہن میں ابھرنے لگے —

"میاں یوں لگتا ہے ملک کی بقا خطرے میں ہے۔" اس کے باپ کی آواز آئی۔

"جی بھائی صاحب۔" اس کے چچا نے تائید کی۔

اس کے ذہن سے تقریر کے سارے خوبصورت اور مؤثر الفاظ یکدم نکل گئے۔ اور وہ چلتا ہوا دونوں کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں میں سے کسی نے اس کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش میں مہروں کے خانے بدل رہے تھے — چالیں چل رہے تھے۔

ابّا میاں۔ اس ملک کی زمین ہماری ہے اور زمین سے ہمارا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ جب تک ہمارے جسم میں خون

کا ایک بھی قطرہ ہے۔ ہمارا ملک قائم رہیگا۔"

اس نے بحث کا آغاز کرنا چاہا۔ "لیکن جب زمین کے باسی ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیں تو زمین سے خود بخود رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور خون کے قطرے بے وزن، بے قیمت اور بے اثر ہو جاتے ہیں۔

"جس شانتی نگر کی مٹی اور مٹی کی خوشبو میرے انگ انگ میں رچی ہوئی تھی، جس سے میری روح کو تقویت ملتی تھی، جس سے میرے اعضاء نے حرکت کا یقین پایا تھا، جس سے میرے جسم نے ہونے کی تصدیق حاصل کی تھی، اسی شانتی نگر کی مٹی اور اس مٹی کی خوشبو کی موجودگی میں، یقین میں، تصدیق میں، اور عرفان میں پال سنگھ، امرناتھ، اور سکھ دیال میرے بچپن کے ساتھی اور دوست تھے، زمین کے رشتے، خوشبو، روح کی تقویت، اعضا کی حرکت کا یقین ہونے کی تصدیق بہت خوبصورت الفاظ ہیں مگر وہ میری بہن کو ملتا اور میرے گھر کے تحفظ سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتے۔"

اُس کے والد اور چچا دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سارے گھر میں اس نے اپنے والد سے سیاست پر تبادلۂ خیال کرنا چاہا وہ شانتی نگر کا ذکر لے بیٹھے۔

وہ ماضی کو دہرانا بے سود سمجھتا تھا۔

"صورتِ حال کو بگاڑنے یا بنانے کی ذمّہ داری کسی ایک فرد یا طبقے پر نہیں ہوتی۔" اُس نے ایک بار پھر قائل کرنے کی کوشش کی۔ مگر انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے اس موضوع پر بات کرنے سے منع کر دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب

اس کے والد گھنٹوں گم صم بیٹھے رہنے لگے۔ اپنے ایک ایک دوست کا نام لیکر پکاریں گے۔ اور ان سے دوستی رفاقت اور محبت کا حق مانگیں گے۔ اس کو اس بات کا اندازہ تھا کہ گاؤں کا نام لیتے ہی اب بھی ان کی آنکھوں کے چراغ جل اٹھتے ہیں میلوں کی مسافت اور برسوں کی دوری کے باوجود آج بھی وہ وہیں ہیں جہاں سے چلے تھے۔ انسان نے انسان کے وجود کو تقسیم کیا مگر انسان کے دل کو تقسیم نہ کر سکا اپنے باپ کو رنجیدہ دیکھ کر اس کا دل بہت کڑھتا جن نامساعد حالات میں اس کے والد نے اس کی پرورش کی اور تعلیم دلائی وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اب وہ ان کو مکمل سکون و آرام پہنچانا چاہتا تھا، وہ سب کی امیدوں کا مرکز تھا، اپنے چچا اپنے والد اور اپنی منگیتر وہ ان کی توقعات کا منبع جیسے سب اپنا اپنا حق مانگ رہے ہوں۔

"ہاں سب کا مجھ پر حق ہے لیکن میرے ملک کی زمین بھی تو اپنا حق مانگتی ہے۔ اگر اقتدار ناعاقبت اندیش اور غیر محب وطن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو کیا ہو گا۔"

ریاض نے سوچا اور خوف کی ایک لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی تک اترتی چلی گئی۔ اس نے سوچا کہ وہ سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے گا۔ خواہ گھر والے اس سے خفا ہو جائیں اسے یقین تھا کہ کچھ دنوں میں گھر والوں کی مخالفت ختم ہو جائے گی۔ اور ایک دن ایسا آئے گا سب اس کے ساتھ ملک دشمن قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔

ڈھاکہ یونیورسٹی میں طالب علموں کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ ریاض تقریر کے لیے اہم نکات اور مسائل لکھ رہا تھا

اس کے والد بے چینی سے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ پھر وہ اس کے قریب کھڑے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے اس نے پریشان ہو کر باپ کو دیکھا اور پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

"بیٹا آج موسم ٹھیک نہیں ۔ باہر مت جاؤ۔" باپ کی آواز پر اس نے باہر کی طرف دیکھا۔

"یوں لگتا ہے طوفان آنے والا ہے۔ ندی اور نالوں کا پانی پھیلتے پھیلتے ایک ہو جائے تو پانی سے خوشبو کی بجائے بو آنے لگتی ہے۔" اس کے باپ نے پھر کہا۔ اور اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ ہواؤں میں اجنبی سی خوشبو کا گمان ہوا۔ "مجھے اسی طرح کی خوشبو کا گمان اس دن بھی ہوا جس دن شانتی نگر تباہ ہوا تھا۔"

ریاض کے والد نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔ ریاض کو غصہ آ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے باپ سے کہے کہ توہم پرستی ہی ان کے اعصاب کی کشیدگی کا باعث ہے۔ مگر وہ باپ کا وحشت زدہ چہرہ دیکھ کر خاموش رہنے پر مجبور ہو گیا۔

آج کا اجتماع فیصلہ کن تھا اور اس کا پہنچنا بہت ضروری تھا۔ اس کا فرض اسے پکار رہا تھا۔ کوئی مجبوری، کوئی دشواری، کوئی موسم، کوئی طوفان اور کوئی چہرہ اس کا راستہ نہ روک سکتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ اس کا باپ، چچا اور وہ تینوں کھڑکی کے کھلے پٹ سے امید و ناامیدی کے وسوسوں سے ستے ہوئے اس کی طرف دیکھے

رہے تھے ۔ تین چہرے تین مہرے اپنے خانوں میں ساکت تھے وہ حرکت کر رہا تھا ۔

چوتھا مہرہ اپنی چال چل رہا تھا ۔ چوتھا چہرہ اپنی منزل کی طرف گامزن تھا ۔ اس نے کھڑکی میں دیکھا ایک لمحہ کے لیے اُس کے قدم وہیں رک گئے ۔ وردہ نے اسے آج اپنے پیار کی قسم دیکر روکنا چاہا تھا مگر وہ نہ رک سکا ۔ آج سب اسے اپنے پیار کا واسطہ دیکر کیوں روک رہے تھے ۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا مگر اسے وہاں روشنی کی کوئی لکیر یا امید کی کوئی کرن نظر نہ آئی ۔ نکڑ والی مٹھائی کی دکان پر محلے کے لڑکے نہایت زور و شور سے سیاسی بحث میں مصروف تھے ۔ ان آوازوں نے اسے سہارا دیا ۔

"بچے بچے میں سیاسی شعور پیدا ہو گیا ہے مگر ابا، چچا اور وردہ سیاست کو خوفناک اژدہا سمجھتے ہیں" اس نے سوچا اور اس کے قدم اٹھنے لگے وہ آگے بڑھ گیا ۔

"پورا ملک ایک فیصلہ کن دور سے گزر رہا ہے" اس کے اندر سے فیصلہ کن آواز آئی ۔

"میں ایک زندہ قوم کا فرد ہوں مجھے سیاست میں حصّہ لینا چاہیے" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا اور فخر سے اس کا سینہ تن گیا ۔

"ریاض بھائی اپنی کی چنتا کورین" لڑکوں میں سے ایک نے پوچھا ۔

"ریاض بھائی اے امی کھانے آش" "رشو بولا کھابن" ایک اور لڑکے نے متوجہ کیا ۔

"عجیب بے فکرے نوجوان ہیں ۔ رس گلّے کھانے کی

دعوت دے رہے ہیں۔ جلسے پر پہنچنے کی فکر کسی کو نہیں"۔
اس نے سوچا اور دکان کی طرف مڑ گیا۔

"تم لوگ جلسے میں شریک نہیں ہوگے" اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"امار ڈیوٹی اے ای کھانے آشتے" ایک لڑکے نے منہ میں رس گلہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کی ڈیوٹی یہاں ہے" اس نے حیران ہوکر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ پھر خود ہی مطمئن ہو گیا کہ محلّے کو تنہا چھوڑنا مناسب نہیں۔

"تم لوگ میرے گھر کا بھی خیال رکھنا۔ ابّا بہت پریشان ہیں!" اس نے جلیل، راجو اور سکندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔..........

یہ تینوں اس محلے کے تیز و طرار لڑکے تھے۔ اور ریاض کی عزت کرتے تھے۔

"فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اب پریشان نہ ہونگے" تینوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"ریاض بھائی جاؤ جلسے کی دیر ہو رہی ہے" سائیکل رکشہ کو روکتے ہوئے سکندر نے کہا۔

وہ رکشے پر سوار ہو گیا۔ کھلی کھڑکی میں سے ہاتھ ہوا میں لہرائے اور تینوں چہروں نے اسے خدا حافظ کہا۔ ریاض انہیں دیکھتا ہوا گلی کے سامنے سے گزر گیا۔..........

بڑی سڑک پر انسانوں کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر

نظر آ رہا تھا۔ اس جم غفیر میں کئی نعرے کئی طرح کی پریشانیوں کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ رکشہ سے اتر کر وہ پیدل چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یونیورسٹی کا راستہ تلاش کرتے ہوئے وہ ٹھوکریں کھانے لگا۔ اور دھکم پیل میں یونیورسٹی کی عمارت دور ہوتی چلی گئی۔ شور بڑھتا گیا۔ نعرے گالیوں میں بدل گئے۔ اس کی لکھی ہوئی تقریر پھسل کر زمین پر گر گئی اور کئی پاؤں اسے روندتے ہوئے چلے گئے۔ اس نے اس کاغذ کے مسلے ہوئے شکستہ پرزے دیکھے جن پر لکھے ہوئے حروف پیروں سے روندے جاکر اپنی صورت بدل چکے تھے۔ حروف روندے گئے۔ الفاظ مسلے گئے پوری تقریب پاؤں تلے پس کر بکھر گئی۔ اسے اپنا وجود بھی کٹا پھٹا، مسلا ہوا اور روندا ہوا لگا۔ یونیورسٹی کی عمارت اب نظر آرہی تھی۔ آج یونیورسٹی کی شفیق ممتا سے مملو عمارت تک وہ کیوں نہ پہنچ سکا۔ آج اس کے حرف کیوں روندے گئے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان پرزوں کو دیکھا۔ اور ان کو سمیٹنے کی کوشش کی مگر پرزے اس کی گرفت میں نہ آسکے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور مایوسیوں کے گہرے سایے اُس کے چاروں طرف پھیل گئے۔

وہ ایک دن ایک صدی بن گیا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ مگر دور دور تک کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ اس نے کئی مانوس چہروں کو اپنی طرف مدد کے لیے پکارنا چاہا۔ مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ اس نے

واپس لوٹنا چاہا مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ سارے راستے بند تھے چاروں طرف رکاوٹیں تھیں۔ یہ رکاوٹیں ہمیشہ سے موجود تھیں۔ جنم جنم سے اس کی راہ میں کھڑی تھیں اور وہ ان رکاوٹوں سے بے خبر تھا۔ اور جیسے یہ رکاوٹیں آج پہلی بار نظر آتی ہوں جیسے وہ آج اپنے ہی دیس میں اجنبی ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نے اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے اور پوری قوت سے چیخا۔

"بھائیو۔۔۔۔۔۔۔ اپنے آپ کو تباہی سے بچاؤ۔"

کسی نے اس کی آواز پر توجہ نہ دی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پرانے قبرستان میں چیخا ہو جہاں سالہا سال پہلے مُردے دفن کیے گئے ہوں اور ان کے کتبوں پر ان کے نام اور ۔۔۔ ان کی وفات کی تاریخ درج کر دی گئی ہو اور وہ ان مُردوں سے مخاطب ہو۔ جہاں اس کی آواز پتھروں سے ٹکرا کر گونج گئی ہو۔ بے تاثر، مُردوں کے درمیان گونجتی ہوئی کمزور آواز۔

"لوگ خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے۔"

اس نے پوچھنا چاہا، لوگ کیوں خوفزدہ ہیں، لوگ کیوں بھاگ رہے ہیں۔ وہ کسی سے نہ پوچھ سکا۔

اسے اب لگا جیسے وہ بھی قبروں کے درمیان ایک کتبہ ہے جس پر تاریخ کندہ ہے۔ اس نے اپنے وجود اور اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ اس نے دیکھنا چاہا کہ اس کے بدن پر کیا تاریخ کندہ ہے۔ اسے کچھ نظر نہ آیا اور وہ بھی بھاگنے والوں میں شامل ہو گیا۔ کئی آوازیں اور نعرے اس کا تعاقب کرتے

رہے وہ ان سے بچنے کے لیے چھپتا رہا اور چھپ چھپ کے گھر کی راہ تلاش کرتا رہا جہاں اس نے اپنے ابا، چچا اور دردہ کو روتے ہوئے چھوڑا تھا۔ وہ آج ان سب سے لپٹ کر رونا چاہتا تھا، ان سب سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا - اور آنکھیں چھلک اٹھیں۔

"میرا گھر۔ میرا باپ، دردہ۔ میرے گھر کا کھلا ہوا دروازہ" اس نے سوچا اور تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

گھر کے اندر گہرا اندھیرا، مکمل سکوت، اور گمبھیر سناٹا تھا۔ جیسے موت کا سماں ہو۔ وہ خوف زدہ ہو کر ڈیوڑھی میں کھڑا ہو گیا۔

"دردہ روشنی کرو میں آ گیا ہوں" اس نے وہیں کھڑے کھڑے آواز دی، اس کی آواز گھر کی تاریک دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے اپنا وجود ایک بار پھر قبروں کے درمیان کھڑے ہوئے کتبے کی طرح لگا۔

"یہاں قبروں کے درمیان چھائی رہنے والی اداسی کیوں ہے۔ کیا میرا گھر کھنڈر ہو گیا ہے" وہ پریشان ہو گیا۔ اس کی تمام قوتیں جواب دے گئیں۔ اسے اپنا بدن زخموں سے چھلنی محسوس ہوا اور زخموں کے نشان کراہنے لگے۔

"میں زخم زخم ہو گیا" اس نے اپنے وجود پر نظر ڈالی۔ اسے ہمدردی اور سہارے کی ضرورت تھی اسے محبت اور شفقت کی ضرورت تھی۔ اس کا پورا وجود اسی خواہش

کی بھٹی میں تپ رہا تھا۔ مگر آج اس کے اپنے گھر میں اس کی آواز کا کوئی جواب نہ تھا۔ "کیا میں اپنے گھر میں بھی اجنبی ہو گیا ہوں۔" اس نے اپنے چاروں طرف حسرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

"کیا پناہ گاہیں قبروں کی طرح سہیم ظلمات بن جاتی ہیں۔" سوچوں کی گھمن گھیریاں اسے آگے بڑھنے سے روکتی رہیں اور اس کے اندر مایوسی کے سایے پھیلتے رہے وہ جو اپنے آپ کو سچائی کا علمبردار جانتا تھا۔ اپنے ہی گھر سے دوچار ہونے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔

"ابا۔ ابامیاں" وہ پوری قوت سے چیخا۔

"ریاض بیٹے۔" باپ کی آواز آئی۔ اپنے باپ کی یہ آواز اسے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے یہ اس کے باپ کی وہ آواز تھی جسے اس نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ جیسے اس کا باپ اپنی ساری زندگی اپنی اس آواز سے ہی بھاگتا رہا ہو، جیسے اس کے بوڑھے باپ کی یہ آواز ایک ایسا بھیانک سچ ہو جس سے آنکھیں ملانے کی، جسے پوری توجہ سے سن لینے کی اس میں ہمت نہ ہو۔ وہ اس آواز پہ کانپ گیا اور بھاگ کر صحن میں گیا۔ زخمی باپ اس کے انتظار میں سسک رہا تھا اور چچا دم توڑ چکا تھا۔ وردہ کہیں نہ تھی۔

"وردہ —" اس کے منہ سے یہ نام نکلتے ہی باپ کی آنکھوں کے بجھتے دیپ ایکدم روشن ہوئے اور شعلوں میں بدل گئے۔ مگر زبان سے کچھ نہ نکلا۔ اس نے سب کچھ سمجھ لیا۔

"جلیل، راجہ اور سکندر کے ہوتے ہوئے میرا گھر کیسے تباہ

ہو گیا۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں اپنے آپ سے سوال کیا۔ ....

لیکن اس کے باپ کی ویران آنکھیں اسے بتا رہی تھیں کہ جیسے پال سنگھ، امرنا تھ اور سنگھ دیال کے ہوتے ہوئے شانتی نگر والا گھر تباہ ہوا تھا۔

"بیٹا تم یہاں سے کراچی چلے جاؤ" باپ کی نحیف آواز پر وہ تڑپ اٹھا اور اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"تمھیں میرے بہتے ہوئے لہو کی قسم اب ضد نہ کرو۔ اپنے بوڑھے لب مرگ باپ کی یہ بات مان لینا" باپ کی کمزور آواز آخری بار اس کے کانوں میں آئی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اسے ایک تناور درخت سے کاٹ کر کسی گندی نالی میں پھینکدیا گیا ہو ....

طوفان نے ندی نالے ایک کر دیے تھے اور زمین کی خوشبو معدوم ہو چکی تھی۔ گلی کے موڑ پہ کھڑے ہو کر اس نے ایک بار حسرت سے اپنے گھر کی طرف دیکھا کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ، ہوا سے زور زور سے بجتے ہوئے چیخ رہے تھے۔

"چلے جاؤ۔ چلے جاؤ"

عین اسی وقت سڑک کی طرف سے بھی نعروں کی آوازیں آنے لگیں، ایک گروہ لاٹھیاں، بلّم اور کلہاڑیاں لیے ہوئے نمودار ہوا، بجلی زور سے کڑکی اور اس کی روشنی میں جلیل، راجو اور سکندر کے چہرے اسے نظر آئے۔ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا کھڑکی کے پٹ زور سے بجے اور "جاؤ۔ جاؤ" کی صدا بلند ہوئی۔

"میں کیسے چلا جاؤں، میں یہاں پیدا ہوا ہوں، اس زمین کی مٹی اور میرے وجود کی مٹی کی خوشبو ایک ہے" اس نے احتجاج کرنا چاہا مگر آج اس احتجاج کو آواز نہ ملی۔
"جس طرح ابا نے شانتی نگر چھوڑا تھا مجھے ڈھاکہ چھوڑنا پڑے گا" اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔
آوازیں بڑھتی گئیں اور اس کا کمزور ناتواں وجود دیوار کے سایے میں کھڑا حسرت بھری نظروں سے اپنے گھر کی کھڑکی کے ہلتے ہوئے پٹ دیکھتا رہا۔ بجتے ہوئے پٹ کی آواز سے "جاؤ — جاؤ" کی صدا بلند ہوتی رہی ہجوم جس میں اس کے دوست بھی شامل تھے نعرے لگاتا ہوا مختلف سمتوں کو چلا گیا۔ وہ تنہا کھڑا اجنبیوں کی طرح گزرتے ہوئے ہجوم کو دیکھا کیا۔
"مجھے جانا ہی ہوگا" اس نے فیصلہ کیا اور پیچھے دیکھے بنا آگے چل دیا۔
کراچی کی گہما گہمی بھی اس کی یادوں کے دیپ نہ بجھا سکی بچھڑی ہوئی زمین کی مٹی کی خوشبو ہر لمحہ اس کے ساتھ چلتی رہی۔
شطرنج کی بساط الٹ گئی مگر مہروں جیسے چہرے اس کے سامنے سوال بن کر کھڑے ہو جاتے، ابا کا چہرہ، پپا کا چہرہ۔ یہ خاموش چہرے اس سے ہر لمحہ سوال کرتے رہے۔ لیکن اس نے یادوں کے بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنی رہی سہی قوت سے زندگی کا سفر جاری رکھا۔ شادی کے بعد ایک خوبصورت بیٹی نے ماضی کے زخموں کے اندمال میں سہارا دیا۔ اور اس ننھے کومل پودے کی آبیاری میں سب کچھ بھول کر لگ گیا۔ اس نے طرح طرح کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔

جوں جوں اس کی بیٹی بڑی ہوتی گئی اس میں زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھتا گیا۔

آج پھر موسلا دھار بارش ہورہی تھی۔ اس کے کچے مکان کی چھت ٹپک رہی تھی اور گلی کا بہتا ہوا پانی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کالے بادل نیلگوں وسعتوں کو احاطہ کر رہے تھے۔ گہرے کالے اور سفید بادلوں نے شطرنج کی بساط سی بچھا رکھی تھی، کہیں دور سے نعروں کی آواز بلند ہوئی، اس نے آسمان سے زمین کی طرف دیکھا۔ ایک ہجوم بڑھتا چلا آرہا تھا۔

"سیاست کا اژدھا منہ کھولے آرہا ہے" وہ پریشان ہوکر گھر کے اندر گیا۔ اس کی بیوی کہیں گئی ہوئی تھی اور بچی چارپائی پر لیٹی ہوئی سو رہی تھی۔ اس نے بیٹی کو گود میں اٹھایا اور نکل کر بھاگنا چاہا۔ نعرے اس کے سر پر بلند ہونے لگے۔ کئی خونخوار نگاہیں اسے گھورنے لگیں۔

"تم کس کو ووٹ دو گے" ایک آواز نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"تمہارا تعلق کس پارٹی سے ہے" پھر پوچھا گیا۔

وہ پھر خاموش رہا۔

"جواب دو کیا گونگے ہو" لاٹھی کی ضرب نے اسے بولنے پر مجبور کرنا چاہا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"وقت ضایع نہ کرو" گونگا ہے۔ ہمیں نعرے لگانے کے لیے زوردار آواز کی ضرورت ہے۔ کسی نے مشورہ دیا۔

"اس کی بیٹی ہی جوان ہوتی تو ہمارے کسی کام آتی"۔ لاٹھی کی ایک اور ضرب نے اپنا فیصلہ سنایا۔

دو اس گونگے کے گھر میں ٹوٹے ہوئے صندوق اور جھلنگا چار پائیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں!" کئی ہوس پرست نگاہوں نے اندر جھانکا وہ سب واپس لوٹ گئے اور نعروں کی آوازیں دور ہوتی گئیں۔" اگر گونگا بن کے زندہ رہنے میں امان ہے تو میں اپنی زبان ہمیشہ بند رکھوں گا۔ اس نے بیٹی کو سینے سے بھینچ کر سوچا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

قدیر غوثی

عشق کا گولڈ میڈل

ڈھائی سال قبل میں بی۔ اے کی ڈگری بغل میں دبائے جس شان و دبدبے کے ساتھ شہر وارد ہوا تھا اگر اسی فاتحانہ شان سے راجا پورس میدان جنگ میں داخل ہوتا تو یقیناً سکندر اعظم کی "سکندری" اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو چکی ہوتی۔

میرا خیال تھا کہ شہر کے معززین اور مقتدر حضرات کا ہجوم میرے استقبال کے لیے اسٹیشن کے باہر جمع ہوگا جن کے ہاتھوں میں نوکریوں کی آفر، نئی کاروں اور بنگلوں کی چابیاں ہونگی۔

مگر ـــ یا تو میری آمد کی اطلاع نہیں ملی یا شہر بھر کے معززین کسی اہم میٹنگ میں مصروف تھے۔

تین دن کی مسلسل بھاگ دوڑ کے بعد ایک بلڈنگ میں ایک بڑی فرم کے چھوٹے اکاؤنٹنٹ بشیر احمد نے میری تین دن کی مسلسل ریسلنگ پہ رحم کھاتے ہوئے۔ (مبادہ میں کوئی عالمی ریکارڈ قائم نہ کرلوں) مجھے ایک کمرہ کرایہ پر عطا کر دیا۔

کمرے کے برابر کمرے میں بشیر احمد کی نوجوان اکلوتی بیٹی سومی بھی تھی اور مجھ جیسا نوجوان خوبرو لڑکا بھی، پھر بھلا کیسے ممکن ہے کہ عشق کے جراثیم اپنا اثر نہ دکھائیں اور پھر بھلا اس میں میرا قصور بھی کیا ہے۔ عشق تو ایک فطری مسئلہ ہے۔ اس میں مجھ جیسے غیر فطری کا کیا دخل۔

عشق ہوا اور ایسے دھوم دھڑکے کے ساتھ ہوا کہ "بوڑھا زمانہ" دیکھتا اور "نوجوان زمانہ" کھڑا افسوس سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اور تو اور بشیر احمد معہ اہل وعیال اس عشق کی کامیابی کے نقارے سننے لگے۔ انھوں نے شکر ادا کیا کہ ایک پلا پلایا لڑکا یعنی داماد گھر بیٹھے مل گیا اللہ نے دروازہ کھول کر دیا ہے۔

آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ خدانخواستہ سومی کوئی لولی لنگڑی، اندھی، کانی لڑکی تھی۔ وہ ماشاءاللہ ایک انتہائی حسین چھوٹی موٹی سی نرم و نازک سی لڑکی تھی جسے چھوتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔

خیر عشق تو گھر بیٹھے مل گیا۔ اب نوکری کا مسئلہ تھا سو جوتے گھستے رہے۔ جمع شدہ رقم پگھلتی رہی اور کچھ دنوں بعد ہی وہ کلیم خان فاختی" ہو گئے۔

جیب کی رقم گھٹنے کے ساتھ ساتھ عشق کی رفتار بڑھتی

رہی ۔ اور پھر جب انسان کی جیب خالی ہو تو وہ غموں کا ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ ان غموں کا سکون، آہیں، سسکیاں آنسو۔ اور یہ سب عشق میں وافر مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

صبح نو بجے سے چار بجے تک نوکری کی تلاش اور چار بجے سے تا وقت ثانی عشق۔ یہ معمول اتنا پختہ ہو گیا کہ کبھی نوکری بھی اتنی پابندی سے نہ ہوگی۔

میں اور صوی یک جان دو قالب بن گئے تھے البتہ دن میں قالب ایک ہی رہ جاتا۔ ہم نے لیلیٰ مجنوں، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا، سسی پنوں سب ہی کو اپنے عشق کی راہوں میں پیچھے چھوڑ دیا۔ عشق میں ثابت قدم رہنے، ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں اتنی بار کھائیں کہ فرشتے بھی قلم کان میں دبائے رہا عی سیکھ رہے تھے۔ ہوٹلوں میں، بازاروں میں، پارکوں میں (یہ جیب پر منحصر تھا) ہمارا عشق کامیابی سے چلتا رہا کہ امریکہ کا کوئی خلائی راکٹ بھی اتنی کامیابی سے نہ چلا ہوگا۔

ہمارا عشق اتنا مضبوط تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی تھی۔ ہم بھاگ سکتے تھے۔ جاگ سکتے تھے، ڈوب سکتے تھے، کود سکتے تھے، خودکشی کی ہر قسم کو آزما سکتے تھے۔ مگر جدا نہیں ہو سکتے تھے۔

نوکری کی تلاش اسی پابندی اور زور و شور سے کی جا رہی تھی، بشیر احمد صاحب کا کہنا تھا کہ ادھر صاحبزادے کو نوکری ملی اور ادھر چھوڑی۔

مگر نوکری نے بھی نہ ملنے کی قسم کھائی تھی۔ اس شہر میں بڑے بڑے جوتیاں گھس رہے تھے مجھ جیسا مسکین اور

غریب عاشق بھلا کیا کر سکتا تھا۔

نوکری، نوکری، نوکری، اس لفظ نے اتنا ذلیل و خوار کر دیا تھا کہ اب میں کلرک کے بجائے چپراسیوں کی آسامی کے اشتہار دیکھنے لگا۔ اور تو اور پچھلے دنوں بلدیہ نے خاکروبوں کے لیے اشتہار دیا تو میں نے بھی درخواست لکھ دی مگر وہ تو عزت صوفی درمیان میں آ گئی۔ ورنہ رانجھا نے تو صرف بھینس چرائی تھی اور میں کسی سڑک پر جھاڑو دیتا نظر آ جاتا۔

غرض کہ ڈھائی سال سے نوکری اور عشق روزِ اوّل کی طرح ہی چل رہا تھا۔ بس فرق اتنا پڑا کہ عشق پختہ ہوتا جا رہا تھا اور نوکری بچی۔

ایک دن یہ تسلسل بھی ٹوٹ گیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جہاں عشق ہوتا ہے وہاں رقیب درمیان ٹپک پڑتا ہے۔ اگر دھوکا دہی کی سنگین واردات کر کے رقیب سے جان چھڑاؤ تو یہ ظالم سماج، اندھا، لولا، لنگڑا معاشرہ جان نہیں چھوڑتا۔

ہوا یہ کہ ایک دن صوفی اپنے والد محترم سے ملنے دفتر جا پہنچی، فرم کے مالک سیٹھ چراغ الدین جو خیر سے پانچ زندہ بیویوں کو مُردہ کر چکے تھے اور منافع میں ان کے جوان جوان بچے پال رہے تھے۔ ساٹھ سال سے زیادہ عمر، جلد سفید، دل کالا، اور نظر جوان جسم ایسا صحت مند کہ مجھ سے چھ ساتھ نکل جائیں، تندرستی بھی ایسی تندرستی کہ چلا بھی نہ جائے۔ ویسے بھی انہیں چلنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ کیا اتنی ساری کاریں پیدل چلنے کے لیے خریدی ہیں۔؟

آدمی تھے بڑے مجبور، پانچ بیویاں داغِ مفارقت دے چکی ہیں، بس اب تنِ تنہا اپنا بوجھ اٹھائے زمین پہ دھمک رہے تھے — — — ....

انھوں نے صومی کو دیکھا اور اپنے بھاری جسم سمیت اس پر عاشق ہوگئے۔ دوسرے دن صبح ہی انھوں نے صومی کا حدود اربعہ معلوم کر کے بشیر احمد کو طلب کر لیا۔

جب بشیر احمد اکاؤنٹنٹ کمرے سے نکلے تو فرم کے جنرل مینجر اور سیٹھ صاحب کے سُسر بن چکے تھے۔

اس شام صومی نے اپنی سوجی ہوئی آنکھیں ملتے ہوئے یہ ایٹمی دھماکہ کیا تو میں خودکشی کرنے کے آسان نسخہ کی تلاش میں کمرے کی تلاشی لینے لگا۔

جب کوئی نسخہ ہاتھ نہ آیا تو ہم نے ڈرامہ بولا، ساتھ مرنے جینے کی قسموں کو دہرایا، ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہ رہنے کا عہد کیا، بڑے اہتمام سے اس "رقیب موٹا ما" کی دس پندرہ پشتوں کو اپنے دشنام کی عریانی سے نہ صرف ننگا کر ڈالا بلکہ مستقبل بعید میں بھی ان کو ننگا رکھنے کا عزم کیا۔ سماج اور معاشرہ کو للکارا — عاشقوں کے باوا آدم کی دہائی دی اور پھر غصّے سے بھنبھناتا ہوا بشیر احمد کے پاس گیا۔ لمبے چوڑے ڈائیلاگ بولے تو انھوں نے مشورہ دیا۔"

سیٹھ صاحب سے مل لو" میں واپس آگیا۔

ہم دونوں نے طے کیا کہ آخری بار اس "کیدو" سے مل کر اپنی سچی اور پاک محبت کا واسطہ، ہو سکتا ہے کہ اس ظالم کے دل میں کچھ رحم آجائے اور دو حرام موتوں کا بوجھ ٹل جائے

دوزخ میں نہ جانے پائیے۔

یہی سوچ کر دوسرے دن صبح میں سیٹھ چراغ الدین کے دفتر جانے لگا تو صوفی نے روتے ہوئے اور میں نے آنسو پونچھتے ہوئے دعا کی تلقین کی تو اس نے مجھ کو دس کا نوٹ دیا یہ میری آخری پونجی ہے، جو محبت کے نام پر قربان کر رہی ہوں، اگر سیٹھ صاحب پتھر دل نکلیں، یہ ظالم سماج، بے رحم معاشرہ ہماری راہ میں دیوار بنے تو دس روپے کی افیون لیتے آنا، میں چائے بنا کر تیار رکھوں گی، ہم دونوں اسی یادگار کمرے میں جان دے دیں گے۔ اور ہاں اگر ہو سکے تو ایک آدھ روپیہ بچا کر پھول بھی لیتے آنا تاکہ عاشقوں کا جنازہ ذرا دھوم سے اٹھے۔"

"افیون پر تو گورنمنٹ نے پابندی لگا دی، کہو تو خواب آور گولیاں لے آؤں؟"

"نہیں، نہیں! خواب تو ہم مفت میں دیکھ لیتے ہیں"۔

"پھر اور کوئی معقول زہر لیتا آؤں گا"!

بے شمار فلموں کے ٹریجیڈی مکالمے رٹتا ہوا سیٹھ صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہاں کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔

ان کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں کپکپاتے ہوئے میں نے اپنا تعارف کرایا تو سیٹھ صاحب نے جو بے شمار فائلوں اور چیک بکس میں گم تھے، میری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔

میرے جی میں آیا کہ اسی وقت سیٹھ صاحب کا گلہ دبا دوں مگر ـــ پھانسی بڑی اذیت ناک چیز ہوتی ہے۔ خاص کر گلے کے لیے۔

انھوں نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"بیٹھ جاؤ"

میں بیٹھ گیا۔

"دیکھو، ہمیں بشیر صاحب نے تمھارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے"

تم جانتے ہو کہ بشیر صاحب کو ہم نے جنرل منیجر بنا دیا ہے اگر تم چاہو تو ان کی جگہ تمھیں مل سکتی ہے"

"سیٹھ صاحب — آپ دولت کی بنیاد پر میری محبت خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ وہ شہنشاہ ہیں جو دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت پہ فقرے بازی کر رہے ہیں"

"سنو تو؟"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا، آپ میری محبت کی لاش پر تاج محل بنانا چاہتے ہیں میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا"۔

"تم مکالمے تو اچھے بول لیتے ہو"

"ہاں اداکاری بھی اچھی کرتا ہوں"

میں نے غصّے سے جواب دیا۔

"پھر فلموں میں کام کیوں نہیں کرتے؟"

"چانس نہیں ملا"۔

"ناکام ہو کر عشق کرتے ہو"

"جی چاہا ایک گھونسہ ان کی ناک پہ مار کہوں کہ بوکسنگ بھی کرتا ہوں"

"اچھا یہ فلمی مکالمے بولنا بند کرو، یہ بتاؤ کہ صوفی سے سچی محبت کرتے ہو"

"جھوٹی نفرت تو آپ سے بھی نہیں کرتا"

"تم صومی سے شادی کیسے کروگے ـــــ آج کل کی لڑکیاں راکٹ مانگتی ہیں۔"

معاف کرنا سیٹھ صاحب صبوحی نشہ نہیں کرتی۔"

"ارے بے وقوف میں کھانے والے راکٹ کی بات نہیں اڑنے والے راکٹ کی بات کر رہا ہوں۔"

"اسے چاند پر بھی جانے کا شوق نہیں۔"

"افوہ ـــــ انھوں نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ کس احمق سے پالا پڑا ہے!"

ارے بے وقوف یہ بتاؤ شادی کے بعد صومی کو عشق کھلاؤ گے، یا بھوک؟

"میں نوکری کروں گا۔"

ڈھائی سال سے تو تم جوتیاں چٹخا رہے ہو، مزید کتنے جوتے توڑنے کا ارادہ ہے۔ سیٹھ چراغ دین نے نشتر چبھوئے۔

جی، جی ـــــ

یہ جی جی چھوڑو ـــ جوان آدمی ہو، گرم خون ہے۔ عشق بڑی ٹھنڈی چیز ہے نوکری کرو ـــ دس صومی مل جائیں گی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"؟

"جاؤ۔ آرام سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔"

میں دفتر سے نکلا اور پھر ٹائم ختم ہونے سے پہلے واپس پہنچ گیا۔ سیٹھ صاحب جیسا جہاں دیدہ آدمی غلط مشورہ تو نہیں دے سکتا ـــــ

میں نے سوچا۔

"مجھے آپ کی پیش کش منظور ہے۔"

"ہوئی نا بات، تم واقعی ذہین آدمی ہو، ہماری فرم ایسے لوگوں کی قدر کرتی ہے تم کل سے چارج لے لو۔"

میرے گھر پہنچنے سے پہلے ہی (میں جان بوجھ کر دیر سے پہنچا تھا) سومی معہ اہل و عیال نئے بنگلے میں منتقل ہو گئی تھی اور دوسرے دن ہی سومی کی شادی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ زمانہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

دعوت بھی ایسی کہ جس میں سولہ قسم کے کھانے تھے، اتنا کھایا، اتنا کھایا کہ مرتے مرتے بچا۔

یہ شادی کے تیسرے دن کا ذکر ہے میں دفتر سے آ کر نہانے کی تیاری کر رہا تھا کہ دروازہ دھڑام سے کھلا ___ اور سومی آندھی اور طوفان کی طرح کمرے میں گھسی سرخ ساڑھی میں سر سے پاؤں تک زیورات میں اٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے پہلی رات کی تلخی ابھی مٹی نہیں تھی، غصہ سے نفرت سے اس کا چہرہ کارٹون بن گیا تھا۔ اور اوپر سے اس کا لہجہ ___ اللہ کی پناہ ___

"تم اس صدی کے ذلیل انسان ہو!" (حالانکہ میں دو چار صدی کا اعزاز جیتنے کے موڈ میں تھا)

"تم لالچی انسان ہو، تم نے دولت کی خاطر میری محبت کو بیچ دیا۔ تم ___ تم!"

شدت جذبات سے اس کے حلق میں الفاظ اٹک گئے۔

"ذرا تسلی سے میری بات تو سنو!"

"تمہاری بات ___؟" وہ گرجی اور برسنے لگی۔

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی ـــ لالچی انسان"

"بیٹھو تو ـــ"

"میں تم جیسے خود غرض آدمی کے پاس بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتی"

"ٹھنڈے دل سے میری بات سنو۔ محبت قربانی چاہتی ہے"

"ہاں سچ ہے محبت قربانی چاہتی ہے اور تم نے میری قربانی دی"

"تم غلط سمجھی ـــ قربانی تو میں نے دی ہے۔

"قربانی اور تم ـــ تم تو عیبی جانور ہو تمہاری قربانی تو جائز ہی نہیں"

"صومی"

ایک دم اس کا موڈ بدلا۔ اس نے پرس کھولا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک خاصی ضخیم گڈی نکالکر اتنی قوت سے میری ناک پہ ماری کہ اب تک نشان باقی ہے کمرے میں سو سو کے کرارے نوٹ اور ان کی کراری خوشبو بکھر گئی۔

"تم نے انہی نوٹوں کے لیے صوبی کو بیچ دیا نا، یہ رکھ لو کہیں تمھیں دوسری صومی نہ بیچنی پڑ جائے"

اس نے اتنا کہا اور آیے والی رفتار سے واپس ہو گئی۔

دو منٹ تک حیران و پریشان کھڑا رہا، کمرے میں چاروں طرف نوٹ بکھرے ہوئے تھے اور ان کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ میری ناک پر جہاں نوٹوں نے قوت آزمائی کی تھی ایسی خوشبو اٹھ رہی تھی کہ میں بے خود ہو گیا۔ میری ناک پر نوٹوں کا نشان آج بھی میری محبت کی کامیابی کا گولڈ میڈل ہے۔

امراؤ طارق

ملامت کا زخم

ستارہ نے اپنے روتے ہوئے بچے کی طرف دیکھا، کالا لمبوترا سر، چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں والا کمزور سا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔ اس کا بالکل جی نہ چاہا کہ وہ بچے کی طرف توجہ دے۔ کل ہی اس نے سوا مہینے کا غسل کیا تھا۔ آج سہ پہر کیپٹن آفتاب کو فلائٹ سے واپس آنا تھا اور شام تک اس کی ساس اور نندوں اور دوسرے رشتے داروں کو اس کے گھر جمع ہونا تھا۔ آج کیپٹن آفتاب دو بیٹیوں پر پیدا ہونے والے بیٹے کی خوشی میں چراغاں کرنا چاہتا تھا۔ جشن منانا چاہتا تھا۔ گھر کی سوگوار فضا کو رنگین قمقموں کی روشنی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کے گھر تلے اوپر دو بیٹیوں کے بعد بیٹا پیدا ہوا تھا۔

بچہ ستارہ کے بیڈ کے ساتھ لگے ہوئے پالنے میں روئے

جا رہا تھا۔

"بیٹا، روشنی، قمقمے، جشن۔ ہم موہ کی ان دیکھی زنجیروں کے حلقوں میں الجھے، چاہتوں کے بندھنوں میں جکڑے اور خواہشوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے قدم اپنی قبروں کی سمت بڑھتے رہتے ہیں۔" ستارہ نے اپنے آپ سے کہا۔ "اور کوکھ کے غیر یقینی پن کی طرح نہیں دیکھ پاتے کہ کس کی قبر کہاں ہے۔ اور چپکے سے نامعلوم اندھیروں میں اتر جاتے ہیں اور ہمیں اپنے کسی روتے ہوئے بچے کی کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ آخر یہ سب کچھ اتنا ڈپریسنگ کیوں ہے؟"

ستارہ کا ایک دن اوپر سوا مہینہ کا دو بیٹیوں پر پیدا ہونے والا بیٹا روئے جا رہا تھا۔ وہ کاہلی سے بستر پر پڑی سوچتی رہی۔ اور گرہوں پر گرہیں پڑتی چلی گئیں۔

بیڈ روم میں ہر ممکن بدنظمی موجود تھی۔ کیپٹن آفتاب کا لحاف آدھا بیڈ پر اور آدھا فرش پر پڑا ہوا تھا۔ دونوں تکیے پائنتی کی طرف ایک دوسرے پر پڑے مثبت کا نشان بنا رہے تھے۔ اٹیچ باتھ کے ادھ کھلے دروازے پر گیلے تولیے جھول رہے تھے۔ بچیاں لحاف سے بے نیاز ایک دوسرے سے اتنی دور پڑی سمٹی ہوئی سو رہی تھیں جیسے لڑتے لڑتے روٹھ کر سوئی ہوں۔ بیڈ کے عین وسط میں موت کے پیلے دھبے سے دائرہ بن گیا تھا۔ فرش پر کیپٹن آفتاب کے سلیپنگ سوٹ کا پاجامہ اسی طرح پڑا ہوا تھا جس طرح اس نے پاجامہ چھوڑ کر کولھوں کو ہلا کر گرایا تھا اور دونوں پاؤں باری باری پائنچوں سے نکال کر پاجامہ پڑا رہنے دیا تھا۔ سائیڈ ٹیبل

پر جگہ ادھر ادھر دھات کا بڑا سا اڑتے ہوئے ہوائی جہاز رکھا ہوا تھا جس کے ایک پنکھے سے الجھا ہوا ستارہ کا دوپٹہ پرچم کی طرح لٹک رہا تھا۔ کتابوں کے شلیف پر آفتاب کی تصویر، گوتم بدھ کی مورتی اور چھوٹا سا پاکستانی پرچم رکھا ہوا تھا۔ ڈیکوریشن کی ساری چیزیں کتابیں، اڑتے ہوائی جہاز، گوتم بدھ کی سیاہ مورتی اور پاکستانی پرچم گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ اس نے مدت ہوئی گھر سے اپنی دلچسپی ختم کر دی تھی حتی کہ گزشتہ رات اس نے کیپٹن آفتاب کو فلائٹ پر جانے کے لیے عجلت میں تیاری کرتے ہوئے بڑی بے تعلقی اور بیزاری سے اس طرح دیکھا تھا جیسے اس کے بیڈروم میں کوئی اجنبی گھس آیا ہو۔ وہ دروازے تک معمول کے مطابق اسے فلائٹ پر جاتے ہوئے رخصت کرنے گئی تھی اور جب گزشتہ رات کیپٹن آفتاب نے دروازے سے باہر قدم نکالنے سے پہلے شادی کے ابتدائی دنوں کی طرح مڑ کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے خدا حافظ کہا تو ستارہ نے کوئی جواب دیے بغیر اس کے مسکراتے چہرے پر دھڑام سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور اس کے سامنے پہلی بیٹی کی پیدائش کے بعد وال کلاک کے گھنٹے کی طرح بے تاثیر ٹن ٹن کرتے ہوئے بے رکے بے مڑے اور پتھر چہرے والے منہ سے اگلے ہوئے سارے کے سارے "خدا حافظ" قطار اندر قطار آ کھڑے ہوئے تھے جو آج تک اس کے سینے میں پھانس کی طرح کھٹک رہے تھے وہ دھڑام سے بند کیے گئے دروازے سے پیٹھ لگا کر سوچتی رہی تھی اسے یقین تھا کہ اس نے کبھی کسی شخص سے اتنی شدید بھرپور اور سچی نفرت نہ کی تھی۔

جتنی اسے اپنے شوہر کیپٹن آفتاب سے تھی۔

"گھر کے باہر مین گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ جیسے شوہر کا تصوّر کس قدر اذیت ناک ہے۔" اس نے دروازے سے پیٹھ لگائے سوچتے ہوئے جھرجھری لی تھی۔

"وہاٹ اے ہسبنڈ"، "اس نے چیخ کر کہا تھا" سالا۔ الو کا پٹھا۔ کم ظرف، پھر اچانک رک کر اس نے ذہن میں کیپٹن آفتاب کے لیے کئی موٹی موٹی موزوں گالیاں سوچی تھیں اور فرش پر تھوک دیا تھا۔

کھڑکی کے پردوں پر صبح کی پہلی نرم دھوپ نظر آنے لگی تھی۔ مائی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ کمرے کی ہر چیز کا تاثر سوائے ایک پر ایک پڑے ہوئے تکیوں کے بچیوں کے موت کی کھکھراند کی طرح منفی تھا۔ ابھی بچیوں کو روتے ہوئے اٹھنا تھا اور بڑی بچی کو ضد کرنی تھی پھر روتے ہوئے تیار ہو کر اسکول جانا تھا۔ اسے ساری رات نیند نہ آئی تھی۔ جب بھی وہ آنکھیں موندتی کیپٹن آفتاب گھوڑے پر اگے ہوئے ککرمتے کی طرح تنہا اسکے سامنے جلی کٹی باتیں کرتا آن کھڑا ہوتا اور وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی اور نفرت سے اس کا سینہ پھٹنے لگتا تھا۔ وہ آج کے دن کا بڑی شدت سے انتظار کرتی رہی تھی اسے آج زندگی کا سب سے اہم اور پراعتماد فیصلہ کیپٹن آفتاب کو سنانا تھا۔

وہ بیڈ پر کروٹیں بدلتے ہوئے بڑبڑانے لگی جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔

"آخر کیوں وہ اتنے دنوں تک نیم پلیٹ کے تحفظ

کو اتنا اہم سمجھتی رہی اس برائے نام تحفّظ کے لیے ایک ایسے شخص کو جو ہر وقت اعصاب پر سوار رہتا ہو، جس کا تعلق رسہ گیروں کے خاندان سے ہو، خاندانی پس منظر کچھ نہ ہو انگلستان میں رہ کر صرف انگریزی بولنا سیکھ گیا ہو، خوبصورت اور باعزت خواتین کو تعریفوں سے، پروجیکشن کے وعدوں سے یا شپرانگ (CHAPERONING) کے طعنوں سے ہوٹلوں میں ڈنر پر بلاتا ہو، پھر حیلے بہانوں سے ان کے دروازوں کے چکّر لگا کر ذلیل ہوتا ہو، ان سے اپنی بیوی کی غیبتیں کرتا ہو اور لجاجت سے اپنے انسپائر (INSPIRE) کرنے کی صلاحیت چاہتا ہو اور نفی میں جواب پاکر اپنے احساس کمتری سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہو کیوں برداشت کرتی رہی"۔

"آخر کیوں وہ یہ سب کچھ سہتی رہی"۔ اس نے اپنے آپ سے پھر سوال کیا۔

"کیا وہ اسی لائق تھا کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں بیٹھ کر اس کے بچّے جنے اور اس کے نام کا تابوت لیے اس کے دیے ہوئے طعنے یاد کرے اور بین کرے اور اس کی غیر اخلاقی حرکتوں کے چرچے سُنے اور چُپ رہے وہ شہر سے مہینوں مہینوں غائب رہے اُسے چھوڑ کر چھُپتا پھرے اور وہ تنہائی کا آزار جھیلے، اور اگر تنہائیوں اور اکیلے پن سے اکتا کر صرف ذہنی دوسراتھ کے لیے کسی شاعر، ادیب، فنکار یا قوی کردار شخص کو منتخب کرلے تو اس کی تیوری پر بل پڑ جائیں اور یہ نہ سوچے کہ یہ دیسی پروکل رشتہ ہے اور اسے بھی زندہ رہنے اور خوشیوں کے حصول کا حق ہے"۔

ستارہ تلخ ہوتی گئی۔

اس نے زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ خود کیا ہی نہ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑی بہن کے فیصلوں کو قبول کر لیا کرتی تھی۔ اس کی پسند کے کپڑے اسے پسند آتے تھے اس کی پسند کے سینڈل اسے اچھے لگتے تھے بڑی بہن نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹری پڑھ لو وہ ڈاکٹری میں جت گئی دن کو دن نہ سمجھا رات کو رات نہ جانا اور سسٹم بیسٹم ڈاکٹر بن گئی پھر بھی اس کے اندر گھسی ہوئی ہاؤس نہ نکل سکی۔ مگر آج کئی ماہ پہلے خود اس کے کیے ہوئے فیصلے کے اعلان کا دن تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آج کی صبح ہمیشہ جیسی نہ ہو جیسے زندہ رہنا کوئی خوشی کی بات نہ ہو۔ جیسے ہر چیز سے تازگی رنگ اچھوتا پن اور کوملتا چھین لی گئی ہو جیسے سب کچھ نقلی اور جھوٹ ہو اس کے جی میں آئی کہ وہ کیپٹن آفتاب کو موٹی سی بھرپور گالی دے، مگر عین اسی وقت پالنے میں پڑا رونے والا بچہ خاموش ہو گیا۔ ستارہ کی سوچی اور تولی ہوئی موٹی سی گالی زبان سے ادا نہ ہوئی تو ستارہ کو سکون نہ مل سکا وہ ان کہی گالی کے بوجھ سے دبی ہوئی پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گئی

"آج ساری زندگی ملے طعنوں کے لوٹانے کا دن ہے"۔ اس نے ایک اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا اور اسے میڈیکل کالج کی روم میٹ یاد آ گئی۔

"یار۔ تو اس ڈرائیور کے چکر میں مت پڑ"

میڈیکل کالج کی روم میٹ نے آفتاب کو ہر فائٹ پر اس کے پاس آتا دیکھ کر کہا تھا۔

"ڈرائیور نہیں ہے۔ اُلّو۔ پائلٹ ہے۔"

اس نے چڑ کر بتایا تھا اسے اس زمانے میں یہی علم نہ تھا کہ ہر پائلٹ پائلٹ نہیں ہوتا۔ ہر پروفیسر، پروفیسر نہیں ہوتا۔ اور ہر ایڈیٹر، ایڈیٹر نہیں ہوتا۔

ان دنوں ڈھاکہ ایک فلائٹ جتنا ہی دور تھا اس کی روم میٹ ہر شام اسے لیکر صدر گھاٹ کی طرف چلی جاتی کشتیوں کی ساحل سے لگی قطاریں، ہاکروں کا شور، اننّاس کی زرد کنگوروں والی مہکتی ہوئی قاشیں، بوڑھی گنگا کا گدلا پانی کیچڑ اور مچھلی کی ہمیشہ ساتھ رہنے والی بگھیاں، ہر جگہ نمی اور سبزہ، گہرے پانیوں پر ہچکولے کھاتے ہوئے نو کے پتواریں بادبان، ہوا، بارش، کٹھل، آم اور خوشبوئیں اور کوئل۔

"ہائے وہ روم میٹ جو پائلٹ کو ڈرائیور پروفیسر کو پیشہ ور اور ایڈیٹر کو بلیک میلر کہتی تھی اور اس کی ڈانٹ کھاتی تھی۔" اس کے سینے میں یادیں نشتر کی طرح اتر گئیں۔

بڑی بچّی رو دھو کر ضد کرتی ہوئی ڈرائیور کے ساتھ اسکول جا چکی تھی گلی میں دودھ اور اخبار والوں کی سائیکلوں کی گھنٹیاں شور مچاتی گزر چکی تھیں اور سبزی والے اپنی ریڑھیاں ڈھکیلتے آوازیں لگا رہے تھے چھوٹی بچّی مائی سے ناشتہ کرتی ہوئی دنیا جہان کے سوال پوچھے جا رہی تھی۔ ستارہ کو بیڈ روم میں اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دھوپ میں شدت آ چکی تھی اور گلیوں اور سڑکوں پہ ٹریفک کا شور بڑھتا جا رہا تھا وہ اسی طرح

کاہلی سے بستر میں پڑی کمرے کے منفی تاثر کو محسوس کر رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بچیوں کے بستر پر موت کا دھبّہ موجود ہے اٹیچ باتھ کے دروازے پر جھولتے ہوئے تولیوں میں بساند ہے اور اس کے بیڈ کے نیچے آفتاب کے گندے موزے اور انڈرویئر میں ناقابلِ برداشت بو ہے اور اسے ابھی اٹھنا ہو گا اور ان تمام دھبّوں اور بوؤں سے صرف نظر کرتے ہوئے باتھ روم میں جانا ہو گا۔ مائی نے گرم پانی سے ٹب بھر دیا ہو گا۔ اسے غسل کرنا ہو گا پھر ڈائننگ ٹیبل پر لگے ہوئے روز جیسے ناشتے کو بد دلی سے ختم کرنا ہو گا اور ہسپتال جانا ہو گا۔ جہاں ایک مریض پھر دوسرا پھر تیسرا۔ اور قطار میں کھڑی ہوئی انتظار کرتی ہوئی عورتوں کی دھکم پیل اور ان کی ایک دوسرے کو گالیاں۔ کار کی آواز سے اس نے جان لیا کہ ڈرائیور بڑی بچی کو اسکول چھوڑ کر آ گیا ہے۔

"اُف بورنگ — آخر یہ بڑی بڑی باتیں کرنے والے مرد عورتوں کو احمق کیوں سمجھتے ہیں۔ اور یہ آفتاب اس قدر گندہ کیوں ہے — سالی وہ ہوسٹل والی روم میٹ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ ہوائی جہاز کا ہی سہی مگر ہے نرا ڈرائیور"۔

"بیگم صاحب جی — ہسپتال کا ٹیم ہو رہا ہے جی" مائی نے کہا — "اچھا"

"آپ نہانے جائیں تو میں کمرہ ٹھیک کر دوں"

"ہو چکا ٹھیک یہ کمرہ — تجھے کیا پتا کہ اس کمرے میں کہاں کہاں کتنا کچھ بگڑ چکا ہے"!

"ایں جی" مائی کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔

اس نے کروٹ بدلی اور پوری طرح آنکھیں کھول کر بیڈ روم کے دروازے سے باہر ڈرائینگ روم کا وہ حصّہ دیکھا جو وہاں سے لیٹے لیٹے اسے نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیپٹن آفتاب ڈھیلا۔ ڈھالا، تھکا ہوا سا، سنگریزوں کی طرح ٹھوکروں میں لڑکھڑاتا ہوا سا کیوں ہے۔ وہ سنگرام شخص چھتنار درخت مرد جس کے دھوکے میں وہ آئی تھی اس کے اندر کبھی ملا کیوں نہیں۔ تھا ہی نہیں۔ وہاں تو مستقبل سے خائف رہنے والا، اپنے شہر سے بھاگ جانے والا، چھپتا پھرنے والا بلیک میلر اور پشتنی رسہ گیر گھسا ہوا تھا وہ پشتنی رسہ گیر اس کے اندر سے کبھی نکل ہی نہ سکا۔"

باتھ روم میں برش کرتے ہوئے ستارہ کو آفتاب کی بہن یاد آئی۔ وہ بڑی روشن اور چمکتی ہوئی صبح تھی۔ شادی کو گیارہواں مہینہ لگا تھا۔ اور وہ حاملہ تھی اور اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ اتنی جلدی سب کچھ کس طرح ہو گیا۔ گو کہ وہ ڈاکٹر تھی مگر اپنے اندر کی تبدیلیوں پر حیراں تھی۔ خوابوں کے سارے رنگ تصوّر کے سارے تانے بانے جیسے اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح نکل گئے تھے اور مٹھی خالی ہو گئی تھی۔ آج ہی کی طرح وہ پیسٹ میں لتھڑا ہوا برش گال میں دبائے کھڑی تھی، مگر اس صبح وہ باتھ روم میں نہ تھی بلکہ کیپٹن آفتاب کے گاؤں والے گھر میں گھڑونچی کے پاس کھڑی ہوئی تھی کہ آفتاب کی بہن پانی لینے گھڑونچی کے قریب آئی اور منہ آسمان کی طرف اٹھا کر ناک سے شوں شوں نکالتے ہوئے پیسٹ کی خوشبو سونگھی۔

"بھابی بڑی اچھی خوشبو ہے"۔

وہ منہ سے کچھ نہ بولی تھی بس آہستہ آہستہ برش مسوڑوں میں پھیرنے لگی تھی جیسے کسی منہ زور جذبے کو تھپکیاں دے رہی ہو۔

"ماں کہتی ہے بیٹا لوں گی" کیپٹن آفتاب کی بہن نے اس کے غیر معمولی ابھرے ہوئے پیٹ کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ مسکرا دی تھی اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔

"آپ کیا سوچنے لگیں"۔

"ماں بیٹیوں سے نفرت کرتی ہے اسے بیٹا چاہیے"۔

اس کے جی میں آتی کہ کہہ دے کہ پھر اس نے تیرا گلا پیدا ہوتے ہی کیوں نہ دبا دیا۔ تجھے اس نے کس طرح ٹھنڈے پیٹوں پال لیا۔

مگر وہ خاموش رہی تھی جب اس طرح پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو سب کے منہ یہ لمبے لمبے ہو گئے تھے۔ جیسے اس نے حرام کی بچی جن دی ہو۔ آفتاب گویا بجھ سا گیا تھا۔ وہ دونوں جب تنہا ہوتے تو آفتاب کی خاموشی اس کے پورے وجود میں زہر کی بجھی ہوئی سوئیوں کی طرح چبھنے لگتی تھی۔

باتھ روم میں برش کرتے ہوئے اس کا ماضی اس کے سامنے متحرک تھا۔ ایک دوپہر ستارہ ہسپتال سے گھر پہنچی تو بجلی والی ڈرائنگ روم میں بڑے مزے سے صوفے پہ بیٹھی تھی۔

"کیا حال ہیں" ستارہ نے بجلی والی سے پوچھا۔

"آئیے بیگم صاحب" وہ ہڑبڑا کر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بجلی والی ساری محلے میں گھومتی رہتی تھی۔ محلے کے

لوگ بجلی والی کے معاملے میں ہمیشہ نرم پڑ جاتے تھے۔ عورتیں اس لیے کہ وہ تلے اوپر پانچ بیٹوں کی ماں تھی اور مرد اس لیے کہ پانچ بیٹوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ چاق چوبند، دیدہ دلیر سانولی سلونی اور طرحدار تھی اس کی گردن ہمیشہ تنی رہتی اور چلتی تو ایسا لگتا جیسے دونالی بندوق تان رکھی ہو۔

"بیٹھو" ستارہ نے خود صوفے پر بیٹھتے ہوئے بجلی والی سے کہا۔

"آپ بہت سیدھی ہیں جی" بجلی والی بولی۔

"کیپٹن صاحب اگر بیٹی پیدا ہونے سے خفا ہوتے ہیں تو آپ ان کو کیوں نہیں بتاتیں کہ جو بو کے گندم کسی نے کاٹی ہے جو وہ کاٹ لیں گے۔ بجلی والا تو علی الاعلان کہتا ہے کہ جس مرد کے خون میں بیٹے کا کیڑہ نہ ہوگا اس کے گھر میں بیٹا پیدا ہی نہ ہوگا۔ آپ کیسی ڈاکٹر ہیں بیگم صاحب"

ستارہ بجلی والی کی اس بات پر مسکرا کر خاموش ہو گئی تھی۔

"اب دیکھیں نا جی۔ میرے ماشاء اللہ پانچ بیٹے ہیں۔ دوسرے بیٹے کے بعد سے ہی ہم دونوں نے اللہ سے دعا شروع کر دی تھی کہ ہمیں بس ایک بیٹی دیدے۔ مگر جی ہمارے بیٹی نہ ہوئی۔ کون جانے بجلی والے کے خون میں بیٹی کا کیڑہ نہ ہو۔ یہ تو خون خون کی بات ہے"

بجلی والی اترائے چلی گئی۔ ستارہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔

یادیں ستارہ کے ذہن میں دیوالی کے دیوں کی طرح جل بجھ رہی تھیں۔

بجلی والی دونالی بندوق تانے کب کی جاچکی تھی۔ بیٹی اس کی گود میں لیٹ کر سو گئی تھی۔ وہ راتیگاں دوپہر بجلی والی کے جانے پر اور زیادہ طویل ہو گئی تھی۔

ستارہ کے گھر دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو چاروں طرف طلاق کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ شروع میں تو طلاق اسے ایک بے ضرر، ایک بے معنی شئے لگی۔ مگر متّا مرد ہو تو کیا۔ اور نہ ہو تو کیا۔ وہ خود ڈاکٹر تھی۔ خوبصورت تھی اسے کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہ اس کی انا کا مسئلہ بن گیا تھا کہ اسے صرف اس لیے طلاق دی جا رہی تھی کہ وہ بیٹا پیدا نہ کر سکی تھی۔

اسے دوسری بیٹی کی پیدائش سے قبل کیپٹن آفتاب سے اپنی گفتگو یاد آئی۔ دونوں چائے پی رہے تھے۔

"آخر بیٹی کی پیدائش پر تم اتنے جزبز کیوں ہوتے ہو۔ اللہ کی دین ہے"

"تم دقیانوسی بوڑھیوں کی طرح باتیں نہ کرو"

"پھر بھی اپنے بس میں تو نہیں کہ جب چاہو بیٹی پیدا کر لو۔ جب چاہو بیٹا پیدا کر لو"

"نان سنس" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پیالی میز پر رکھ دی تھی۔ تمہیں معلوم ہے مجھے بیٹے کی اتنی شدید خواہش کیوں ہے۔ میں اپنے بیٹے کو ایک مشہور پائلٹ بنانا چاہتا ہوں۔ ایک مایہ ناز ہوا باز۔ جو اپنی پرواز کے دوران فضاؤں پر حکمرانی کرے۔ جس کے قدموں کی چاپ سے جہازوں کے دل دھڑکنے لگیں اور رن وے پھیلتا چلا جائے۔ تم کو

اپنی قوت ارادی سے کام لینا ہوگا اور اگر اس بار بیٹا پیدا نہ ہوا تو پھر مجھے ۔ پھر مجھے مجبوراً دوسری شادی کرنی ہوگی۔"

ستارہ کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی لرز گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"تم خود ایسے پائلٹ کیوں نہ بن گئے"

"شٹ اپ" وہ اٹھ کر چلا گیا تھا۔

ستارہ کا دل شکستہ جہاز کے تختوں کی طرح ڈوبنے اور ابھرنے لگا تھا۔

"قوت ارادی سے تقدیریں بدل جاتی ہوں گی مگر کوکھ کے فیصلے نہیں بدلا کرتے"

ستارہ نے شکستہ جہاز کے تختوں کی طرح ڈوبتے ابھرتے ہوئے دل سے کہا تھا۔

جب دوسری بیٹی کی پیدائش کا وقت آیا تھا تو ستارہ بلک بلک کر روئی تھی۔ صحن میں محلے بھر کی عورتیں جمع تھیں گیٹ کے باہر ڈرائیور نے گاڑی لگا رکھی تھی اور بڑی اداسی سے مولسری کے درخت پر مسلسل چیختے ہوئے کوّے کو دیکھا تھا ستارہ کی آنکھوں میں ہیولے ناچ رہے۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ پورے دن کا پیٹ پاؤں پر بوجھ بن گیا تھا اور پاؤں نقاہت سے کانپ رہے تھے۔ اور ہونٹ سرمئی ہو گئے تھے اور پستانوں میں دودھ کی بوندیں چڑھی ہوئی ندی کی طرح اُبل رہی تھیں۔ "دعا کرو"

"میرے لیے دعا کرو جمیلہ"

"تم بھی ستارہ"

"اللہ سے گڑگڑا کے ——— ٹوٹ کے دعا مانگو میری بہن رقیہ"

"میں نے بڑے پیر کی دیگ مانی ہے۔ میں نے بابا کے مزار پر پھولوں کی چادر مانی ہے۔ تم لوگ بھی جو منتیں چاہو مان لو۔ میں سب پوری کردوں گی۔ جس کا جو جی چاہے مان لے"۔ ستارہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے دھندلائے ہوئے ہر چہرے کی خوشامد کی تھی۔

"کوکھ کا حال کسے معلوم"۔ ایک بڑی بی نے بجلی والی سے کہا تھا "تو دعا کر کہ اب کہ ستارہ بی بی کے نصیب کھل جائیں پالنہ سیدھا پڑ جائے وہ بڑی بے نیاز ہے اور تو ماشاءاللہ پانچ بیٹوں کی ماں ہے رکھ دے ستارہ بی بی کے سر پر ہاتھ"۔

بجلی والی اتراتی مورنی کی طرح پاؤں رکھتی سینہ تانے ستارہ کے قریب گئی تھی اور سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کی تھی۔

پالنہ پھر بھی پٹ ہی پڑا تھا۔

ستارہ باتھ روم سے اپنے گیلے بالوں کو جھٹکتی ہوئی باہر نکلی تو ناشتہ ٹیبل پر لگا ہوا تھا۔ اس نے روز جیسے ناشتہ کی طرف بغیر کسی خواہش کے دیکھا پھر وال کلاک کی طرف دیکھا دس بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج ہسپتال نہ جائے گی۔ ایک دن کی غیر حاضری سے کچھ نہ بگڑے گا۔ اتنا کچھ بن بن کے مٹ چکا تھا اور اتنا کچھ اور بگڑ نا تھا کہ اسے احساس ہی نہ رہ گیا تھا۔ آفتاب کے آنے میں ابھی تقریباً چھ گھنٹے باقی تھے۔ ڈیکوریشن والوں نے لان پر چھوٹے چھوٹے قمقموں کی جھالریں لگانی شروع کر دی

تھیں اور بالکل نہیں جانتے تھے کہ ان قمقموں کی رنگین روشنیاں ستارہ کے دل کی گہرائیوں تک اترتی ہوئی تاریکیوں کا کوئی ازالہ نہ کر سکیں گی۔

اس کا ایک دن اوپر سوا مہینہ کا بیٹا جسے ماہر ہوا باز بننا تھا۔ جس کے قدموں کی چاپ سے ہوائی جہازوں کے دل دھڑکتے تھے اور دن وہ بے کو اور زیادہ پھیل جانا تھا آیا کی نگرانی میں بچہ گاڑی میں پڑا لان کے کونے میں سو رہا تھا آیا گردن ٹیڑھی کیے قمقموں کی جھالروں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کریم بجلی والا سارے میں ناچا ناچا پھر رہا تھا۔ اور ڈیکوریشن والوں کو ضروری ہدایتیں دے رہا تھا۔

اس نے کریم بجلی والے کو پہلی بار اس دن دیکھا تھا جب وہ بجلی والی کی تلاش میں ڈرائنگ روم میں آ کر عین اس کے سر پہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کاندھوں سے مسکی ہوئی گہرے لال رنگ کی بشرٹ اور نیلے رنگ کی گھٹنوں پر سے ابھری ہوئی پتلون اور پاؤں میں ہوائی چپل پہنے ہوئے تھا۔ اس کا قد مشکل سے پانچ فٹ ہو گا۔ اس کے کاندھے اچکے ہوئے سے اور ہاتھ پاؤں خم کھائے ہوئے تھے۔ اور اس کی کالی رنگت میں چمک سی تھی۔

"بیگم صاحب سلام علیکم" میں اس کی تلاش میں آیا تھا جہاں جاتی ہے بیٹھ رہتی ہے۔"

اس نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا تھا۔

"اچھا۔ اچھا۔ تم کریم بجلی والے ہو" ستارہ نے پوچھا تھا "ہاں جی ۔ ہاں جی"

اسے سب بجلی والا کہتے ہیں اور میں بجلی والی ہو گئی۔ کریم تو کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ میں بھی بجلی والا ہی کہتی ہوں ـــــ" سب ہنس دیئے تھے۔

"بڑی پیاری بچّی ہے جی۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے" کریم نے ستارہ کی چھوٹی بچّی کو دیکھ کر کہا تھا۔

ستارہ کی دوسری بچّی پیدا ہوتے ہی اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور تو اور آفتاب بھی اس سے نفرت کرنے لگا تھا بچّیوں کو تو کسی نے پیار سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے ہر وقت یہی خوف لگا رہتا کہ کب اسے طلاق دیدی جائے گی اور کب آفتاب دوسری بیوی گھر لے آئیگا۔ کریم نے بچّی کی تعریف کی تو اس کا جی بھر آیا تھا اس نے پرس سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیدیا تھا پھر تو کریم۔ بجلی والا اسی گھر کا ہو رہا تھا۔

ستارہ میز پر رکھے ہوئے ناشتے کو ہاتھ لگائے بغیر سوچتی رہی۔ اسی رات اچانک بجلی چلی گئی تھی دیر تک کیپٹن آفتاب فیوز ٹھیک کرنے کی کوشش کرتا رہا جب بہت دیر ہو گئی تو ستارہ نے چڑ کر کہا تھا۔

"کریم کو بلا لو تم سے بھلا کیا ٹھیک ہو گا یہ فیوز۔"

آفتاب چپ چاپ کریم۔ بجلی والے کو بلا لایا تھا۔ کریم بجلی ٹھیک کرنے لگا تھا اور کیپٹن آفتاب اسے ٹارچ سے روشنی دکھا رہا تھا۔ ستارہ کو کریم اور آفتاب اس طرح ایک ساتھ کھڑے ہوئے بڑے عجیب سے لگے تھے۔

بے ابھلا ناشتہ کر کے ستارہ بیڈ روم میں جا کر بیٹھ گئی کیپٹن آفتاب کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ باہر لان میں

کریم چیخ چیخ کر ڈیکوریشن والوں کو ہدایات دے رہا تھا بولری کے درخت پر کوّا مسلسل چیخے جا رہا تھا۔

"لو بھئی ستارہ۔ گویا اب یہ سلسلہ ختم ہوا" ستارہ نے اپنے آپ سے کہا۔ معاً اس کا جی بھر آیا۔ اسے بچیوں کو دیکھنے اور انھیں پیار کرنے کی خواہش شدید ہوئی اس نے گردن گھما کر ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا پھر چپ چاپ لیٹ گئی۔

"ان خواہشوں ان بندھنوں سے آزاد ہو جاؤ ستارہ بی، ان رشتوں کو کاٹ دو یہ تمھاری کمزوری بن کر تمھارے قدموں سے لپٹ گئے تو پھر تم ایک قدم نہ چل سکو گی تم اپنا فیصلہ نہ سنا سکو گی تم کچھ بھی نہ کر سکو گی۔"

ستارہ نے اپنے آپ سے کہا۔

ڈیکوریشن والے اپنے کام میں لگے شور کر رہے تھے۔

جانے کہاں سے ستارہ کی آنکھوں میں اچانک ڈھیر سارے آنسو آ گئے۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ چہرے اس کے سامنے پھرنے لگے۔ اس کی بڑی بچی جو اسکول جاتے ہوئے ہر صبح ضد کرتی ہے اور روتی ہوئی اسکول چلی جاتی ہے جس کے پیدا ہوتے ہی کیپٹن آفتاب کا چہرہ رسمی چہرہ بن گیا۔ فلائٹ پر جاتے ہوئے کہے گئے خدا حافظ کاغذ کے بے جان پرزوں کی طرح منھ سے نکل کر ہوا میں اڑنے لگے۔ اس کی دوسری بیٹی جس نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا تھا مگر ماں کی کوکھ سے جنم لیکر ماں ہی کی زندگی جہنم بنا بیٹھی نہ اس نے خود نے پیار کے دو بول سنے اور نہ ماں کے لیے کچھ رہنے دیا۔

آفتاب جو فلائٹ پر کبھی اس سے ملنے ہوسٹل آتا تھا بچیاں

پیدا ہوتے ہی پتھر چہرہ ہوگیا۔ الفاظ نشتر ہوگئے اور وہ اجنبی مرد ہوگیا۔ اور ایک دن اوپر سوا مہینے کا بیٹا۔ جسے فیڈر سے دودھ پلایا جاتا ہے ورنہ شاید اسی بہانے وہ ماں کے سینے سے لگ سکتا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ تیسری بار ہسپتال جارہی تھی ـــــ صحن میں ہمیشہ کی طرح محلّے کی عورتیں جمع تھیں ستارہ اپنے بیڈروم سے نکلی پورے دن کا پیٹ پیروں سے سہارا نہ جارہا تھا۔ وہ پورے اعتماد سے صحن سے گزر کر گیٹ تک آئی اور کار میں بیٹھ گئی۔ اس نے نہ کسی سے دعا کی خواہش ظاہر کی نہ منتوں کی التجا کی نہ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے نہ اس نے بجلی والی کا ہاتھ اپنے سر پر رکھے جانے کا انتظار کیا تھا۔ بیچاری دعاؤں سے بھی بے نیاز ہوگئی؟"

صحن میں بھری عورتوں میں سے کسی نے کہا تھا اور سب کی سب آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

ایک ہفتے بعد ستارہ ہسپتال سے گھر لوٹی تو اس کی گود میں بیٹا تھا۔ وہ بیٹے کو لیکر اس طرح گھر میں داخل ہوئی جیسے دوسروں کی پسند کا مال خرید کر دکھانے لائی ہو۔ سارے محلّے میں ہلچل مچ گئی۔ بنگلہ عورتوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔

"ماشاء اللہ ستارہ بی بی کی مراد پوری ہوگئی"! کسی نے کہا تھا۔

"بچّہ ذرا کمزور ہے بی بی احتیاط کی ضرورت ہے"۔

کمزور ہے تو کیا ماں ڈاکٹر ہے ٹھیک کرلے گی"۔

ماشاء اللہ بیٹیاں تو بڑی خوبصورت ہیں گوری ناری اس کا رنگ کالا کیوں ہے؟ کس پر گیا ہے۔ باپ پر گیا ہوگا"۔

"اجی بیٹے کا کیا ہے۔ گھی کے لڈو ٹیڑھے بھی بھلے ہوتے ہیں۔"

"بیٹا تو باپ پر ہی جائے گا۔"

"لو نج۔ باپ تو گورا لانبا ہے۔ کسی کالے کا پرچھاواں پڑ گیا۔"

ستارہ سوچتے سوچتے سو گئی۔

شام کے چار بج رہے تھے جب اس کی آنکھ کھلی۔ کیپٹن آفتاب ابھی نہ آیا تھا۔

دونوں بچیاں بیڈروم میں سو رہی تھیں۔ بیٹا اس کے بیڈ کے ساتھ لگے پالنے میں کھیل رہا تھا۔

ستارہ نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے، بال درست کیے اور ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ ڈیکوریشن والے قمقمے اور کرسیاں وغیرہ لگا کر جا چکے تھے۔ رنگین قمقموں کی روشنی دن کے اجالے میں ماند تھی۔ ابھی ان میں شوخی اور چمک نہ آئی تھی۔

"ستارہ بی آخر وہ لمحہ آ ہی گیا۔" ستارہ نے سوچا اور کریم کو بلا کر ٹیکسی لانے کو کہا۔ کریم ٹیکسی منگانے پر حیران ضرور ہوا۔ مگر چپ چاپ ٹیکسی لانے چلا گیا۔

گیٹ سے کیپٹن آفتاب جلتے ہوئے قمقموں اور قطار اندر قطار لگی کرسیوں کو تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا داخل ہوا۔ ستارہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہیلو" کیپٹن آفتاب نے بریف کیس اور ہینڈ بیگ زمین پر رکھتے ہوئے ستارہ سے کہا۔

ستارہ کچھ نہ بولی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔"

"میں تیار ہوں۔"

"کیا خاک تیار ہو۔ صورت دیکھو جیسے رو رہی ہو۔"

"یہ سچ ہے میں رو رہی ہوں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ میں تیار ہوں۔ کریم ٹیکسی لینے گیا ہے۔ ٹیکسی آتے ہی میں چلی جاؤں گی۔ تم طلاق کے کاغذات ہسپتال کے پتہ پہ بھجوا دینا۔"

"ستارہ یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

میں نے کہا نا کہ میں اس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہی ہوں۔ میں اس چھت کے نیچے سانس بھی نہیں لے سکتی جس چھت کے نیچے تم رہتے ہو۔

"کریم نے آکر اطلاع دی کہ ٹیکسی آگئی ہے۔ ستارہ گیٹ کی طرف چل دی۔ آفتاب ستارہ کے چہرہ پہ فیصلہ کن تاثر دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا — "ستارہ ہمارا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور اب تو جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ قوت ارادی سے کام لو مجھے پائلٹ چاہیے اور تم نے پائلٹ پیدا کر دیا۔ اب ہم دونوں مل کر اسے ماہر ہوا باز بنائیں گے۔ مایہ ناز پائلٹ بنائیں گے۔"

"کیپٹن آفتاب سنو۔ میں نے پائلٹ نہیں بجلی والا پیدا کیا ہے اب اسے پائلٹ تم بنا لینا۔"

ستارہ نے ٹیکسی میں بیٹھتے بیٹھتے آفتاب سے آہستہ سے کہا اور ٹیکسی چل دی۔

طاہر آفریدی

بیری کا درخت

اس کو خود بھی یہ معلوم نہ تھا کہ وہ یادیں جو اس نے اپنی زندگی سے نکال دی تھیں اب اچانک اتنی شدّت سے اس پر غلبہ کیوں حاصل کر رہی ہیں۔ وہ یادیں جو تقریباً پندرہ سال پہلے اس نے اپنی زمین میں دفن کی تھیں، اُس دن جب وہ فرار ہو کر اپنی جان بچانے کے لیے اپنے گاؤں کو چھوڑ رہا تھا۔ وہ اتنی تیزی سے بھاگ رہا تھا کہ اگر ذرا سا بھی رک جاتا تو اس کی زندگی یقیناً ان دونوں کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی جو اب سے تھوڑی دیر قبل اس نے بغیر کسی ارادے کے ختم کی تھیں۔ اب وہ ایک قاتل بن چکا تھا۔ اس نے دو قتل کیے اور اب وہ پولیس کا مجرم تھا۔ رواج اور دستور کا مجرم تھا۔ اب اس کی زندگی صرف

اس صورت میں بچ سکتی تھی کہ وہ آزاد علاقے میں چلا جائے۔ اور وہاں بھی اپنی شرافت کا ثبوت دے اور وہاں کے لوگ اُس کو پناہ دیں اب اگر وہ اپنا گاؤں اپنی زمین اور جائیداد چھوڑ کر اپنی جان نہ بچائے تو فوراً اپنے دشمنوں کی گولیوں کا شکار ہو جائے۔ یا پولیس کی زنجیریں جیل کی کوٹھریاں۔ پھر پھانسی کا پھندہ اس کا نصیب بن جائے۔

اب اس کی وہ رنگین دنیا اجڑ چکی تھی جو اُس نے اپنے تصوّر میں بسائی تھی۔ وہ حسین دنیا جو ہر نوجوان اپنے خیالوں میں بسا لیتا ہے۔ چند روز بعد اس کی شادی کی تیاریاں ہونے والی تھیں۔ اس کی شادی کی بات ریشمینہ کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس ریشمینہ کے ساتھ جو گاؤں کی ہر خوبصورت لڑکی سے زیادہ حسین تھی۔ جو اُس کی ہر سانس میں خوشبو کی طرح بسی ہوئی تھی۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

پرسوں رات اس کا پانی کا نمبر تھا وہ رات کا کھانا کھا کر اور دو پیالی گڑ کی چائے پی کر ہی گھر سے نکلا تاکہ نمبر آتے آتے وہ کھیتوں پر پہنچ جائے۔ جب رات کی سیاہ چادر نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور آسمان پر ننھے ننھے تارے ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے تو وہ اپنی درے والی رائفل جو اُس نے چند مہینے پہلے درے سے بنوائی تھی، کندھے سے لٹکا کر بیلچہ سنبھالتا ہوا کھیت کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ بڑی نہر سے کاٹی گئی چھوٹی سی شاخ پر سے چھلانگ لگا کر گنے کے کھیت کے پاس پہنچا تو وہیں سے قادر کو آواز دینے لگا۔

قادر نے جواب میں کہا کہ ۔

"آجاؤ یار آجاؤ ۔ اب نمبر تمہارا ہی ہے ۔ میرا کھیت ویسے بھی سیراب ہو چکا ہے ۔"

اور جب وہ گنے کے کھیت سے ہوتا ہوا قادر کے پاس پہنچا تو وہ بیلچے سے مٹی اٹھا کر اپنے کھیت کا پانی بند کر رہا تھا ۔ اور پانی کا رخ نصیر خان کے کھیت کی طرف کر دیا تھا ۔ "واہ ۔ زندہ باد قادر!"

نصیر خان نے خوش ہو کر نعرہ لگایا ۔

پانی تیزی سے نصیر خان کے کھیت کو سیراب کرنے لگا ۔ وہ دونوں پولا پر بیٹھ گئے ۔ اب چاند بھی دو پہاڑوں سے سر ابھار کر اپنا عکس دیکھ رہا تھا ۔ اور وہ دونوں چاندنی میں بہتے ہوئے پانی کو دیکھ رہے تھے ۔ اور خوش ہو رہے تھے ۔ قادر خوش تھا کہ اس کا کھیت پوری طرح سیراب ہو چکا تھا اور نصیر خان خوش ہو رہا تھا کہ اس کا فصل سے لبا لب بھرا کھیت پانی پی رہا تھا ۔ قادر نے جیب سے پائپ جیسا ایک لونگا نکالا اور تمباکو بھر کر دونوں باری باری پینے لگے ۔ اور نصیر کی شادی موضوع گفتگو بن گئی ۔ قادر اس کا دوست تھا کیوں کہ دونوں کے کھیت ساتھ ساتھ تھے اس لیے وہ دونوں بھی ایک ساتھ رہتے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے ۔ قادر کی بیوی جب اس کے لیے روٹی یا چائے لاتی تو وہ نصیر خان کو آواز دیدیتا اور نصیر خان بلا تکلف اپنے بیلوں کی جوڑی ایک طرف روک کر اور بیلچہ کدال ایک جانب ڈال کے قادر کے کھانے پینے میں شریک ہو جاتا ۔ اس طرح نصیر خان بھی اپنی ماں

کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا قادر کو کھلاتا۔

"اچھا نصیر خان ـــ شادی کا دن کون سا مقرر کیا ہے؟"
قادر نے پونگا پیتے ہوئے پوچھا۔

"ارے یار اتنی جلدی کہاں۔ ابھی تو صرف بات ہی چل رہی ہے۔" نصیر خان نے ہنس کر کہا۔

"کچھ ہو یار ـــ تم شادی کرو یا نہ کرو ہمیں تو چاول کھانا اور گلنار کا ناچ دیکھنا ہے۔ خدا کی قسم حجبے کے کھلے میدان میں جب گلنار ناچتی ہے تو مسجد کے امام تک دیوار پر سے سر اٹھا کر جھانکتے ہیں اور تسبیح بھول جاتے ہیں۔" اور پھر دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر بعد قادر نے اٹھتے ہوئے کہا ـــ "اچھا نصیر خان اب میں چلتا ہوں۔" جب دوسرا پہر شروع ہوگا اور چاند آدھے سے زیادہ سفر ختم کرلے گا تو تمہارا کھیت سیراب ہو چکا ہوگا۔ اور ایوب تیرے کھیت کے پوسے پر حاضر ہوگا۔ بلکہ اس سے پہلے تمہیں آواز دے گا۔"

نصیر خان کے کھیت کے بعد ایوب کے کھیت شروع ہوتے تھے اور پانی کا نمبر بھی بعد ہی میں آتا تھا۔ وہ اکثر نصیر خان کے ساتھ کسی نہ کسی بہانے لڑتا تھا۔ کبھی پانی کے نمبر پر اور کبھی مویشیوں کے چارے پر۔ بہر حال وہ کچھ نہ کچھ بات جھگڑے کے لیے تلاش کرتا تھا۔ اور پھر گاؤں کے سفید پوش بیچ میں آکر رفع دفع کرتے تھے۔ نصیر خان بیلچہ اور بندوق کاندھے پر رکھے کھیت کے کنارے کنارے گھومتا تھا کہ پانی کہیں پولا توڑ کر رخ تبدیل نہ کرلے یا کوئی اور خصوصاً ایوب پانی چوری نہ کرلے۔ ایوب اکثر یہی حرکت کرتا تھا۔ جب قادر یا نصیر خان کے پانی کا نمبر ہوتا

تھا تو وہ دونوں کھیت کے پولے پر بیٹھ جاتے تھے اور پونگے میں تمباکو بھر کر پیتے تھے۔ اور بے فکر ہو کر گپ شپ لڑاتے تھے۔ اس دوران ایوب چپ کے آتا تھا اور پانی کا کچھ حصّہ کاٹ کر اپنے کھیتوں کی طرف بہائے جاتا تھا۔ کئی دفعہ گاؤں والوں نے اس کو اس حرکت پر لعنت ملامت بھی کی تھی مگر وہ اس قسم کا آدمی تھا کہ جب تک دوسروں کا حصّہ اپنے حصّے میں شامل نہ کرتا اسے چین نہ آتا تھا۔ وہ کبھی اپنے حق اور حصّے پر قناعت نہ کرتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ دونوں بڑے لالچی اور حریص تھے۔ کیوں کہ وہ نصیر خان کے قریبی عزیز تھے اس لیے بھی نصیر خان ان کی حرکتوں سے چشم پوشی کر جاتا تھا۔ مگر وہ دونوں باز نہ آتے تھے۔ ایک دفعہ قادر نے اس سے کہا تھا۔

"نصیر خان مجھے ایوبے اور اس کے بیٹے کی نیت میں فتور نظر آتا ہے۔ ان دونوں کی آنکھوں میں لالچ کا میل ہے تم ذرا احتیاط سے رہنا۔ تمہارے بعد تمہاری جائیداد کا وارث بھی یہی ایوبے بنے گا۔ خدانخواستہ کہیں۔" مگر اس نے (ان) ہار قادر کی بات کو لاپروائی سے اس بات کو ختم کر دیا۔ لیکن دل میں قادر کی بات کا قائل ہو گیا۔ اس دن سے نصیر خان محتاط بھی ہو گیا تھا۔ اس کو اپنے باپ کی موت بھی یاد آ گئی جو بظاہر ٹھنڈے پانی میں گرنے سے واقع ہوئی تھی۔ پھر اس نے دو رے والی بندوق اپنی حفاظت کی خاطر خرید لی۔ بغیر لائسنس کی بندوق کا ڈر بھی تھا کہ کہیں پولیس کا سامنا نہ ہو جائے۔ مگر اس کے سوا دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ ویسے دیہاتوں میں پولیس گشت اس صورت میں ہوتا تھا جب کوئی واردات ہو جائے

البتہ بارڈر پولیس کبھی کبھی آجاتی تھی مگر تھانے والے گاؤں کے نمبردار کو پہلے سے بتا دیتے اور نمبردار گاؤں والوں کو خبردار کر دیتا۔ جس دن گشت ہوتا اس دن گاؤں والے اپنا اسلحہ گنّے کے کھیت میں چھپا دیتے تھے۔

نصیر خان جب اپنے کھیت کے آخری سرے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں چوہے نے ایک سوراخ کیا تھا اور اس سوراخ سے پانی ایوّبے کے کھیت میں جا رہا تھا۔ اگر نصیر خان وہاں نہ آتا تو پانی مٹی کاٹ کاٹ کر سوراخ کو اور بڑا کر دیتا جس سے کھیت خراب بھی ہوتا اور خشک بھی رہ جاتا۔ ویسے ایوّبے اسی طرح کا سوراخ کرتا تھا اور پھر کہتا کہ یہ تو چوہے نے کیا تھا ـــــ.........

نصیر خان نے بیلچے سے مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کیا۔ جب چاند نے آدھا سفر طے کیا اور پچھلا پہر شروع ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایوب اپنے بیٹے کے ساتھ بیلچہ لیے کھیت کے پولے پر آ رہا ہے۔ اس نے نصیر خان سے کوئی بات کیے بغیر تاروں کو دیکھا جیسے اپنے نمبر کا اندازہ لگا رہا ہو ـــ اور پھر پانی کا رُخ اپنے کھیتوں کی طرف موڑ دیا۔

دوسرے دن سورج کی تپش سے زمین اس قابل ہوئی کہ اس میں ہل چل سکے۔ نصیر خان نے صبح سویرے دونوں بیلوں کو ہانکتے ہوئے ہل کاندھے پر رکھا اور کھیتوں کو جانے لگا۔ اس کے دونوں بیل تندرست اور چاق و چوبند تھے وہ بہت تیزی سے ہل کو کھینچ رہے تھے اور جب سورج آدھے آسمان تک پہنچا تو آدھے سے زیادہ کھیتوں کی زمین کاشت کے لیے تیار ہو چکی

تھی۔ نصیر خان پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے بیل کھول کر بیری کے بڑے درخت کی چھاؤں میں باندھ دیے۔ اور خود چپلوں کو پیروں سے اتار کر ان کی مٹی جھاڑنے لگا۔

جب بھی سورج کی تمازت بڑھ جاتی تھی اور نصیر خان کام سے تھک جاتا تھا تو سہ پہر تک بیری کی اس ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرتا تھا۔ اس بیری کا پودا اس نے بچپن میں لگایا تھا جو اب تناور درخت تھا۔ اور اب اس میں لکڑیوں کے علاوہ ایک بڑا شہتیر بن گیا تھا جو گھر کے بڑے کمرے کے لیے بہت مناسب تھا۔ اس کو یہ بیری کا درخت اچھا لگتا تھا اس لیے شہتیر کو کاٹنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ جس طرح بہت سے لوگ اپنے گھر کی مرغیاں بکرے اور دُنبے ذبح نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح اس نے بھی اس درخت کی لکڑی نہیں کاٹی۔ ویسے بھی اس کے گھر میں ضرورت سے زیادہ کمرے تھے۔ صحن اور دالان اور مویشیوں کے باندھنے کا باڑہ الگ تھا۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں آتا تھا اس کا باپ دن بھر ہل چلاتا تھا یا کھیتوں میں گوڈی کرتا یا پھر کدال اور بیلچہ چلاتا۔ اور وہ کھیتوں میں لگی سبزیوں کے پودوں سے کھیلتا۔ اس نے بیری کا پودا ایک جگہ دیکھا جس کا تخم زمین پر گر کر پودے کی شکل میں نکل آیا تھا۔ اس نے باپ سے کہا کہ اس پودے کو میں کہیں لگانا چاہتا ہوں اور باپ نے اس کو ایک نہایت مناسب جگہ بتا دی۔ اس نے اس ننھے سے پودے کو مٹی کے ساتھ نکال کر باپ کی بتائی ہوئی جگہ پر لگا دیا۔ اور پھر جب بھی باپ کے ساتھ کھیتوں پر آتا تو اپنے چھوٹے

چھوٹے چلوؤں میں نالے سے پانی بھر کر لاتا اور بیری کے پودے میں ڈالتا۔

جب ریشمینہ اس کے ساتھ ہوتی تو وہ اس کو بیری ضرور دکھاتا اور کہتا۔ "جب یہ بیری کا درخت بڑا ہو جائے گا تو میں اس میں جھولا ڈالوں گا اور اس میں جھولتا رہوں گا اور اس کے سرخ سرخ میٹھے میٹھے بیر کھاتا رہوں گا مگر میں نہ تو کسی کو جھولے میں بٹھاؤں گا اور نہ کسی کو بیر دوں گا۔"

"مجھے بھی نہیں دوگے۔؟" ریشمینہ پوچھتی اور اس کے کانوں میں رس گھولتی۔

"نہیں تجھے کیوں جھولے پہ بٹھاؤں۔ کیوں بیر دوں۔" وہ ریشمینہ کو چھیڑتا اور جب ریشمینہ روٹھ جاتی اور گھر جانے لگتی تو وہ گھبرا جاتا اور جلدی سے کہتا۔

"نہیں نہیں ریشمینہ میں تو تمھیں دن بھر جھولا جھلاتا رہوں گا۔ اور بیری پہ چڑھ چڑھ کے سرخ سرخ بیر تیرے لیے چنوں گا۔"

اور ریشمینہ خوش ہو کر ہنستی۔ اس کی ہنسی پہ وہ اپنے دل میں ایک انجانا سا کیف اور سرور محسوس کرتا۔ اس کو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے پہاڑوں میں بانسری بجائی ہو۔ جیسے ریشمینہ کی ہنسی کے ساتھ کلیاں بھی مسکرائی ہوں۔

جب درخت بڑا ہو کر بیر دینے لگا تو وہ دونوں بھی اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ اس درخت میں نہ تو جھولا ڈال سکتے تھے اور نہ ایک ساتھ بیر توڑ سکتے تھے۔

ریشمینہ پہ گاؤں کے رواج اور دستور نے پہرے بٹھا دیے اور حیا، شرم اور ادب نے اسے پردوں میں چھپا دیا۔

اب بیری کے اس درخت میں زرد زرد اندر سُرخ سُرخ بیر نکل آئے تھے۔ مگر وہ سرور اب کہاں جو نصیر خان کو بچپن میں محسوس ہوتا تھا۔ اب تو نہ ریشمینہ اس کے ساتھ اس بیری کے پاس نہیں آسکتی اور نہ جھولا ڈال کر اس میں بیٹھ سکتی اور نہ بیر کھا سکتی۔ بچپن کی باتیں خواب وخیال کی باتیں ہوتی ہیں اور خواب وخیال کی باتیں ہمیشہ سچ نہیں ہوتیں۔

ان دونوں نے سرخ بیروں اور جھولے کی آرزو کی تھی اور جب بیر آگئے اور جھولا ڈالنے کا وقت آن پہنچا تو ان دونوں کے درمیان کئی دیواریں حائل ہو چکی تھیں۔ نصیر خان اکیلا بیر توڑتا مگر اس کے ساتھ جھولی پھیلائے درخت کے نیچے ریشمینہ نہ ہوتی۔

وہ بیر توڑ کر گاؤں کے بچّوں میں تقسیم کر دیتا۔

ایک دن جب اس نے بہت سے بیر جمع کیے تو اسے شدّت سے ریشمینہ یاد آئی۔ اور وہ کافی دیر تک بیر کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔

"کاش آج یہ بیر ریشمینہ تک پہنچ سکتے"

اس نے سوچا۔

وہ بیروں سے بھری جھولی گھر لے گیا اور جب ماں کے پلّو میں انڈیلنے لگا تو آہستہ سے کہا۔

"ماں یہ بیر بہت زیادہ ہیں۔ گاؤں کے بچّے روز روز کھاتے ہیں آج تو امیر خان چاچا کے گھر بھی بھیج دو"

"مگر امیر خان کے گھر تو کوئی بچّہ نہیں" ماں نے کہا۔ اور پھر خود ہی کہا "وہاں ریشمینہ تو ہے۔ وہ کھائیگی"

اور پھر اٹھی سرخ بیروں سے بھرا پلّو لیکر امیر خان کے گھر جانے لگی۔ نصیر خان کو اس بات کا پتا نہ چل سکا کہ اس کی ماں اس کی بات سمجھی یا نہ سمجھی مگر وہ اس بات پر خوش ہوا کہ کسی نہ کسی طرح بیر ریشمینہ تک پہنچ گئے۔

وہ رات قیامت کی رات تھی۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ گاؤں کے بزرگ کہتے تھے کہ ہماری زندگی میں اتنی سخت سردی نہیں پڑی تھی۔ اس دفعہ پہاڑوں پر اتنی شدید برف باری ہوئی تھی کہ میدانی علاقوں تک پانی گڑھوں میں جم چکا تھا۔ بچے ماؤں کی گودیں کانپ رہے تھے۔ اور بڑے گرم لباس پہنے لحافوں میں دبکے رہتے تھے۔ اور جب سورج اپنی تمازت لیے چڑھ آتا تو پھر یہ لوگ گھروں سے نکل آتے اور دھوپ تاپتے۔ مگر کہتے ہیں کہ بارش ہو، آندھی یا طوفان ہو یا کڑی دھوپ۔ زمینوں میں کام کرنے والے کام کرتے ہی رہتے ہیں اگر کوئی شخص سردی گرمی سے گھبرا گیا تو اسے زمین فصل نہیں دیتی۔

نصیر خان کو بخار تھا اور رات کو اس کا پانی کا نمبر بھی تھا۔ اس کے باپ نے بیلچہ اٹھایا، گلوبند کانوں سے باندھا اور لمبا کوٹ پہن کر جانے سے پہلے دو تین پیالی گرم چائے پی جس میں خشخاش کا بورا بھی شامل کیا گیا تھا۔

نصیر خان نہ چاہتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا بوڑھا باپ اس سرد اور اندھیری رات میں پانی دینے کے لیے کھیتوں میں جائے۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا مجبوری تھی۔ گاؤں کی کہاوت ہے کہ باپ کا جنازہ چھوڑا جا سکتا ہے مگر پانی

نہیں۔ اس کا بوڑھا باپ پانی کا نمبر لگانے چلا گیا اور جب سورج کی زرد کرنیں گاؤں اور کھیتوں پر پڑیں تو کسی نے دیکھا کہ نصیر خان کا بوڑھا باپ ہاتھ میں بیلچہ لیے نالے کے درمیان اوندھے منہ پڑا ہے۔ اور یخ پانی اس کے اردگرد اور اوپر سے گزرتے ہوئے کھیتوں کو سیراب کر رہا تھا۔ اس کا وجود سخت سردی کی وجہ سے لکڑی کی مانند اکڑ گیا تھا۔ داڑھی کے سفید بالوں کا رنگ مٹی نے سوکھی گھاس کی مانند بھورا کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے بے جان جسم کو گرم پانی سے حرارت پہنچا کر سیدھا کیا گیا۔

اور جب شام کے سائے پھیل رہے تھے تو اسے منوں مٹی تلے دبایا جا چکا تھا۔

دفنانے کے بعد لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے ان کو تعجب تھا کہ اتنی چھوٹی سی نالی میں گر کر اٹھ نہ سکے۔ وہ تو ابھی کئی جوانوں پر بھاری تھا۔ لوگ دبی دبی زبان میں اور اشاروں کنایوں میں ایوب کا نام لیے بغیر زرین خان کی موت پر تبصرہ کر رہے تھے۔

اب تمام تر ذمہ داری نصیر خان کے کندھوں پر آپڑی تھی۔ اور وہ بڑی خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہا تھا۔ اس کی ماں نے ریشمینہ کے والد سے رشتے کی درخواست کی اور اس نے چند دن کی مہلت طلب کی۔ اور یہ چند دن نصیر خان بڑے اضطراب اور بیقراری سے گزار رہا تھا۔

نصیر خان کو ویسے یہ یقین تھا کہ ریشمینہ کے والد کے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے اور یہ کچھ روز کی مہلت تو ایک قسم

کی رسم ہے جو رشتہ آنے پر سارے ہی لڑکی والے پوری کرتے ہیں کہ کل کو یہ کوئی نہ کہے کہ لڑکی کو بوجھ سمجھ رکھا تھا ادھر پیغام آیا اور ادھر رخصت کیا۔

پرسوں رات کو جو کھیتوں میں پانی دیا گیا تھا تو مٹی اب اس قابل ہو گئی تھی کہ وہاں ہل چلایا جا سکے۔ صبح اذان ہوئی تو نصیر خان اٹھا۔ بیلوں کو کھول کر ہل کندھے پر رکھا اور بندوق ہاتھ میں لیکر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ چلتے وقت ماں نے مصلے سے اٹھ کر اس پر دم کیا اور کہا تھا۔ "بیٹا آج بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے خدا خیر کرے۔ کھیتوں میں ذرا خیال سے رہنا۔ اس ایوب کی خو اچھی نہیں ہے"

وہ ماں کی بات سن کر ہنسا اور کہا۔

"ایوب مجھے کیا کہے گا۔ تم فکر نہ کرو ماں۔ میں محتاط رہوں گا"

مگر ماں ۔ ماں تھی ۔ اس کو تو فکر ہونی چاہیے تھی۔ اور جب سورج پہاڑوں سے نکل کر اس کے کھیتوں پر دھوپ کی بارش کرنے لگا تو وہ آدھے سے زیادہ کھیت میں ہل چلا چکا تھا۔ اس کے بیل طاقتور اور تیز تھے۔ ہل کو کھینچتے ہوئے یوں لگ رہے تھے جیسے ابھی زمین کے سینوں کو چیر کر رکھ دیں گے وہ بیلوں کو ہانکتا رہا اور اپنے خیالوں میں شادی کا منصوبہ بناتا رہا۔ میری شادی ایسی ہونی چاہیے کہ پورا گاؤں ایک عمر تک یاد رکھے۔ قادر تو گلنار کو ناچنے اور گانے کے لیے ضرور بلائے گا اور اسے آنا بھی چاہیے۔ مگر گلنار کا نام سن کر دور دور سے لوگ آئیں گے۔ مہمانوں کے لیے

چاہئے روٹی کا بندوبست بھی اچھا ہونا چاہیئے تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ شادیاں کرتے ہیں مگر مہمانوں کی مدارات نہیں کرتے۔

اب وہ اندازہ لگانے لگا کہ کتنے مہمان شادی پر آئیں گے شکر ہے۔ کہ اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ گزشتہ سال گڑ بھی بہت کچھ ہوا۔ ادھر مرچ، تمباکو کی فصل بھی اچھی تھی۔ گھر میں سب کچھ موجود ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔ رہی مہمانوں کی خدمات تو قادر جیسے دوست موجود ہوں گے۔ جو سب کا ہر طرح خیال رکھیں گے۔

نصیر خان کے بیل کھیت کے آخری سرے پر جب پہنچے تو اس وقت دو فائر ہوئے اور دو گولیاں دونوں بیلوں کے کولہے میں پیوست ہو گئیں۔ بیل اچھل کر اور ہل کو توڑتے ہوئے بھاگے۔ اسی لمحے نصیر خاں نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اور جب دوسری مرتبہ فائر ہونے لگے تو وہ اپنی رائفل تک پہنچ گیا تھا۔ فوری طور پر اس نے بھی جواباً گولیاں چلائیں۔ گولی ایوبے کے بیٹے کی پیشانی پر ایک سرخ لکیر بناتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ ایوبے بدحواس ہو کر اور اوپر اٹھ کر فائر کرنے لگا مگر نصیر خان کی دوسری گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ بھی گر پڑا یہ سب کچھ اتنی جلدی اور تیزی سے ہوا کہ نصیر خان کو سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہ ملا بس دو گولیاں چلیں اس کے جواب میں اس نے بھی دو گولیاں چلائیں اور دو زندگیاں ختم ہو گئیں اور تیسری مستقبل کے اندھیروں میں دھکیل دی گئی اور دو گھر تباہ ہو گئے۔ اب وہ

ایک قاتل بن چکا تھا - اب اگر وہ یہاں گاؤں میں رہتا تو رشتے دار دشمن اس کو زندہ نہ چھوڑتے اور اگر وہ ان سے کسی طرح بچ بھی جائے تو زنجیریں ہتھکڑیاں اور جیل کی تاریک کوٹھری اور پھر پھانسی کا پھندہ اس کے انتظار میں ہوگا -

اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر اس کو اپنی زمین اپنا گاؤں اور اپنے رشتے دار سب ہی دشمن معلوم ہوئے - اسے ایسا محسوس ہوا کہ سب گاؤں والوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں - بندوقیں ہیں - چھریاں ہیں اور زنجیریں ہیں اور سب اس کے تعاقب میں ہیں ـــ پھر اس نے دور ـــ بہت دور ان اونچے پہاڑوں کی طرف دیکھا جو شان بے نیازی سے سر اٹھائے کھڑے تھے - اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ پہاڑ اس کی زندگی کے محافظ ہیں اگر اسے پناہ مل سکتی ہے تو صرف ان پہاڑوں کے چوڑے سینے ہیں - ورنہ ساری زمین اس پر تنگ ہو گئی تھی - اس نے سنا تھا کہ ان پہاڑوں پر بسنے والوں کے سینے بھی اتنے بڑے اور کشادہ ہوتے ہیں جتنے بڑے یہ پہاڑ ہیں - مجھے اسی طرف جانا چاہیے ـــ پھر آخری نظر اپنی زمین پر - کھیتوں پر ڈالی جن میں تھوڑی دیر قبل وہ حسین مستقبل کی فصل اگانے کے خواب دیکھ رہا تھا - مگر اب خوابوں کی کھیتی جل گئی - اس کے مستقبل کی فصل مرجھا گئی - امیدوں کے چمن اجڑ گئے - اس نے اپنے زخمی بیلوں کو دیکھا جو بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے - وہ بیر کا درخت جو بہت بے نیازی سے کھڑا تھا جس کے لیے وہ بچپن میں چلوؤں اور لوٹوں میں پانی بھر بھر کر لاتا تھا - جس

ہیں اب پیلے پیلے سرخ سرخ بیر لگے تھے اور جب سے اس نے ایک بار جھولی بھر کے بیر ماں کے ہاتھوں رشمینہ کو بھجوائے تھے۔

اب وہ کبھی اس بیری کے بیر نہیں کھا سکے گا۔

اس نے حیرت سے بیری کے درخت کو دیکھا جس کی چھاؤں میں وہ کڑی دھوپ کے وقت آرام کیا کرتا تھا۔ اب شاید ہی اس درخت کا سایہ اس کو میسر ہو۔ اس کے دائیں طرف کانٹوں کی وہ باڑھ تھی جس میں سے اس پر دو گولیاں ایک ساتھ چلی تھیں اور جہاں اب دو لاشیں پڑی تھیں جن سے اب بھی خون کی بوندیں رس رہی تھیں ۔ وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر ایک فیصلہ کیا۔ شلوار کے پائینچے اٹھائے اور ان دونوں لاشوں کو پھلانگتا ہوا دوڑا۔ سامنے گنے کے کھیت ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ وہ ان کھیتوں میں گھس گیا پیچھے گاؤں کی طرف سے ایک شور امڈ رہا تھا۔ جس میں چیخنے چلانے کی آوازوں کے ساتھ گالیاں بھی شامل تھیں ـــــ کوئی کہہ رہا تھا۔

"جلدی کرو ـــ کھیتوں میں گھیرا ڈال دو ـــ دیکھو زندہ نہ جانے پائے"!

وہ کھیت در کھیت ہوتا ہوا نہر کے کنارے کنارے نالے پر پہنچا جہاں وہ اکثر آتا تھا اور بھینسوں اور بیلوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔ مگر وہ اس مانوس جگہ پر بھی نہ ٹھہرا ـــ وہ تو بھاگ رہا تھا ـــ اپنی زمین سے۔ اپنے کھیتوں سے۔ اپنے رشتے داروں سے ـــ اپنے دشمنوں سے ـــ اور پولیس سے ـــ اس کا سانس پھول چکا

تھا ۔ اس کے پیر سوج گئے تھے ۔ مگر وہ بھاگ رہا تھا ۔
جب وہ ملک فیروز کے حجرے پر پہنچا تو سورج پہاڑوں پر سجدہ کر رہا تھا ۔ حجرے میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے ۔ چاروں طرف چارپائیاں پڑی تھیں ۔ حقہ پیا جا رہا تھا ۔ ملک فیروز ایک چارپائی پر تکیہ سے ٹیک لگائے اس شان سے بیٹھا تھا کہ اور لوگ اس کے احترام میں جھکے ہوئے نظر آ رہے تھے ۔ ایک لڑکا بھری ہوئی چلم تھامے اس کے سامنے جھکا ہوا تھا ۔ اور وہ چلم کی نے منہ میں دبائے بیٹھا ۔ نصیر خان نے حجرے کے صحن میں آ کر السلام علیکم کہا ۔ وہ اب بھی اتنا بدحواس نظر آ رہا تھا جیسے دشمن اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ جائے گا ۔ تھکاوٹ گرد کے مانند اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہی تھی ۔ ملک فیروز نے کہا ۔

"آؤ ۔ آؤ ۔ میلمہ (مہمان) بخیر راغلے ۔ آؤ بیٹھو ۔ معلوم ہوتا ہے بہت دور سے آئے ہو اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تو بہت جلدی میں تقریباً بھاگتے ہوئے آئے ہو ۔"
پھر اس نے اپنے ساتھ چارپائی پر جگہ دیدی کسی نے ایک تکیہ لا کر اس کے پیچھے رکھ دیا ۔ اور اس کی رائفل لیکر کھونٹی پر ٹانگ دی ۔ پھر لڑکا دوڑ کر مٹکے سے کٹورے میں پانی بھر کر لایا اور نصیر خان کو دیا ۔ ملک فیروز نے ایک شخص سے کہا ۔

"جا کر ۔ ایک چینک چائے بنا کر لا دو ۔ میلمہ بہت تھکا ہوا ہے ۔" پھر نصیر خان سے مخاطب ہوا ۔
"چپل اتار دو اور آرام سے بیٹھ جاؤ ۔

جب نصیر خان نے چائے کی چوتھی اور آخری پیالی پی لی تو مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ ملک فیروز کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھا۔ اس کے ساتھ سب لوگ اٹھ کر مسجد جانے لگے۔ نصیر خان چونکہ تھکا ہوا تھا اس لیے وہ حجرے ہی میں بیٹھا رہا۔ نماز کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے کھانا لانے لگے۔ قبائلیوں کا رواج ہے کہ حجرے میں مہمان خواہ ایک ہو مگر روٹی سالن سب کے گھر سے آئے گا اور جب تک آخری آدمی روٹی نہ لائے اس وقت تک کھانا شروع نہیں کیا جاتا۔

یہاں امیر غریب کا فرق نہیں سمجھا جاتا کسی کے ہاں سے مرغ آئے یا گوشت کوئی دال لائے یا ساگ روٹی گندم کی ہو یا مکئی کی۔ سب ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ اور یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ کس کے ہاں سے کیا آیا ہے۔

اس طرح ملک فیروز اور مہمان کے ساتھ سب ایک دری بچھا کر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔

کھانے کے بعد ملک فیروز نے پوچھا۔

"میلمہ (مہمان) کہاں سے آ رہے ہو؟"

نصیر خان نے اپنے گاؤں کا نام بتایا اور اسے سارا قصّہ سنا دیا۔ فیروز خان نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یہ اونچے اونچے پہاڑ قدرت نے ایسے لوگوں کے لیے ہی بنائے ہیں جن کے لیے اس کھلی زمین پر قدم رکھنے کی جگہ نہ ہو۔ نصیر خان تم بالکل فکر مند نہ ہو۔ تمہارے دشمن کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہوں مگر وہ یہاں تم سے

بدلہ لینے کی غرض سے قدم نہیں رکھ سکتے ۔ یہ فیروز خان کا قول ہے ۔ یہ ہماری روایت ہے۔ آج کے بعد سے تم یہاں بالکل اپنوں کی طرح رہو گے ۔ لیکن میری چند باتیں غور سے سنو، کہ اس کے بعد تمھیں کوئی دشواری نہ ہو ۔ پہلی بات یہ کہ یہاں کی عورتیں اور لڑکیاں تمہاری مائیں اور بہنیں ہیں اور کچھ نہیں ۔ یہاں کے بوڑھے تمہارے باپ کی جگہ ہوں گے اور جوان تمہارے بھائی ۔ تم ان کا احترام صرف ان ہی رشتوں میں کرو گے اور یہ سب تمہاری عزت بھی اسی طرح کریں گے ۔"

نصیر خان سر جھکا کر ساری باتیں سنتا رہا ۔

"ہاں ۔ ایک بات اور ۔" فیروز خان کو جیسے کچھ یاد آ گیا ہو ۔ تم صرف اس صورت میں سرکار کی حدود میں قدم رکھو گے جب تم یہ فیصلہ کر لو گے کہ تمہیں واپس نہیں آنا ہے ۔ ہم سرکار کے دشمنوں کو پناہ تو دیتے ہیں مگر یہ اجازت نہیں کہ وہ سرکاری مال کو یا اپنے بدخواہوں کو نقصان پہنچاتا رہے ۔ جو ہماری پناہ میں آئے وہ ہماری طرح ہی زندگی گزارے گا ۔ اور ہم ڈاکو اور لٹیرے نہیں ۔"

نصیر خان نے ملک فیروز کی نصیحت نہ صرف گرہ میں باندھی بلکہ اس پر پوری طرح عمل بھی کیا ۔ اتنی سختی سے کہ جب اسے یہ اطلاع ملی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے تو جنازے میں شرکت تو درکنار وہ قبر پر فاتحہ کے لیے بھی نہیں گیا ـــــ اس کی جائیداد ایوب کے دوسرے بیٹوں نے ہتھیا لی ـــــ مال مویشی ۔ اور اس کا گھر سب

پر قبضہ ہو گیا۔ ایک آدمی کی زبانی کہلا بھیجا کہ اگر مرد ہو تو آجاؤ ـــــ اپنے مویشی، گھر اور زمین ہم سے لے لو۔ مگر نصیر خان گونگا اور بہرہ ہو چکا تھا۔ وہ ملک فیروز کا اور اس کے گاؤں کا احترام اور عزت کرتا تھا۔ اور اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتا تھا۔ پندرہ سال کے عرصے میں وہ گاؤں کا ایک حصّہ بن چکا تھا۔ کئی مرتبہ ملک فیروز نے اس سے کہا کہ اب شادی کر لو۔ ہم تمام انتظام کریں گے۔ مگر اس نے انکار کیا۔

وہ اگر شادی کرنا چاہتا تو ریشمینہ سے اور ریشمینہ سے شادی اب نا ممکن تھی۔ حالانکہ اس کی خواہش تھی کہ یہ رسم و رواج کی زنجیریں توڑ دے اور یہ پرانی خاندانی دشمنیاں جو صدیوں تک یونہی چلتی رہتی ہیں سب ختم ہو جائیں۔ اپنی روایات کو بالائے طاق رکھ کر وہ اپنے دشمن سے معافی مانگے ـــ مگر یہ ممکن نہ تھا ـــ اول تو وہ معافی نہیں مانگ سکتا دوسرے اس کے دشمن اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔ اس نے دو آدمیوں کا خون کیا تھا اور انتقام کا یہ سلسلہ اس کا خون ہی ختم کر سکتا تھا۔

ان پندرہ برسوں میں اس نے ایک مرتبہ بھی اپنی گزشتہ زندگی اور اپنے گاؤں ـــ اور اپنی زمین سے ـــ اور ـــ ریشمینہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا ـــ جیسے وہ سب کچھ بھول چکا ہو ـــ مگر آج شام جب وہ حجرے میں آیا تو اس کے ساتھ ماضی کے اجالے بھی آگئے۔ آج اپنا گاؤں یاد آیا ـــ بیری کا درخت یاد آیا اور

ریشمینہ اس شدت سے یاد آئی کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر وہاں پہنچ جاتا۔

وہ بزدل نہیں تھا۔ مگر وہ ملک فیروز کو دی ہوئی زبان کا پاس رکھنا چاہتا تھا۔ یہی مجبوری تھی جو اس کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو بن کر ٹپک پڑنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ عورتوں کی طرح زور زور سے روئے۔ مگر وہ مرد تھا اور اس کے سامنے پٹھانی آن تھی ــــ کوئی مرد ہو کر بھی روتا ہے؟

اس نے بہت کوشش کی کہ ان یادوں کے چراغوں کو گل کر کے وہ سو جائے۔ مگر بیری کے درخت کے سرخ بیروں کا خیال۔ ریشمینہ کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کا تصوّر ــــ اس کے سانسوں کی مہک ایک پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ آج اس کا جی چاہا کہ ملک فیروز اور اس کے گاؤں کی لگائی ہوئی پابندیاں ختم کر دے اور اپنے گاؤں پہنچ کر کسی نہ کسی صورت ریشمینہ کو دیکھ لے۔ شاید وہ اب بھی میرے بیری کے درخت کے پاس آتی ہو۔

رات کو جب سب لوگ سو رہے تھے۔ نصیر خان کروٹیں بدلتا رہا ــــ اسے کسی صورت قرار نہ تھا ــــ اور اسی عالم میں اس نے فیصلہ کیا۔

جب سورج پہاڑوں کی اوٹ سے بلند ہو کر علاقے کو پوری طرح بیدار کر چکا تھا تو وہ اپنی مٹی پر موجود تھا۔ بیری کا وہ درخت جس میں سرخ سرخ بیر ہوتے تھے اب اس کے پتے بھی پیلے اور زرد ہو چکے تھے۔ اس میں بیر کچھ بھی نہ تھے۔ اس کی شاخیں سوکھ گئی تھیں ــــ وہ بیری کے قریب آ کر رک گیا۔

"نصیر خان تم؟"

اس نے پلٹ کر دیکھا تو ریشمینہ آہستہ آہستہ بیری کی طرف آ رہی تھی۔

اس نے ریشمینہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کے رخسار جو سرخ سرخ بیری کی مانند ہوتے اب بیری کے پتوں کی طرح زرد اور مرجھائے ہوئے تھے۔ اسے ایسا لگا کہ ریشمینہ بھی اس بیری کی طرح اس کے فراق میں مرجھا گئی ہے۔ جیسے اس کے کھیتوں کی طرح وہ بھی ویران ہو چکی ہے۔

"اب یہاں کیا لینے آئے ہو۔ تم نے تو جا کر خبر تک نہ لی۔ تمھاری ماں مر چکی ہے۔ اس رات میں نے تمھارا کتنا انتظار کیا۔ میں نے رات کو ہی پراٹھے پکائے تھے۔ میں سمجھتی تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔ اور پھر بھوکے ہو گے۔ مگر تم۔ اس رات بھی نہ آئے۔ پھر تمھارے دشمنوں نے سب کے سامنے تمھاری زمین پہ قبضہ کر کے ساری فصل تباہ کی۔ مگر تم نہیں آئے۔ اور میں۔ مجھے ..." اور وہ رو پڑی۔

نصیر خان بت بنا اس کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ ریشمینہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ وہ ریشمینہ جو اس کے خوابوں کی دنیا تھی۔ وہ ریشمینہ جس کی ہنسی اس کے کانوں میں رس گھولتی تھی۔ جس کی آواز سن کر وہ محسوس کرتا تھا جیسے کوئی پہاڑوں میں بانسری بجا رہا ہو۔ جس کے مسکرانے سے کلیاں کھل کر پھول بن جاتی تھیں۔ وہ ریشمینہ اب اس کے سامنے زرد، لاغر، بیمار اور بے پردہ کھڑی رو رہی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش تھا۔ جیسے بےجان پتھر کا مجسمہ ہو۔ اور ریشمینہ

کہہ رہی تھی۔

"یہاں سب تو تمھارے دشمن نہیں تھے۔ یہاں تمھارے دوست بھی تھے، تمھارے خیر خواہ بھی تھے، تمھارے چاہنے والے بھی تھے۔ تمھاری ماں بھی تھی۔ میں بھی تھی۔ مگر تم تو سب کو بھول کر پہاڑوں کی طرح پتھر کے ہو گئے تھے تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ ......" اپنی باتیں ادھوری چھوڑ کر وہ نصیر خان کی طرف جھپٹی۔

"نصیر خان بھاگ جاؤ۔ اس طرف دوڑو۔ خدا کے لیے اس طرف دوڑو" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

جلدی کرو نصیر خان۔ اور اب ادھر کبھی نہ آنا مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ کوئی شکوہ نہیں۔ خدا کے لیے بھاگو۔ نصیر خان" وہ ہذیانی انداز میں چیخی اور نصیر خان کچھ نہ سمجھ سکا۔ وہ اس طرح حیران پریشان کھڑا رہا۔ جب اسے پتا چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

ایک رائفل کی نالی اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایوبے کا دوسرا لڑکا اس کا نشانہ لے چکا ہے۔

دوسرے ہی لمحے رائفل نے ایک شعلہ اگلا۔ اور نصیر خان کے سینے میں اتر گیا۔ پھر دوسری گولی چلی اور دلشمینہ اس پر یوں گری جیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو رہے ہوں۔ جیسے عمر بھر کی دوریاں ختم ہو رہی ہوں۔

وہ دونوں ایکساتھ زمین پر گرے۔ اس نے تمام تر توانائی کے ساتھ دلشمینہ کا ہاتھ تھاما اور پھر اس خون کی طرف دیکھنے لگا جو ان دونوں کے پیاسے بدن سے بہ کر بیری کی جڑوں کو سیراب کر رہا تھا۔

راشدہ رضا

آخری لڑکی

"مجھے ڈرپوک لوگ بہت بُرے لگتے ہیں" رُوحی نے اچانک مسکراتے ہوئے کہا ـــ وہ کافی دیر سے اپنی دو ساتھی لڑکیوں کی باتیں سن رہی تھی، حالانکہ وہ پوری کوشش کر رہی تھیں کہ ان کی آواز روحی تک نہ پہنچنے پائے ـ وہ ایکدم خاموش ہوگئیں۔

"جو بات کہنی ہے صاف صاف اور سامنے ہو کر کہو۔ ہاں میں ملتی ہوں ساجد سے، اور کھلم کھلا ملتی ہوں ـــ تم لوگوں کیطرح خوفزدہ روح میرے اندر نہیں ہے" اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن روحی تم تو کہہ رہی تھیں کہ لوگوں کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ آخر وہ کیا کہیں گے" ایک نے آہستہ سے کہا۔

"کیا کہیں گے؟ یہی کہ روحی کا افیئر آج کل ساجد سے چل رہا ہے — یہی نا — تو کہیں، اور یہ سچ بھی ہے — وہ مجھے بہت پسند ہے۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔" روحی نے برابر جواب دیا۔

وہ دونوں خاموش بیٹھی رہیں ان میں اب کہنے کی کچھ ہمت نہیں تھی۔

کچھ دیر خاموش رہ کر روحی نے کہا۔

"میرا عقیدہ ہے کہ جب کوئی افیئر کسی سے ہو تو چھپانا کیسا، عشق یوں بھی چھپایا نہیں جا سکتا۔ یہ کوئی ناجائز بات نہیں ہے۔ ساری دنیا میں لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان ایسے ہی مراسم ہوتے ہیں، میں کوئی انوکھی واحد لڑکی تو نہیں ہوں۔"

اتنے میں چوکیدار نے کہا

"روحی بی بی — وہ ساجد صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"ان کو یہاں ہی لے آؤ۔" روحی نے آہستگی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا — اور ساجد اندر آیا۔

وہ دونوں لڑکیاں بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ ساجد ہیں — میرے دوست ——— میرے ہونے والے منگیتر۔" روحی نے اس کا تعارف کروایا۔

وہ سلام کر کے وہاں بیٹھ گیا۔

"اور یہ دونوں میرے ساتھ ہی یہاں کام کرتی ہیں، اور انھیں اعتراض ہے کہ میں تم سے کیوں ملتی ہوں۔" روحی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ دونوں بوکھلا کر بیٹھ گئیں۔

"نہیں ایسا تو نہیں ہے۔" ایک نے گڑبڑا کر کہا۔

"کیوں یہ آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگا؟"
ساجد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"تم صرف اچھے مجھے لگتے ہو، اور کسی کو اچھے لگنے بھی نہیں چاہییں۔" روحی نے ہنستے ہوئے کہا۔
"چلو اب چلتے ہیں ورنہ پکچر کا ٹائم نکل جائے گا۔"
ساجد نے کہا۔ اور وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔
"اف کیا واہیات لوگ ہیں۔" ان کے جانے کے بعد ایک لڑکی نے کہا۔
"بالکل بے شرم — بھئی ذرا جو جھجک ہو ان میں۔
دوسری نے کہا۔
"میری امی کو کو اگر ایسی بات معلوم ہو جائے تو ایمان سے میرا تو حال خراب کر دیں، اور ایک ان کی امی ہیں کہ ساجد کو گھر ہی بلا کر خاطریں کرتی ہیں۔"
دوسری نے صاف جل کر کہا۔
میں کافی دیر سے دور بیٹھی ان لوگوں کی گفتگو سن رہی تھی، یہ تقریباً روز کا معمول ہی تھا کہ ساجد روحی کو لینے آتا اور لڑکیاں سرگوشیاں شروع کر دیتیں — میں بہت کم ان لوگوں کی باتوں میں حصّہ لیتی — اس لیے کہ اپنی اپنی جگہ مجھے وہ سب ہی درست دکھائی دیتے تھے — وہ سب اپنی اپنی بات کو صحیح سمجھتے تھے اور اپنے اپنے ماحول کے نمایندے تھے۔
اگلے دن دوپہر کو روحی میرے پاس آئی اور بولی آج میرے ساتھ چلو گی؟
"کہاں؟"

"یونیورسٹی"

"کس کے ساتھ جاؤ گی"؟ میں نے پوچھا۔

"میرے ساتھ"

"تو مجھے کیوں ساتھ چلنے کو کہہ رہی ہو"۔

"میں چاہتی ہوں تم ساجد کے بارے میں اپنی بالکل صحیح رائے مجھے دو۔ آج اس سے مل کر تو دیکھو۔

"اب تو تم عشق کر ہی بیٹھی ہو تو رائے کا کیا پوچھنا۔ اس حادثے سے پہلے پوچھا ہوتا"۔ میں نے کہا۔ "تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو ـــــ شادی شدہ ہو۔ کچھ تو بتانا مجھے ـــ یہ مجھ سے شادی کرے گا بھی یا نہیں"؟ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"بی بی ـــ شادی کا تجربہ میرا تین سال کا ہے ـــ اور شادی بھی پرانے طرز والی ـــ اب بتاؤ میں تم کو کیا بتاؤں گی"۔ میں نے کہا۔

"پھر بھی تم مردوں کو سمجھتی تو ہونا"

اس نے جرح کی۔

"صرف ایک مرد کو"۔ میں نے بات کاٹی ـــ دنیا تو قسم قسم کے مردوں سے بھری پڑی ہے"۔ میں نے کہا۔

"چلو تو سہی میرے ساتھ اور نہیں تو سیر ہو جائے گی"۔ اس نے آخر تنگ آ کر کہا۔

"اور میرے میاں آ کر میرا انتظار جو کریں گے"!

میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔

"میں بعد میں بتا دوں گی انھیں" کہ میں لے گئی تھی تمھیں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

"کیوں بھلا کیوں نہیں کہیں گے؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"اس لیے کہ میں ان کی بیوی نہیں ہوں" وہ بولی۔

آخر روحی کی گاڑی میں بیٹھے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ مجھے یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔

روحی اور ساجد دونوں ہی خوبصورت اور اسمارٹ تھے اور زندگی کی رنگینیوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہے تھے۔ روحی اگر خوبصورت تھی تو ساجد خوبصورت تر ___ وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ! اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اس کا کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے ___ روحی بہت عقلمند، خوبصورت لڑکی تھی لیکن مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ عشق کے ہاتھوں خود کو دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہے ___ یہ سب میرا اپنا خیال تھا ___ ورنہ ابھی تک میں نے کبھی خاص کر ان دونوں پر اپنا وقت صرف نہیں کیا تھا۔

"تم جانتی ہو مجھے ساجد کتنا پسند ہے ___ میں تو اس کے بغیر اپنی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی ___ دو سال پہلے جب ہم دونوں ملے تھے تو میں بہت مختلف لڑکی تھی ___ لاپروا۔ بہت بے فکر ___ آزاد خیال ___ ضرورت سے زیادہ آزاد خیال ___ لباس پسند ہیں ویسے ہی پہنتی ہوں۔ لباس کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ ہے۔ سادہ لباس کے علاوہ میں نے اپنے کپڑے بند کر کے رکھ دیے ہیں۔ یہ دیکھو یہ جو بلاؤز میں نے پہنا ہوا ہے نا ___ ساجد کو بالکل پسند نہیں ہے۔ اصل میں اس کا گلا بہت بڑا ہے ___ مگر اب کیا کروں آج تو پہن ہی لیا ہے ___ تم دیکھنا مجھے دیکھ کر فوراً منہ

بنائے گا" روحی نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔
میں مسکراتی رہی۔ میں کیا کہتی — معلوم نہیں وہ عشق کے کون سے مرحلے سے گزر رہی ہے۔
"تمھیں یقین ہے کہ وہ تمہیں بھی اتنا ہی چاہتا ہے کہ تمہارے لیے اپنا رہنا سہنا بدل دے۔" میں نے پوچھا۔
"کہتا تو ایسا ہی ہے دو سال میں اُس نے خود کو کافی بدل دیا ہے۔" وہ بولی۔
"تم اسے دو سال میں نہیں پہچان سکیں تو پھر میں دو لمحوں میں کیسے پہچان لوں گی۔" میں نے پوچھا۔
"معلوم نہیں، مجھے کبھی کبھی شک ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ شاید میرا وہم ہے۔" اس نے کہیں اور دیکھتے ہوئے کہا۔
"تمھیں خود پر اعتماد نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔ معلوم نہیں۔ ویسے اگر اس نے نہیں کی نا تو میں پھر کبھی کسی اور سے شادی نہیں کر سکوں گی۔"
اس نے سنجیدہ ہوتے کہا۔
"کیوں"؟ میں نے پوچھا۔
"معلوم نہیں کیوں — یہ نہیں کہ میرے لیے پروپوسلز نہیں آتے، مجھے ہی کوئی پسند نہیں آتا میرے اندر کی عورت کسی کو قبول نہیں کرتی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ایک تو تم اس کے عشق میں مبتلا ہو۔ دوسرے کھلم کھلا اس کا اعلان کرتی ہو۔ اور پھر اس فکر میں بھی ہو کہ وہ تمھیں اپنائے

"اعلان اس لیے کرتی ہوں کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے، فکر اس لیے کرتی ہوں کہ اس کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہے۔ میں بی۔ اے کر رہی تھی جب اس نے مجھے آگے پڑھنے کو منع کر دیا ورنہ ایم۔ اے تو ضرور کرتی۔ اس کے خاندان میں بہت زیادہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں ہیں ـــــ میں نے سوچا آخر برا ہی کیا ہے اگر وہ پسند نہیں کرتا تو نہیں پڑھوں گی"

روحی نے بظاہر بڑی سمجھداری سے جواب دیا۔

"تم ابھی سے اس قدر جی حضوری کرو گی تو ساری زندگی کیا کرو گی" میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"جو وہ کہے گا وہی کروں گی" اس نے صاف صاف کہدیا۔

"اتنی ہمّت ہے" میں نے پوچھا۔

"میری تو ہے" وہ بولی ـــ

اور میں سوچنے لگی اس لڑکی کا خدا ہی حافظ ہے معلوم نہیں اس امتحان سے کامیاب ہو کر گزرے گی بھی یا نہیں۔

یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو گئی۔ روحی نے اپنی گاڑی اس کے ڈپارٹمنٹ کے آگے کھڑی کر دی۔

"جانتی ہو، اس کے سارے دوست مجھے بھابی کہتے ہیں" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہیں" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں وہ سب جانتے ہیں کہ فائنل کرنے کے بعد وہ مجھ سے شادی کرے گا"

ہم لوگ اندر چلے گئے، دروازے پر ہی ساجد مل گیا اور اس کے ساتھ کیفے ٹیریا میں آکر بیٹھ گئے۔ اس نے چلتے

وغیرہ کا آرڈر دے دیا۔

میں بڑے غور سے ساجد کو دیکھ رہی تھی۔ وہ روحی کو گھور رہا تھا۔

"اچھا بابا اب نہیں پہنوں گی یہ بلاؤز"

روحی نے آہستہ سے کہا۔ اس کے کچھ اور دوست بھی آکر بیٹھ گئے ___ میرا تعارف بھی ان لوگوں سے کروایا گیا۔ میں اچھا خاصا خود کو بے وقوف محسوس کر رہی تھی ___

کافی دیر وہ بیٹھی آہستہ آہستہ ساجد سے بات کرتی رہی پھر وہ اور ساجد ایک ساتھ ہی اٹھ گئے اور کہنے لگے ہم پکچر جا رہے ہیں تم بھی چلو"

"نہیں بھئی مجھے گھر چھوڑ دو ___ میں نہیں جاؤں گی" اور پھر وہ مجھے گھر چھوڑ کر پکچر چلے گئے۔ اور میں نے اپنے میاں کو الٹی سیدھی غلط کہانی سنا کر مطمئن کر دیا کہ آج آفس میں کام تھا۔

جس دن ساجد پاس ہوا روحی کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی یوں لگتا تھا وہ سچ مچ دلہن بن گئی ہو ___ ساجد ہم سبھوں کو ٹریٹ دینے ہوٹل لے گیا اور ہماری خوب خوب خاطریں ہوئیں میں نے بار بار اس کو کہا کہ اب تم روحی سے جلدی شادی کر لینا اور اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

اگلے دن روحی آئی وہ بہت نروس تھی۔ میں نے پوچھا کیا ہوا ہے ___ کیوں گھبرا رہی ہو ___

آج ساجد اپنے ابو سے پوچھ کر بتائے گا کہ وہ مجھ سے کب شادی کرے گا۔

میں حیران ہوئی ___ اب وہ ابو سے پوچھے گا۔ اس نے

اب تک نہیں بتایا ان کو۔

"اصل میں وہ پرانے خیال کے ہیں نا"

روحی نے بظاہر ساجد کا سائڈ دیا ۔۔ ساجد اتنا کمزور آدمی ہے، میں نے سوچا ۔۔۔ ایک لمحے کو مجھے لگا روحی کے ساتھ خاصا ظلم ہوا ؟

لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔

وہ سارا دن تقریباً بہت خاموش گزرا کیوں کہ روحی بہت سنجیدہ تھی۔ بس دل میں دعا کر رہی تھی کہ خدایا اس پر رحم کرنا ۔۔۔ عشق اور وہ بھی اتنی سنجیدگی سے ۔۔۔ مجھے جھرجھری آ گئی۔

اگلے دن جب روحی آئی تو ایک لمحے کو میں اسے پہچان نہ سکی، اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور اس کا رنگ جلا ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر کچھ پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔

وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی ۔۔۔ اور زور زور سے رونے لگی ۔۔ جانتی ہو وہ کیا کہہ رہا تھا مجھ سے ۔۔ کہ اس کے ابّو شادی پر راضی نہیں ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اتنا بزدل ہے تو میں ۔۔۔ وہ پھر رونے لگی۔

"ابّو کا تو محض بہانا ہے ۔ وہ تم سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا، ایسے ہی اپنا وقت گزار رہا تھا۔ عام لڑکوں کی طرح میں نے اسے سمجھایا۔

"پہلے کیوں نہیں بتایا تھا مجھے" اس نے ایک دم کہا۔

"تم کبھی نہیں مانتیں۔ تم بہت آگے جا چکی تھیں"۔ میں نے کہا۔

پھر جیسے اس نے اپنے عشق کا پرچار کیا تھا اسی طرح اس کا ماتم بھی کرتی رہی — ہر ایک سے اس نے بتا دیا — یا اس کی حالت دیکھ کر ہر ایک کو پتا چل گیا۔

"میں نے اس کی خاطر خود کو بدل لیا۔ ساری ساری رات جاگ کر اس کے لیے نوٹس ٹائپ کیے — ساری دنیا سے لڑی۔" وہ روتی جاتی تھی اور بین بھی کرتی جاتی تھی — اس کی بے چینی اور تڑپ دیکھی نہیں جاتی تھی۔

ہم لوگ زبردستی اسے گاڑی میں بٹھا کر لے گئے اور کھلایا پلایا۔ پکچر دکھائی — سارا وقت وہ روتی رہی اور ہمیں بھی اداس کرتی رہی۔

یوں لگتا تھا آج وہ ساری زندگی کے لیے ایک ہی دفعہ رو رہی ہے۔

پھر ایک ہفتے تک وہ آئی ہی نہیں — ہم لوگ پریشان بھی تھے — کیوں کہ اس نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

"مسز خان کیا حال ہے؟" اچانک مجھے بڑی مانوس آواز آئی — میں نے مڑ کر دیکھا میں ایک لمحے کو چونک گئی۔ غالباً روحی سے ملتی جلتی چیز مجھے نظر آئی۔ بے انتہا ماڈرن لباس میں، بال بھی جدید اسٹائل سے کٹے ہوئے۔ بہت دبلی پتلی، جیسے آدھا جسم بہہ گیا ہو — اس کے ساتھ دو لڑکے تھے — میں نے غور کیا، وہ دونوں ساجد کے دوست تھے اور روحی نے ان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا یہ میرے دوست ہیں کمال اور انور — بہت اچھے ہیں یہ کہہ کر روحی نے انور کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا — وہ بے تحاشہ

ہنس رہی تھی۔ اب میں بالکل آزاد ہوں مسز خان، ساجد کے پیچھے میں نے دو سال برباد کیے — کمال ہے — وہ بھی کوئی آدمی تھا" وہ پھر بے تحاشہ ہنس پڑی۔

"میرے بال اچھے لگ رہے ہیں نا" اس نے پوچھا، وہ بیوقوف مجھے مشرقیت کا سبق دیتا تھا۔ میرے لمبے بالوں پر شاعری کرتا تھا" اچانک وہ مڑی میں نے دیکھا اس کی قمیص کا گلا بہت ہی گہرا کٹا ہوا تھا۔

میں خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ میری آنکھوں سے آنسو گر کر کاغذ میں جذب ہو گئے۔"

عبدالمجید سالک

خروشِ بزمِ شرابِ مغانہ یاد کرو
کرشمہ ہائے نگارِ شبانہ یاد کرو
رقیب کی نگہِ تجسّس نظر سے پوشیدہ
وہ یار کی نگہِ محرمانہ یاد کرو
کسی کے ولولۂ عاشقی کا چھیڑو ذکر
کسی کا طنطنۂ دلبرانہ یاد کرو
وہ جس پہ جھک گئی ہر سرفرازکی گردن
وہ پیرِ میکدہ کا آستانہ یاد کرو
حکایتِ غمِ دوراں سے گر ملے فرصت
تو یادِ یار کا رنگیں فسانہ یاد کرو
قفس میں کلفتِ دوری کا ہے علاج یہی
کہ قصۂ چمن و آشیانہ یاد کرو
مغنیو! وہ سرودِ سخن کے خواہاں ہیں
کوئی مری غزل عاشقانہ یاد کرو
بجا کہ سالکِ خوددار ملتجی نہ ہوا
کبھی تو تم بھی اسے مخلصانہ یاد کرو

حفیظ ہوشیارپوری

نہ پوچھ کیوں مری آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تیرے دل میں ہے اس بات پر نہیں آئے

وفائے عہد ہے یہ پاشکستگی تو نہیں
ٹھہر گیا، کہ مرے ہمسفر نہیں آئے

نہ چھیڑ ان کو خدا کے لیے کہ اہلِ وفا
بھٹک گئے ہیں تو پھر راہ پر نہیں آئے

ابھی ابھی وہ گئے ہیں مگر یہ عالم ہے
بہت دنوں سے وہ جیسے نظر نہیں آئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں
وہ مجھ کو یاد کبھی اس قدر نہیں آئے

عجیب منزلِ دلکش عدم کی منزل ہے
مسافرانِ عدم لوٹ کر نہیں آئے

حفیظ کب انھیں دیکھا نہیں برنگِ دگر
حفیظ کب وہ برنگِ دگر نہیں آئے

فیض احمد فیض

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رخِ روشن کا جمال
سرخیٔ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں کہ اگر لطف کرو آج کی شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے اپنے لہو کے دم سے
دل نے لَے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

اک سخن اور کہ پھر رنگِ تکلّم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

ظہیرؔ کاشمیری

اس دورِ عافیت میں یہ کیا ہو گیا ہمیں
پتّا سمجھ کے لے اڑی وحشی ہوا ہمیں

پتھر بنے ہیں عجز بیانوں کے سامنے
تخلیقِ فن کا خوب ملا ہے صلا ہمیں

ہم کو طلوعِ صبحِ بہاراں کی تھی تلاش
اس جرم کی سزا ہے یہ زنجیرِ پا ہمیں

یہ دورِ تیز گام بھی ہے ان سے بے خبر
وہ منزلیں جو دے گئیں اپنا پتا ہمیں

راہِ طلب سمٹ کے قدم چومنے لگی
جب بھی کوئی حریفِ سفر مل گیا ہمیں

ظلمت کا دور کچھ بھی سہی ستر پوش تھا
کب روشنی نے جیبِ گریباں دیا ہمیں

پس منظرِ بہار سے ہم بے خبر نہ تھے
راس آ سکی نہ خندۂ گل کی صدا ہمیں

ہم کو تو نذرِ سیل ہوئے عمر ہو گئی
کشتی میں ڈھونڈتا ہے مگر ناخدا ہمیں

عبدالحمید عدمؔ

○

ہم بتوں کو جو پیار کرتے ہیں
نقلِ پروردگار کرتے ہیں

دیکھنا، جھومنا، دعا دینا
ہم یہی کاروبار کرتے ہیں

دشمنی غیر تو نہیں کرتے
یہ مروّت تو یار کرتے ہیں

جینے والے ہی جھوم کر اکثر
موت کو ہمکنار کرتے ہیں

جھوٹ بھی ہوں تو کیا قباحت ہے
کتنے قول و قرار کرتے ہیں

خوبیوں کو بھی بعض لوگ عدمؔ
خامیوں میں شمار کرتے ہیں

عزیزہ حامدہ مدنی

غبار اٹھے ہیں تغیّر کو کو بہ کو کرتے
ہوا اسے اک رخِ تازہ کی گفتگو کرتے

ہوائے تیز تھی آسیبِ بادباں کی طرف
بنے گی اب کے تلاطم کی آرزو کرتے

کہیں کی برقِ نشیمن، کہیں کا ابرِ سیاہ
ٹھہر گیا تری آنکھوں میں گفتگو کرتے

چراغِ خارِ مغیلاں جلا کے نکلے تھے
وہ قافلے جو گئے تیری جستجو کرتے

کہیں سے ہم بھی جو تاریخِ میکدہ لکھتے
تو حرفِ تشنہ کو خالِ مئے سبو کرتے

ہزار ہاتھ ہیں اور چاکِ دل ہے ہم نفسو
ٹھہر گئے ہو گریباں کو کیا رفو کرتے

عارف عبدالمتین

کسی کے چہرے سے روشن کتاب مانگتا ہوں
نیا زمانہ ہے تازہ نصاب مانگتا ہوں

بہار تو نے سدا مجھ کو خار بخشے ہیں
میں اپنے حصے کا تجھ سے گلاب مانگتا ہوں

ہر ایک لطف کی حسرت سے دست کش ہو کر
وہ بے بسی ہے کہ اب میں حساب مانگتا ہوں

حقیقتوں سے نبرد آزما رہا قرنوں
اب آشتی کے لیے کچھ سراب مانگتا ہوں

جو تیرے نام سے بابِ وفا کشادہ کرے
میں آسمان سے وہ انقلاب مانگتا ہوں

مرے جنوں نے سوال ان گنت اٹھائے ہیں
میں اپنی عقل سے ان کا جواب مانگتا ہوں

اٹھائے پھرتا ہوں کچا گھڑا زمانوں سے
میں سوہنی کی طرح سے چناب مانگتا ہوں

جو انتظار میں تیرے گزر گئیں صدیاں
ملن کے لمحے سے ان کا حساب مانگتا ہوں

میں زندگی کے سمندر کی موج ہوں عارف
الجھ کے ساحلِ غم سے حباب مانگتا ہوں

ابنِ انشا

اچھا تو پھر چھپ چھپ ان کے گھر میں آتے جاتے ہو
انشا صاحب ناحق جی کو وحشت میں الجھاتے ہو

دل کی بات چھپانی مشکل لیکن خوب چھپاتے ہو
شہر کے اندر دانا، بن میں دیوانے کہلاتے ہو

جی کی بات تو مانو۔ لیکن محفل کے آداب کے ساتھ
آنکھ چرا کر دیکھ بھی لیتے۔ بھولے بھی بن جاتے ہو

پیت میں ایسے لاکھ جتن ہیں لیکن اک دن سب ناکام
آپ جہاں میں رسوا ہوگے وعظ ہمیں فرماتے ہو

ہم سے نام جنوں کا قائم، ہم سے دشت کی آبادی
ہم سے درد کا شکوہ کرتے؟ ہمکو زخم دکھاتے ہو

انشا جی وہ شخص کہاں ہے جس نے لکھی چاند نگر
تم تو چار برس سے ہمکو غزلوں سے بہلاتے ہو

صبا اکبر آبادی

میں موسمِ آشنا ہوں کہ موسم گزیدہ ہوں
پھولوں کا مرثیہ ہوں خزاں کا قصیدہ ہوں

زخم ہوائے تند سے سینہ دریدہ ہوں
ہر پھول کہہ رہا ہے کہ آفت رسیدہ ہوں

کیفِ بہار نے یہ سمجھنے نہیں دیا
اک برگِ خشک ہوں کہ گلِ نو دمیدہ ہوں

میرے چمن میں اب نہ کھلے گی کوئی کلی
کھلتے تھے جس میں پھول وہ شاخِ بریدہ ہوں

جب میں نہیں رہا تو وہ نیرنگیاں کہاں
رخسارِ کائنات کا رنگِ پریدہ ہوں

صیادِ مرگ میرے تعاقب میں ہے کہ میں
صحرائے زندگی میں غزالِ رمیدہ ہوں

یوں موڑ پر بقا و عدم کی ہوں مطمئن
جیسے کوئی مسافرِ منزل رسیدہ ہوں

دامانِ صافِ دہر پہ اک داغ کی طرح
کس چشمِ سرمگیں کا سرشکِ چکیدہ ہوں

بجلی کا خوف ہے کہیں پھولوں کی آگ سے
کس گوشۂ چمن میں صبا آرمیدہ ہوں

جسٹس ایس اے رحمان

○

ہوا ٹھنڈی ہے بادل چھا گئے ہیں
مری آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں

نکل آئے ہیں دل کی خلوتوں سے
مرے اسرار کچھ گھبرا گئے ہیں

ان اشکوں میں کوئی تو بات ہوگی
کہ موتی اوس کے شرما گئے ہیں

مری افسانہ خواں راتوں کے گیسو
فضائیں ہر طرف لہرا گئے ہیں

چمک کر دور تک یادوں کے جگنو
شب تاریک کو بھڑکا گئے ہیں

خیالوں کے عجب کچھ سلسلے ہیں
سلجھ کر بھی مجھے الجھا گئے ہیں

غلام ربّانی تاباں

○

اک حادثۂ شوق کہ دل بھول چلا تھا
آیا ہے کبھی یاد تو ہر زخم ہرا تھا

تسلیم کہ وہ شوخ پشیمانِ جفا تھا
کیا جانیے کیا عشق کی غیرت کو ہوا تھا

وہ سحرِ اشارات وہ افسونِ کنایات
اک وہمِ تمنّا تھا مگر ہوش رُبا تھا

بربادیِ نکہت پہ تقاضائے نمو تھی
پھولوں کو مگر بادِ بہاری سے گلہ تھا

شعلہ سا تہِ زلف بھڑک جاتا تھا تاباں
ہر لمسِ نظر سلسلہ جنبانِ حیا تھا

شان الحق حقی

○

ہم تو کھو جائیں گے یہ شوق کی دنیا لے کر
ہم سے لکھ لو کوئی تم خوابِ تمنّا لے کے

کس کو معلوم یہاں چارہ گری کا شیوہ
کون سولی پہ چڑھا ہے دمِ عیسیٰ لے کر

اس کو چھوڑوں کہ سہاروں پہ جو درماندہ حیات
چل رہی ہے مرے کاندھوں کا سہارا لیکر

ہم نے ہر دود کا دنیا ہی پہ رکھا الزام
کبھی شکوہ نہ کیا نام تمھارا لے کر

اتنی فرصت غمِ دنیا نے کہاں بخشی ہے
کون سے دل میں سما لوں غمِ عقبیٰ لیکر

جس کو رکھتے تھے محبت کے ترانے بیدار
سو گیا ہے وہ چمن چادرِ صحرا لے کر

جگن ناتھ آزاد

جو طور پہ چمکا تھا وہ تھا سوزِ نہاں اور
جو ہے مرے سینے میں وہ ہے برقِ تپاں اور

لبریز یہ سارا ہے چمن گرچہ فغاں سے
اوروں کی فغاں اور ہے میری ہے فغاں اور

سو مجھکو یقیں ان کی نظر کا کہ زباں کا
اک دم میں نظر اور ہے اک پل میں زباں اور

واعظ! کبھی ہم لوگ فرشتے نہ بنیں گے
ہم خاک نشیں اور ہیں وہ عرش مکاں اور

اے اہلِ نظر! ایک نظر میری غزل بھی
ممکن ہے کہ میرا ہو کچھ اندازِ بیاں اور

یاں جو بھی تفاوت ہے وہ ہے ذوقِ نظر کا
ورنہ نہیں آزاد! بہار اور خزاں کا

شاعر لکھنوی

(۱)

لہو کی موج میں گلزر نگئی افکار چھوڑ آئے
سرِ مقتل ہم اپنے عشق کا معیار چھوڑ آئے

چلے گھر سے تو پھر در پیش تھی صحرا کی ویرانی
وہاں بھی ہم اک احساسِ در و دیوار چھوڑ آئے

ترے کوچے سے نکلے تو نہ لمحہ تھا نہ پل کوئی
جہاں پر تھی وہیں ہم وقت کی رفتار چھوڑ آئے

چمن کے گل فروشوں کو کہاں ہے اس کا اندازہ
کہ ہم ہر پھول میں کتنے لب و رخسار چھوڑ آئے

سلوکِ دوستاں کا کس طرح لکھیں ہم افسانہ
قلم تو ساتھ لے آئے مگر تلوار چھوڑ آئے

ٹھہرنے کی کہاں ملتی ہے مہلت راہِ ہجرت میں
نہ جانے کتنے پیڑوں کو پسِ دیوار چھوڑ آئے

نہ ملتا نقدِ جاں دیکر بھی اک لمحہ محبت کا
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے

نئے منصور کو مل جائے رستہ اس لیے شاعر
جلا کر اپنے خوں سے ہم چراغِ دار چھوڑ آئے

محشر بدایونی

○

یہ میں ہوں اور یہ اصنام میرے
انہیں جو نام دو سب نام میرے

ہے ان کی روشنی مجھ سے بھی آگے
ہیں اچھا۔ مجھ سے اچھے کام میرے

نہ کر تو بات مجھ سے موسموں کی
یہ موسم صبح تیرے، شام میرے

دکان خواب میں چہرہ نگہ ہوں
کوئی شاید چکا دے دام میرے

شکست و ریخت کے اس سانحے میں
غنیمت ہیں ستون و بام میرے

تمناؤں کے زخم ایذاؤں کے زخم
یہی کچھ زخم ہیں انعام میرے

میں کیا ورثے میں دوں آیندگاں کو
بس ان کے نام ہیں پیغام میرے

مشفق خواجہ

○

جو مثلِ بادِ صبا پاس سے گزر جائے
کبھی ہمیں بھی وہ پہچان کے ٹھہر جائے

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے

یہ کیا طلسم ہے میں اس کو دیکھ بھی نہ سکوں
کہ جس کے جلووں سے دامانِ چشم بھر جائے

تو میرے دل میں مثالِ چمن مہکتا ہے
میں سانس لوں تری خوشبو بکھر بکھر جائے

میں آئینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو
وہ روشنی ہے جو دامن کشاں گزر جائے

ہے ایک خواب مری خود فریب آنکھوں میں
مگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے

ابوظفر صہبا

روشنی تیرگی سے نکلتی رہی — شمع بجھتی رہی، شمع جلتی رہی
رفتہ رفتہ اجالے سحر کو ملے — رات ڈھلتی رہی رات ڈھلتی رہی
گھر کے اندر جلایا تھا ہم نے دیا — روشنی گھر سے باہر نکلتی رہی
آگ ہی آگ تھی وحشت تنہائی میں — دن سلگتا رہا رات جلتی رہی
کیا عمل تھا کہ ہر دور میں عمر کے — روح رہ رہ کے قالب بدلتی رہی
گھر کے آنگن کی تنہائیاں کیا کہوں — چاندنی رات پہلو بدلتی رہی
غم بہر حال غم تھا یہ اتنا ہوا — زندگی بھر طبیعت بہلتی رہی
رنگ پھولوں کے چہروں پہ آتا رہا — نو بہارِ چمن خوں اگلتی رہی
اس گدازِ طبیعت نے مارا ہمیں — شمع جلتی رہی اور پگھلتی رہی

پھر لگا کر نہ صہبا اڑے ہم کبھی
جو ہوا چل رہی تھی وہ چلتی رہی

رفیقؔ ریواڑوی

○

دیکھ حشرِ خس و خاشاک تو دیکھ
گرمیِٔ شعلۂ بیباک تو دیکھ

اپنے دامن میں ہیں اپنے آنسو
غیرتِ دیدۂ نمناک تو دیکھ

دھوپ سر پہ ہو تو رک جاتا ہے
وقت کا غمزۂ چالاک تو دیکھ

رُخ ہے گلرنگ جبیں روشن ہے
تابشِ خونِ رگِ تاک تو دیکھ

سمتِ میخانہ فراموش نہ کر
جانبِ گردشِ افلاک تو دیکھ

بیخودی ہے پئے خود آگاہی
ماورائے حدِ ادراک تو دیکھ

اک تبسم کی یہ یادداشت رفیقؔ
پھول کا دامن صد چاک تو دیکھ

سرور بارہ بنکوی

تیرگی مطلعِ انوار تک آپہنچی ہے
زلف بکھری ہے تو رخسار تک آپہنچی ہے

کوششِ صلح بھی پیکار تک آپہنچی ہے
بات ابروئے کماندار تک آپہنچی ہے

تا بہ کے انجمن ناز میں یہ رسمِ سکوت
خامشی جرأتِ اظہار تک آپہنچی ہے

جرأتِ شوق بہ ایمائے پریشاں نظری
بارگاہِ لب و رخسار تک آپہنچی ہے

زندگی عارض و کاکل کی گزرگاہوں سے
رفتہ رفتہ رسن و دار تک آپہنچی ہے

جس کا غم میرے لیے عیشِ دو عالم ہے سرورؔ
اس کی شوخی مرے اشعار تک آپہنچی ہے

اطہر نفیس (مرحوم)

سو رنگ ہیں کس رنگ کی تصویر بناؤں
میرے تو کئی روپ ہیں کس روپ میں آؤں

کیوں آ کے ہر اک شخص مرے زخم کریدے
کیوں میں بھی ہر اک شخص کو حال اپنا سناؤں

کیوں لوگ مصر ہیں کہ سنیں میری کہانی
یہ حق مجھے حاصل ہی سناؤں کہ چھپاؤں

کچھ اور تو حاصل نہ ہوا خوابوں سے مجھکو
بس یہ ہی کہ یادوں کے در و بام سجاؤں

بے قیمت و بے مایہ اسی خاک میں یارو
وہ خاک بھی ہو گی جسے آنکھوں سے لگاؤں

خوابوں کے افق پر ترا چہرہ ہو ہمیشہ
اور میں اسی چہرے سے نئے خواب سجاؤں

٭

مجبوب خزاں

بے نیازی بڑی، سلیقہ نہیں
فکر کاسہ بقدرِ کاسہ نہیں

ہم بھی ہیں ٹھیکرے خریدتے ہیں
وہ بھی ہیں جن کے پاس پیسہ نہیں

اس نے دیکھی ہے زندگی ابھی کیا
جس کی آنکھوں کے گرد حلقہ نہیں

وہ ارادے گئے زمانہ ہوا
اب کسی بات کا ارادہ نہیں

تجھ سے بھاگے تو سکون بھاگے
سرگراں ہیں کہ دل گرفتہ نہیں

میکدے روز سوتے جاگتے ہیں
تشنگی کم نہیں، زیادہ نہیں

بات کہنی ہے بے حوالہ کہو
یہاں کوئی سند وغیرہ نہیں

فطرتِ انکسارِ خامہ سمجھ
یہ صدائے شکستِ خامہ نہیں

عبیداللہ علیم

○

اب تو یوں خانۂ تنہائی میں محبوب آئے
جیسے مجذوب کے گھر دوسرا مجذوب آئے

اس سے کہنے کو گئے تھے کہ محبت ہے بہت
اس کو دیکھا تو شکستہ دل و مجبوب آئے

آگے کیا ہو یہ سخن آج تو یوں ہے جیسے
اپنے نام اپنا ہی لکھا ہوا مکتوب آئے

ایک دربار کی تصویر میں کچھ اہلِ قلم
وقت کی آنکھ نے دیکھا کہ بہت خوب آئے

دکھ سے پھر جاگ اٹھی آنکھ ستارے کی طرح
اور سب خواب ترے نام سے منسوب آئے

ہم نے دل نذر کیا اہلِ محبّت کے حضور
ان نے قامت یہ بڑھایا ہے کہ مصلوب آئے

ہیں تری خاک سے لپٹا ہوا اے ارضِ وطن
انھیں عشّاق میں شامل ہوں جو معتوب آئے

میترا حسن، ۱۸/۱۰

۞

ہو گئیں اب تو نمازیں بھی مری البیلیاں
رحمتیں کرنے لگیں بہلول سے اٹھکھیلیاں

میں نے باغی خواہشیں سیراب گنے کی طرح
بندگی کے چپ چپاتے بیلنے میں بیلیاں

لااُبالی آرزوئیں یاس کی برسات میں
پاک سائیں کی رضا سے آج ہولی کھیلیاں

چھیڑ دی توحید کی لے میں ثناء ٹ درگی غزل
کیں وہابیت کی طنزیں مجھ پہ میرے بیلیاں

صبر کے مار وتھلو میں شاعرِ شبیر نے
آیتیں پڑھ پڑھ کے زہریلی ہوائیں جھیلیاں

وقت کے منہ زور دریا کی شرابی کانگ[۲] میں
بیڑیاں ہم نے خدا کے آسرے پہ ٹھیلیاں[۳]

سوکھ جانے پہ جو آئی آرزوؤں کی فرات
میری آنکھوں نے ہزاروں بدلیاں انڈیلیاں

چاند ہے درویش کے سینے کے داغوں کا مرید
کہکشائیں میری آہوں کی دمکتی چیلیاں

اللہ اللہ اے علیؑ مولا کے مستانے فقیر
دل مہکتے موتیے باتیں چمن چنبیلیاں

---

[۱] جیسی [۲] طغیانی [۳] کشتیاں [۴] تیرائیں

شکیب جلالی

آتا ہے ہر چڑھائی کے بعد اک اتار بھی
پستی سے ہمکنار ملے کوہسار بھی

آخر کو تھک کے بیٹھ گئی اک مقام پر
کچھ دور میرے ساتھ چلی رہگذار بھی

دل کیوں دھڑکنے لگتا ہے ابھرے جو کوئی چاپ
اب تو نہیں کسی کا مجھے انتظار بھی

جب بھی سکوتِ شام میں آیا ترا خیال
کچھ دیر کو ٹھہر سا گیا آبشار بھی

کچھ ہو گیا ہے دھوپ سے خاکستری بدن
کچھ جم گیا ہے راہ کا مجھ پر غبار بھی

ان فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے
جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

اے دوست پہلے قرب کا نشّہ عجیب تھا
میں سن سکا نہ اپنے بدن کی پکار بھی

رستہ بھی واپسی کا کہیں بن میں کھو گیا
اوجھل ہوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی

باقی صدیقی

آستیں میں سانپ اک پلتا رہا
ہم یہ سمجھے حادثہ ٹلتا رہا

آپ تو اک بات کہہ کر چل دیے
رات بھر بستر مرا جلتا رہا

ایک غم سے کتنے غم پیدا ہوئے
دل ہمارا پھولتا پھلتا رہا

زندگی کی آس بھی کیا آس ہے
موجِ دریا میں دِیا جلتا رہا

اک نظر تنکا بنی کچھ اس طرح
دیر تک آنکھیں کوئی ملتا رہا

یہ نشاں کیسے ہیں باقیؔ دیکھنا
کون دل کی راکھ پر چلتا رہا

احمد ہمدانی

○

جب جب بھی خود سے برسرِ پیکار ہم ہوئے
سوئے ہوئے وجود میں بیدار ہم ہوئے

برسا رہی ہے آگ خیالوں کی چھاؤں بھی
کس دشت میں یہ آج نمودار ہم ہوئے

تنہائیوں میں ہجر کی سلگے ہیں عمر بھر
تب جا کے اپنے عہد کا پندار ہم ہوئے

ہر لحظہ بے کلی کی یہ صورت نئی ہے کیا
ایسے کہاں کسی کے طلب گار ہم ہوئے

دیکھا تھا اُن کو ہم نے سرِ راہ اور پھر
وہ چُپ لگی کہ نقش بہ دیوار ہم ہوئے

ڈاکٹر خان رشید

○

دل میں اک شعلہ جلا تھا لیکن افسوس کبھی
بے بسی رنگ جولائی تو اُجالا نہ ہوا

جذبۂ دل آج بھی بے چین کیے رہتا ہے
وقت نے لاکھ بھلایا مگر ایسا نہ ہوا

بارہا آپنے کی پرسشِ حالات مگر
کیا کریں ہم سے ہی اظہارِ تمنّا نہ ہوا

غیر شاکی ہیں اگر تیری کم آمیزی سے
"تیرا بیمار بُرا کیا ہے جو اچھا نہ ہوا"

دل اگر دل ہے تو پیغام رسانی کیسی
جب بھی چاہا تمھیں دیکھا کبھی دھوکا نہ ہوا

میں نے بس ایک نظر بھر کے انھیں دیکھا تھا
وائے تقدیر کہ اتنا بھی گوارا نہ ہوا

ہم کہ ہیں اب بھی گرفتارِ روایات و رسوم
بندشیں توڑ نہ پائے تو جو چاہا نہ ہوا

رئیس فروغ

○

ایک برہنہ پیڑ کے نیچے — میں تھا اور پروائی تھی
میری ہنسی جنگل میں کسی نے — دیر تلک دہرائی تھی
روشنیوں کے جال سے باہر — کوئی کرن لہرائی تھی
خاموشی کی جھیل پہ شاید — کنکر لے کر آئی تھی
دھیان کی ندی بہتے بہتے — ایک دفعہ تھرائی تھی
کھیت پہ کس نے سبز لہو کی — چادر سی پھیلائی تھی
میرے اوپر جالا بننے — پھر کوئی بدلی آئی تھی
ایک انگوٹھی کے شیشے میں — آنکھوں کی گہرائی تھی
دیواروں پہ داغ لہو کے — پتھریلی انگنائی تھی
میں نے اپنے تنہا گھر کو — آدھی بات بتائی تھی
میں تو اس کا سناٹا تھا — وہ میری تنہائی تھی
صبح ہوئی تو دل میں جیسے — تھکی تھکی انگڑائی تھی
ٹھنڈی چائے کی پیالی پی کر — رات کی پیاس بجھائی تھی

اپنے بادل کی کٹیا میں
میں نے آگ لگائی تھی

رفعتؔ سلطان

بادِ سموم تیری نظر میں صبا سہی — تیری خوشی یہی ہے تو یہ بھی روا سہی

ہر جسم زخم زخم ہے ہر دل ہے داغ داغ — ہر شخص کا لباس بڑا خوش نما سہی

شاید ہو تیز دھوپ کی شدت میں کچھ کمی — برسے اگر نہ ابر تو ٹھنڈی ہوا سہی

تو نے دیا تو زہر بھی میں ہنس کے پی گیا — یہ سوچ کر کہ تیرا یہی فیصلہ سہی

پھر بھی مجھے قبول نہیں تیری بیرخی — تو میری زندگی کا حسیں مدعا سہی

میری غزل میں اور اگر کچھ نہیں تو کیا — تیرے حریمِ دل میں بھٹکتی صدا سہی

تو ہے مسیحِ وقت اگر اتفاق سے — زہراب میرے زخمِ جگر کی دوا سہی

میں نے تجھے صنم کا بھی درجہ نہیں دیا — یارانِ کم نظر کے لیے تو خدا سہی

دی ہے مجھے خدا نے متاعِ سخنوری — میں خستہ دل سہی میں دریدہ قبا سہی

رفعتؔ نہ چھپ سکی تری افسردہ خاطری
تو دوستوں کی بزم میں نغمہ سرا سہی

مظفر ضیاء

○

لمحہ لمحہ خونِ تمنا دیکھا تھا
میں نے اک دن تیرا رستہ دیکھا تھا
سوتے سوتے آنکھ کھلی پھر نیند کہاں
شاید کوئی خواب ادھورا دیکھا تھا
چاند کی جانب چیخ اٹھی پھر ڈوب گئی
ایک چکور کو رات میں اڑتا دیکھا تھا
زہر گزیدہ کس کا ہے بے جان بدن
ناگن مندر ایک سپیرا دیکھا تھا
جب بھی اس کو دیکھا یوں محسوس کیا
قرنوں پہلے اس کا چہرہ دیکھا تھا
وہ اک شخص کہ محفل محفل کی رونق
اس کو بھی اک روز اکیلا دیکھا تھا
اندھیاروں نے اس کو بھی بے نور کیا
صدیوں بعد جو ایک سویرا دیکھا تھا
میں نے ضیاؔ ان روح و بدن کے رشتوں میں
چڑیوں کا اک رین بسیرا دیکھا تھا

محسن احسان

فضا میں غلغلہ شوریدگانِ راہ کا ہے
محل سرا میں عجب حال کج کلاہ کا ہے

لہو میں تر ہے مری زندگی کی دستاویز
مرا عدیل مگر منتظر گواہ کا ہے

مرے چراغ بجھانے سے پیشتر گن لے
بجا کہ زعم تجھے اپنے مہر و ماہ کا ہے

کوئی جہت ہی مقرر نہ کر اب خداوندا
یہ قافلہ تو نہ منزل کا ہے نہ راہ کا ہے

مرے لبوں پہ رچی ہے یقیں کی سچائی
مری زباں پہ مگر ذائقہ گناہ کا ہے

سزائے دار ہے تقدیرِ قاتلاں محسن
مگر ملال ہمیں ایک بے گناہ کا ہے

شاہد واسطی

(۱)

ذرا سا لیمپ اندھیرے کیا لہائی دے
کہر چھٹے تو محلے میں کچھ دکھائی دے

سکوت ہی تھا انکارِ جرم سے بہتر
سنے نہ کوئی تو ایسے میں کیا صفائی دے

لہو پلا کے میں لفظوں کو پھر جواں کروں
کہ ماں تو باؤلے بیٹے کو بھی ملائی دے

سفر بخیر ہو کیسے کھلے سمندر میں
قدم قدم پہ ہوا حکمِ نارسائی دے

مرا سوال بس اک شخص کے سوا کیا ہے
اسے میں ترک کروں تو اگر خدائی دے

یہ کس وبال سے دل آشنا ہوا شاہد
نظر نہ آئے کوئی شور سا سنائی دے

سیّد ارتضیٰ عزمی

تزئینِ خیال کر رہا ہوں
ذکرِ خد و خال کر رہا ہوں

دیکھو وہ چراغ جھلملائے
میں شرحِ جمال کر رہا ہوں

معلوم ہے عادتِ زمانہ
بے وجہ ملال کر رہا ہوں

پھر ہوش نہیں ہے جان و دل کا
پھر اُس کا خیال کر رہا ہوں

اک لمحۂ سرخوشی کی خاطر
صدیوں سے سوال کر رہا ہوں

وہ پرسشِ حال کر رہے ہیں
میں چپ ہوں کمال کر رہا ہوں

رہ رہ کے حضورِ دوست عزمیؔ
ہمت کو بحال کر رہا ہوں

ممتاز علی

ہے رواں ہر لحظہ مثلِ آب جو
زندگی میری سراسر جستجو

ہو گئے ہیں بے نیازِ رنگ و بو
ہم نہیں منت کشِ جام و سبو

قصّۂ لیلیٰ صدائے بازگشت
نغمہ ہائے دشتِ مجنوں کو بکو

آجکل صد چاک ہیں گُل کیا ہوا
ہائے تقدیرِ چمن رنگِ لہو

کر گئی کانٹوں کو بھی رشکِ بہار
رہروِ راہِ جُنوں کی آبرو

لمحہ لمحہ کوچ مسلسل — منزل اپنی گام گام
اہلِ چمن کی خوب ادائیں — ہر سُو دانہ ہر سُو دام
دیر و حرم کو کیا کیجے گا — رکھیے اپنا ان سے کام
اپنی قسمت یوں نہ رہے گی — اب کے بھر لائیں گے جام

احمد شریف

مدتوں سے ترا شناسا ہوں
لبِ دریا ہوں اور پیاسا ہوں

دیکھ کر چال اہلِ دنیا کی
اپنی خلوت میں آن بیٹھا ہوں

کیا خبر کب ادھر وہ آ نکلے
رات دن در کھلا ہی رکھتا ہوں

جز خزاں میں نے کچھ نہیں دیکھا
اور بہاروں کے گیت گاتا ہوں

اُس گلِ ناز کی تمنا میں
خارزاروں کو دیکھ آیا ہوں

جس کی خاطر سفر پہ نکلا تھا
میں وہ منزل بھی چھوڑ آیا ہوں

دشمنوں سے شریف کیسے کہوں
دوستوں کے ستم کا مارا ہوں

جبرئیل صدیقی

کیا سیاہی رات کی حل ہو گئی
چاندنی کس طرح بادل ہو گئی
زندگی میری مبدّل ہو گئی
کیا اجل دورِ مسلسل ہو گئی
بادلوں کا رات نے اوڑھا لحاف
اب کتابِ شب مکمّل ہو گئی
کس نے یہ سورج پہ قبضہ کر لیا
رات کیوں دورِ مسلسل ہو گئی
دفترِ دوراں میں آیا انقلاب
صبح کی آمد معطّل ہو گئی
موت کو فرصت فریضے سے ملی
زندگی اپنی جگہ شل ہو گئی
دن کہیں سورج دکھا کر چل دیا
رات ذہنوں میں مقفّل ہو گئی
تیرگی جبرئیل گہری شب میں تھی
چاندنی پھیلی تو پاگل ہو گئی

علی ظہیر منہاس

○

صد حیف رسد گاہِ سفر تک نہیں پہنچا
بے حال پرندہ تھا، شجر تک نہیں پہنچا

تاریک خلاؤں میں وہ مارا گیا شب خوں
جو صبح کا تارا تھا، سحر تک نہیں پہنچا

کیا سوچ کے جنت سے نکل آیا تھا انساں
صدیوں کا مسافر ابھی گھر تک نہیں پہنچا

خوں ہو گئی خواہش تو یہ ہمت کی کمی تھی
پھر ہی کوئی شاخِ ثمر تک نہیں پہنچا

آئینہ در آئینہ ہے جس چہرے کا چرچا
وہ عکسِ رواں دیدۂ تر تک نہیں پہنچا

ہم پی تو گئے ہیں ترا غم گھول کے لیکن
یہ زود اثر زہر جگر تک نہیں پہنچا

دن چڑھتے ہی گو دھوپ کا سیلاب تو امڈا
کرنوں کا بھنور روزنِ در تک نہیں پہنچا

ہم چاہیں تو کر سکتے ہیں سمتوں کا تعین
چڑھتا ہوا پانی ابھی سر تک نہیں پہنچا

صحرا کو ہمیں آبلہ پا جائیں گے منہاس
بادل کبھی پیاسوں کے نگر تک نہیں پہنچا

مقبولؔ احمد

محرومیٔ حالات کی تصویر بنا دے
کچھ تو مرے ناکردہ گناہوں کی سزا دے

ہے قتل گہِ صبح کا منظر مرے آگے
اے شامِ الم روزنِ دیوار بجھا دے

ہر سمت مسلط ہے یہاں حبس کا عالم
آواز دے شاید کوئی زنجیرِ صدا دے

ہے بکھرا ہوا آج بھی شیرازۂ قربت
اس صورتِ حالات میں دل کس کو صدا دے

اب ظلمتِ شب آخری لمحوں پہ کھڑی ہے
اب شدتِ احساس کی زنجیر ہلا دے

میں وقت کے جلتے ہوئے صحرا میں گھرا ہوں
اے جانِ تمنّا مجھے زلفوں کی ہوا دے

مقبولؔ مرے دم سے فروزاں ہے محبّت
یہ دشت مری آبلہ پائی کو دعا دے

حسینِ سحر

کرن کرن کے درخشندہ باب میرے ہیں
تمام روشنیوں کے نصاب میرے ہیں

شبوں کے سبز جزیرے ہیں سب مری اقلیم
تمام جاگتی آنکھوں کے خواب میرے ہیں

میں ہوں تمام دھڑکتے دلوں کا شیدائی
یہ آبگینے یہ نازک حباب میرے ہیں

جو نفرتیں ہیں تو منسوب اہلِ زر کے نام
محبّتوں کے ہیں جو انتساب میرے ہیں

تمام عمر تخاطب مرا مجھی سے رہا
سوال میں نے کیے ہیں جواب میرے ہیں

خدائے دشت کی تقسیم پہ میں راضی ہوں
کہ آب پارے ترے ہیں سراب میرے ہیں

نصیب آج ہیں کانٹے اگر تو کیا غم ہے
ہنسی رتوں کے شگفتہ گلاب میرے ہیں

میں آفتاب کی مانند ہوں نقیبِ سحر
سیاہیوں پہ سبھی احتساب میرے ہیں

صابرہ آفاقی

○

جانتا ہوں ایک مشکل مرحلہ بھی آئے گا
پر اسی سے دل میں تازہ ولولہ بھی آئے گا

دوستی اپنی جگہ، پر صحن سے رستہ نہ دو
ایک کو آنے دیا تو دوسرا بھی آئے گا

آب و دانے پر یونہی لڑتے رہے تو ایک دن
تھیلیوں میں لیکے مستقبل ہُما بھی آئے گا

گو بھٹکتے تھے مگر اس بات پر تھے مطمئن
خارزاروں سے گزر کر راستہ بھی آئے گا

رہ نہیں سکتا کبھی محروم نغمہ یہ شجر
میں اڑا تو کوئی میرا ہمنوا بھی آئے گا

اب اسی امید پر جیتے ہیں ہم اہلِ وفا
زندگی ہوگی تو پھر عہدِ وفا بھی آئے گا

صابرہ آفاقی نہ رکنا ایک لحظہ دشت میں
اس سے آگے ایک منظر دلکشا بھی آئے گا

کاوشؔ بٹ

ریا سے پہلو بچا کے رکھنا۔ وفا کا دامن سجا کے رکھنا
یہ اقتضائے ہنر وراں ہے اسے گلے سے لگا کے رکھنا

نئی صدی کو گئی صدی کے عذاب بخشش میں ملے ہیں
نئے عذابوں کا لمحہ لمحہ نظر نظر میں سما کے رکھنا

ازل سے تقسیم ہو رہے ہیں خوشی کے لمحات ہم نشینو
چراغِ امید بجھ نہ جائے اسے ابد تک جلا کے رکھنا

لطیف جذبوں کے راستوں میں کوئی بھی لغزش نہ آنے پائے
رہِ وفا میں سنبھل سنبھل کر قدم نہ اکھڑے جما کے رکھنا

ملول چہروں سے پیار کرنا ہماری پہچان بن چکی ہے
اداسیوں کے خلاف لڑنا مسرتوں سے بنا کے رکھنا

یہ زرد موسم ہمارے جسموں کا خون پی کر جواں ہوا ہے
جو ہو سکے تو قبیلے والو سلگتے جذبے بچا کے رکھنا

ابھی چمن میں مہیب تاریکیوں کے جنگل اگے ہوئے ہیں
گلاب موسم کی جستجو کو دلوں کی دھڑکن بنا کے رکھنا

سکونِ دل سے فروغِ دماغ ملتا ہے
جنوں سے راہِ خرد کا سُراغ ملتا ہے

ہمارے دل پہ تصرّف ہے چشمِ ساقی کا
مئے طہور کا ہم کو ایاغ ملتا ہے

اسیرِ کنجِ قفس ہیں طیورِ صحنِ چمن
گلوں کے پاس گلستاں میں زاغ ملتا ہے

ہماری آبلہ پائی کا یہ کرشمہ ہے
جہاں تھا دشت وہیں صحنِ باغ ملتا ہے

قمر ہیں یا گل و لالہ ہیں یا مرے دل ہیں
تجھے خبر ہے جہاں تیرا داغ ملتا ہے

ابھی خرد کے اندھیروں کا ڈر نہیں ہم کو
کہیں کہیں ابھی دل کا چراغ ملتا ہے

مجھے عزیز نہ ہو کیوں غمِ حبیب قمر
یہی وہ غم ہے کہ جس فراغ ملتا ہے

سہیل اختر

سوچ کی آگ میں جلتے صدیاں بیت گئیں
وقت کو رنگ بدلتے صدیاں بیت گئیں
جانے ہماری قدر کرے گی کب دنیا
ہمیں تو لعل اگلتے صدیاں بیت گئیں
اب تو ملن کے پھول مری پلکوں پہ سجا
امیدوں سے بہلتے صدیاں بیت گئیں
جانے افق سے صبحِ مسرت کب پھوٹے
ہجر کی رات کو ڈھلتے صدیاں بیت گئیں
ترکِ وفا کی دل سے ٹھانی تھی لیکن
زلف کے خم سے نکلتے صدیاں بیت گئیں
جاگ تو اٹھے تیرے خوابوں سے لیکن
آنکھیں ملتے ملتے صدیاں بیت گئیں
تو ہی کسی منزل سے صدا دے اب تو ہمیں
ہم کو تو چلتے چلتے صدیاں بیت گئیں
قرب کے اک لمحے کے لیے اے جانِ سہیل
کرب کا زہر نگلتے صدیاں بیت گئیں

ثروت حسین

میرے تیر مجھے لوٹا دو میرا ترکش خالی ہے
ابھی ابھی اک اور قیامت مجھ پہ ٹوٹنے والی ہے

ماہی گیر نہیں ہوں لیکن شاعر تو کہلاتا ہوں
بہتے دریا تیرے تٹ پہ جھونپڑی ایک بنالی ہے

مٹی کے اس معمورے میں سبز سنہرے خوشے لاتی
میرے اندیشے کی ان ہے یا پھر ہل کی پھالی ہے

چھت کے نیچے سونے والے سوداگروں کو کیا معلوم
سیارے پہ آنے والی رات بہت ہی کالی ہے

تیس برس کے سناٹے میں ثروت جسکو بھول نہ پائے
کہتے ہیں وہ اچھے دل اور اچھی آنکھوں والی ہے

لطیف ساحل

حقیقت تک رسائی چاہتا ہوں
میں کب ساری خدائی چاہتا ہوں
خوشی بھی مجھکو راس آتی نہیں ہے
غموں سے بھی رہائی چاہتا ہوں
خزاں میں شاخ سے گل جیسے بچھڑے
میں یوں تجھ سے جدائی چاہتا ہوں
مرے اندر چھپا ہے میرا دشمن
میں کب اپنی بھلائی چاہتا ہوں
مرے ہونٹوں پہ کلیاں کھل اٹھی ہیں
میں پھر شعلہ نوائی چاہتا ہوں
ہجومِ دوستاں بیگانہ رُو ہے
کسی سے آشنائی چاہتا ہوں
گنوا بیٹھا ہوں سب کچھ پھر بھی ساحل
وہی فرماں روائی چاہتا ہوں

جانؔ کاشمیری

فکر کی پرکار سے یوں کھینچ دل پر دائرے
بھول کر بھی تو نہ بھولے زندگی بھر دائرے

موت کیا! اک دائروں کے سلسلے کا خاتمہ
زیست کیا ہے دائرے، در دائرے، در دائرے

گول چہرہ، گول آنکھیں، گول بازو، گول تل
غور سے دیکھو تو دلبر ہے سراسر دائرے

سات آدھے دائروں کا نام ہے قوسِ قزح
دے رہے ہیں رنگ بھر کے ہم کو چکّر دائرے

آتے آتے طبعِ موزوں میں روانی آ گئی
رفتہ رفتہ ہو گئے نقطے سمٹ کر دائرے

لاکھ پھیلیں، لاکھ سمٹیں زندگی کی قوس میں
چھوڑتے ہرگز نہیں ہیں اپنا محور دائرے

لا سکا کوئی نہ جانؔ آنکھوں کی پتلی کا جواب
گو تراشے لاکھ ہیں بہتر سے بہتر دائرے

انور شعور

اصرار کہاں کرواتا ہے ۔۔۔ جسے آنا ہو آجاتا ہے
تری قامت عام سی ہے لیکن ۔۔۔ شمشاد بہت شرماتا ہے
وہی شخص جو دوڑ کے ملتا تھا ۔۔۔ کہیں دیکھے تو کتراتا ہے
مجھے باہر آنے جانے پر ۔۔۔ کوئی اندر سے اکساتا ہے
تری صورت دیکھی ہے جب سے ۔۔۔ مجھے پھول نہایت بھاتا ہے
یہی ریت رہی ہے دنیا کی ۔۔۔ کوئی آتا ہے کوئی جاتا ہے
یہی دھرتی میرا تاج محل ۔۔۔ یہی دھرتی میری ماتا ہے
کبھی چھاتی میں چاپ اٹھتی ہے ۔۔۔ کبھی کاگا شور مچاتا ہے
یہ اپنی اپنی فطرت ہے ۔۔۔ کوئی روتا ہے کوئی گاتا ہے
غمِ جاناں ہے وہ بلا جس سے ۔۔۔ غمِ دوراں بھی گھبراتا ہے
مری حالت پر جو ہنستے ہیں ۔۔۔ مجھے ان پر رونا آتا ہے
کسی پھول بھری ٹہنی کی طرح ۔۔۔ مرے پیڑ پہ وہ لہراتا ہے
سب رات کو جب سو جاتے ہیں ۔۔۔ کوئی چپکے سے آجاتا ہے
ترے سُر ساگر کی لہروں پر ۔۔۔ مرا دل دریا بل کھاتا ہے

کیسے ہم سے کوئی کام شعور
کوئی آتا ہے نہ بلاتا ہے

نذیر احمد ظفر

خوشبو میں مہکی یاد اُن کی اک تازہ ہوا کا جھونکا ہے
جب دھیرے دھیرے آپہنچے لگتا ہے کوئی گل مہکا ہے

لوگوں سے ہنس کر ملتا ہوں اور روح سلگتی رہتی ہے
جب زخم ہو تازہ اندر سے خون اندر اندر رستا ہے

اک چیخ فضاؤں میں گونجی، اک جسم ہواؤں میں بکھرا
کیا خوب نشانہ بازی کا اعزاز کسی نے پایا ہے

میں چہروں کے جنگل میں گم، تو گھر کی چاردیواری میں
میں کتنا کھویا کھویا ہوں تو کتنا تنہا تنہا ہے

یہ رنگ سنہری، مست آنکھیں، یہ گال گلابی کب تک ہیں
سائے بھی بڑھ بڑھ آتے ہیں جب شام کو سورج ڈھلتا ہے

لے جائے جہاں بھی جی چاہے پھر کون ہوا کو روکے گا
لاوارث بچوں کی صورت جب شاخ سے پتا جھڑتا ہے

ان راتوں کو رویا تو کیا، موسم موسم بکھرا تو کیا
خوشبو کے پیراہن والا وہ شخص تو ہنستا بستا ہے

کل میرے گھر کے باہر ہی کوئی پوچھ رہا تھا میرا پتا
کیا جانوں کس نے بتلایا، اک شخص ظفر ہے تنہا ہے

صابرہ وسیم

پلکوں پہ رہ کر کیا پھیل گیا
ہر سمت دھواں سا پھیل گیا

مری ریکھا پوش ہتھیلی پر
اک شام کا سایا پھیل گیا

جو حرف چھپایا لوگوں سے
وہ چہرہ بہ چہرہ پھیل گیا

ترا نام لیا تو صحرا میں
اک سایا اُترا پھیل گیا

اس میرے اور خلا کے بیچ
اک ہجر کا لمحہ پھیل گیا

جب نئے سفر پر نکلا میں
رستوں پر صدمہ پھیل گیا

شاموں کی سُرخی سمٹ گئی
راتوں کا قصّہ پھیل گیا

میں پیاس بجھانے پہنچا تو
دریا میں صحرا پھیل گیا

اس ارض و سما کی وسعت میں
دکھ تیرا میرا پھیل گیا

آذر نایاب بدایونی

غمِ تنہائی کا اس طرح ازالا کر لو
اپنے سایے سے لپٹ جاؤ اجالا کر لو

بزدلی سے کسی مشکل کو ہمالا کر لو
جرأتیں ہوں تو اسے روئی کا گالا کر لو

تیرہ بختی میں اسی طور اجالا کر لو
درد چاند دلِ زار کو ہالا کر لو

لوگ پہچانیں اگر میرے حوالے سے تمہیں
وقف میرے لیے تم اپنا حوالا کر لو

اپنے شعروں میں بیاں کر کے مسائل اپنے
لطف اشعار کو بہتر ہے دوبالا کر لو

یہی سکہ جو مشقت سے کماؤ تو ہے رزق
بے مشقت کے اسے ہاتھ کا چھالا کر لو

فن میں آذر ہے روا کوئی تکلف نہ لحاظ
شعر کو ڈھال کرو طنز کو بھالا کر لو

انساں نیرز

کل کسی نے کہا محبت سے
نام اپنا بھی لو عقیدت سے

خواب تھے اختیار میں اُن کے
رہ گئے رتجگے وہ قسمت سے

میں نہیں ہوں تو میرا نام بھی کیا
تم محبت سے لو یا نفرت سے

حسنِ اظہار ہے تو وہ لڑکی
کس لیے دیکھتی ہے وحشت سے

نہ محبت رہی نہ عزّت ہی
عشق کرتے رہے جو عزّت سے

شام دیکھی جو خوبصورت ایک
پھر کوئی یاد آیا شدت سے

نعیم اطہر

وہ مجھ میں رہتے ہوئے مجھ سے ماورا کیوں ہے
وجود رکھتے ہوئے بھی وہ خواب سا کیوں ہے

ترا جمال حقیقت کے خواب دیکھے مجھے
خیال بن کے سراتوں میں کھو گیا کیوں ہے

وہ روشنی جسے کہتی ہے پیار یہ دنیا
مری حیات سے آخر گریزپا کیوں ہے

گریں گی اور بھی کیا بجلیاں تمنا پر
دیارِ صبر پہ بادل جھکا ہوا کیوں ہے

بہا تو دی تھی مری راکھ میرے اشکوں نے
جو میں نہیں ہوں تو پھر سیلِ ابتلا کیوں ہے

لگا گیا ہے کوئی تن بدن میں ہجر کی آگ
نہ جانے پھر مرا چہرہ بجھا بجھا کیوں ہے

ہجومِ شوق میں یہ بے حسی ہے کیوں اطہرؔ
وفا کے شہر میں یہ حشر سا بپا کیوں ہے

انیس انصاری

(۱)

تمہیں خبر ہے کیا گزری ہے وصل شبوں کے آنے تک
پتے بازی ہار چکے تھے سبز رتوں کے آنے تک

جیسے جلتی ریت پہ بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے
یوں بھی کبھی اس آنگن اترو خواب دنوں کے آنے تک

نرم ہواؤ جب شاخوں کو چھو کر گزرو تو کہنا
ہجر چتا میں وہ بھی جلے گا نئے پروں کے آنے تک

یہ سپنے آئینے ہیں اے جاگتی آنکھوں خبر رہے!
ریزہ ریزہ ہی نہ ہو جائیں نیندوں کے آنے تک

ان بے نام نشاں قبروں میں رہنے والو بتلاؤ
کیا کھویا کیا پایا ان ویران گھروں کے آنے تک

وہ تو ہر شب اندھیارے کی چادر اوڑھ کے سویا ہے
جس سورج کو تم نے پوجا جان لبوں کے آنے تک

جان کسی کے عالم میں ہم بے پرسان حال انیسؔ
مٹی کا اک ڈھیر ہوئے تھے چارہ گروں کے آنے تک

نکہتؔ بریلوی

○

غبارِ راہ کی مانند رہگذار میں ہیں
ہمارا کیا ہے بھلا ہم بھی کس شمار میں ہیں
اگر وہ غیر کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں تو کیا
ہم اپنے آپ بھی کب اپنے اختیار میں ہیں
ہمارا عالمِ حسرت بھی ہے عجیب کہ ہم
گزر گئے ہیں جو دن اُنکے انتظار میں ہیں
زمانہ اپنی حدوں سے نکل کے پھیل گیا
اور ایک ہم کہ ابھی اپنے ہی حصار میں ہیں
یہ اپنا شہر اندھیروں کا شہر ہے شاید
بڑے عذاب یہاں روشنی سے پیار میں ہیں
وہ جانِ بزم گیا و نقش تمام ہوئیں
یہ لوگ کس لیے بیٹھے ہیں کس خمار میں ہیں
عجب فضائیں ہیں نکہتؔ کھلا نہ کچھ ہم پر
یہ اپنا گھر ہے کہ میدانِ کارزار میں ہیں

مجید عالم

○

مشکل بہت ہے گرمیِ بازار دیکھنا
بکتے ہیں صبح و شام خریدار دیکھنا

دل میں کسی کی یاد کو بیدار دیکھنا
ہیں جاگنے میں خواب کے آثار دیکھنا

اب آنے والی نسل ثمر کیسے پائے گی
کتنے علیل ہو گئے اشجار دیکھنا

تم کر چکے ہو وار نقابیں اتار دو!
اب میں کروں گا وار مرا وار دیکھنا

مشقِ سخن میں عمر گزاری مگر ہمیں
آیا نہیں سلیقۂ اظہار دیکھنا

صفدر صدیق رضی

○

دیواروں سے پیڑ کا سایا بہتر ہے
دشت انا میں یہ سرمایا بہتر ہے

اس سے تعلق ہے تو خاموشی اچھی
رابطۂ جاں ہے تو کنایہ بہتر ہے

شہر کے ہر در پر دستک دے آیا ہوں
میرے لیے تجھ سا ہمسایہ بہتر ہے

اس کی رفاقت کے دشوار مراحل سے
اس کے خیالوں کا سرمایا بہتر ہے

تن اجلا من میلا اور چہرہ بے رنگ
آج کے انساں سے چوپایہ بہتر ہے

احمد ضیاؔ

(۶)

اک نئے دور کی اساس ہوئے
حرف میرے جو ناسپاس ہوئے

ہیں یقیں کی طرح سہی لیکن
میرے بارے میں بھی قیاس ہوئے

حادثے جو نہ ہو سکے تھے کبھی
موسمِ گل کے آس پاس ہوئے

خواب تھے خواب کو بھلا دینا
خاک تھے خاک کا لباس ہوئے

ان کی محفل میں حالِ دل کہہ کر
کس قدر آج ہم اداس ہوئے

کتنی عریانیوں کے بعد ضیاؔ
لوگ آسودۂ لباس ہوئے

عتیق جیلانی

میں نے جس کو چاہا کیا وہ مجھ سے محبت رکھتا تھا
یا بس چاہنے والوں سے ملنے کی عادت رکھتا تھا

اس کے رخصت ہونے پر تو بام و در بھی روتے ہیں
ہم جیسوں کو وہم کہ وہ ہم ہی سے رفاقت رکھتا تھا

اس کی قربت میں چاہت سیراب نہیں ہو پاتی تھی
اکثر ملتے رہنے پر بھی ہجر کی حالت رکھتا تھا

اس کے جی (میں بھی) اندیشے زہر جگاتے تھے لیکن
گہری نیلی آنکھوں میں خوش خواب حرارت رکھتا تھا

مدت بعد اسے اس حال میں دیکھا تو جی بھر آیا
روتا تھا جب آئینے میں اپنی صورت رکھتا تھا

اقبال ارشد

چراغ دل کا جلا دیا ہے گلاب منظر بنا دیا ہے
فصیلِ شب میں بھی ہم نے اپنے وجود کا در بنا دیا ہے

نئی محبت نے آنسوؤں کو نئے معانی عطا کیے ہیں
جسے سمجھتے تھے لوگ صحرا اسے سمندر بنا دیا ہے

نہ چاند میں وہ کشش رہی ہے نہ دلربائی ہے چاندنی میں
خلا کے بے حس مسافروں نے ہمیں بھی پتھر بنا دیا ہے

یہ کس نے بخشی ہے بارشوں کو نگاہِ دنیا پرست ایسی
کسی کو موتی بنا دیا ہے کسی کو کنکر بنا دیا ہے

کنارِ دریا خدا کی بستی، بہار موسم کا آئینہ تھی
شکاریوں نے اسے بھی اپنے شکار کا گھر بنا دیا ہے

گھرا ہوا ہے ازل سے اب تک طلسمِ دنیا کے دائروں میں
مذاقِ فطرت نے آدمی کو زمیں کا محور بنا دیا ہے

خموش آنکھوں کی سحرکاری بجا نجانے کب تک رہے گی طاری
جو گھر سے نکلے تھے اپنی دھن میں انہیں سخنور بنا دیا ہے

نظر میں خوابوں کے سلسلے ہیں زباں پہ مبہم سے تذکرے ہیں
ہمیں بھی شاید کسی نے ارشد جنوں کا پیکر بنا دیا ہے

محمد طاہر

○

گلاب بن کے مری روح میں کھلا ہی رہا
وہ ایک شخص جو مجھ میں سدا چھپا ہی رہا

پگھل رہا تھا مرا دل کسی کے غم پہ مگر
انا پرستی کی خاطر میں بت بنا ہی رہا

مرا حریف جو جیتا تو آپ خوش کیوں ہیں؟
مری شکست میں نقصان آپ کا ہی رہا

مرے اور اس کے گھروں کی تھی مشترک دیوار
دلوں کے بیچ مگر اپنے فاصلہ ہی رہا

میں ریزہ ریزہ ہوا بھی تو اس قرینے سے
کہ دل کے آئینہ خانے میں تو بسا ہی رہا

میں اس کے بارے میں کس طرح تبصرہ کرتا
مرے شعور میں آ کر بھی جو چھپا ہی رہا

ملاپ اس کی نظر میں فنا کا لمحہ تھا
اسے بقا کی تمنّا تھی وہ جدا ہی رہا

مرا خلوص بھی اس کو نہ کر سکا تبدیل
وہ بے وفائی کا پیکر تھا بے وفا ہی رہا

خوشی ملی تھی مگر جیسے اجنبی کا سلام
غم آشنا تھا میں طاہرؔ غم آشنا ہی رہا

نثار محمد نثارؔ

○

دور سے کتنے بھلے لگتے ہیں بیگانے مجھے
یاد پھر بھولے ہوئے آتے ہیں افسانے مجھے

زندگی آخر یہ کس منزل کی جانب لے چلی
ہر قدم پہ راستے ملتے ہیں انجانے مجھے

میکدے میں حشر ہوگا میری توبہ سے بپا
دیکھنا کیا کیا کہیں گے تیرے دیوانے مجھے

اجنبی راہوں سے گزرا تھا میں راہ دوستیں
پھر بھی کچھ راہی ملے تھے جانے پہچانے مجھے

انقلابِ وقت نے یہ دن دکھایا ہے نثارؔ
اب تو اپنے بھی نظر آتے ہیں بیگانے مجھے

سرور خالد

وہ شخص جس کا تھا صدیوں سے انتظار مجھے
مجھے ملا تو لگا وہ بھی سوگوار مجھے

کہاں کہاں نہ سکونِ تلاش کی خاطر
لیے پھرا ہے مرا قلبِ بیقرار مجھے

مرے دکھوں کا مداوا نہ کر سکا کوئی
صلیبِ درد پہ لٹکا ہوں آ، اتار مجھے

نگار خانۂ ہستی میں کھو گیا ہوں کہیں
زمیں کے چاند کبھی آ کبھی پکار مجھے

وہ ایک سنگِ صدا جو کہ تو نے پھینکا تھا
وہ کر گیا ہے حقیقت سے آشکار مجھے

چمن میں جب سے مرے جنوں کی بات چلی
نگاہِ شوق سے تکتا ہے خار خار مجھے

نہ جانے کب سے ہوں بیکل میں تیری فرقت میں
چلا بھی آ کہ کسی کل نہیں قرار مجھے

سکوتِ شب ہو لبِ جو کہ چاندنی راتیں
ترا خیال ستاتا ہے بار بار مجھے

نہ جانے کون سا غم کھا گیا اسے خالدؔ
ملی ہمیشہ مری زیست سوگوار مجھے

اسلم کوسری

○

آرزو کا مزار ہے، میں ہوں
دیدۂ اشکبار ہے، میں ہوں

آخری شب ہے اور کمرے میں
خواہشوں کا غبار ہے، میں ہوں

چشم پر افتخار ہے، وہ ہے
دلِ بے اختیار ہے، میں ہوں

ریت کا ایک تپتا ٹیلا ہے
منتظرِ شہر یار ہے، میں ہوں

جیسے بوتل میں بند ہو جگنو
اک طلسمی حصار ہے، میں ہوں

پھر وہی بے کلی، گلی، چوکھٹ
آہٹوں کا شمار ہے، میں ہوں

جیسے جنگل میں بے زباں بچّہ
بے حسی کا دیار ہے، میں ہوں

ہر صدی کے لہو میں سرگرداں
ساعتِ سوگوار ہے، میں ہوں

کب سے اس کی تلاش میں اسلمؔ
میری زخمی پکار ہے، میں ہوں

قیصر افغانی

جب بھی کھلتے ہوئے محلوں کے دریچے دیکھے
جھانکنے والے نگاہیں کیے نیچے دیکھے

اس نے یہ کہہ کے نقابِ رُخِ زیبا اُلٹی
دیکھنے والا کوئی آنکھ نہ میچے دیکھے

ہم نے کلیاں بھی چنیں شاخ سے گل بھی توڑے
موسمِ گل میں کئی باغ بغیچے دیکھے

پھر نہ قسمت سے گلہ ہو نہ خدا سے شکوہ
آدمی سطح سے اوپر نہیں نیچے دیکھے

ظاہر نوری

○

نہ تو گماں کی طرح ہے، نہ بے گماں کی طرح
مگر ہے دل میں مکیں دل کے رازداں کی طرح

ترا وجود ہے وسعت میں لامکاں سے کہیں
مرا وجود بھی ہے دشتِ بیکراں کی طرح

وہ ایک لمحہ جو گزرا ہے تیری قربت میں
عزیز تر ہے مجھے اپنے جسم و جاں کی طرح

یہ درد و کرب کے رشتے عجیب رشتے ہیں
کبھی نویدِ بہاراں کبھی خزاں کی طرح

وہ ایک لفظ جو سچائیوں کا ضامن ہے
کہ وسعتوں میں ہے ناگفتہ داستاں کی طرح

قدم قدم پہ کیا جس نے زخمِ دل تازہ
ملا ہے شہر میں وہ شخص مہرباں کی طرح

ہوا ہے مدمقابل کبھی جو آئینہ
لہو بکھر گیا چہرے پہ کہکشاں کی طرح

یہ کیا ستم ہے کہ اس شہرِ درد میں ظاہر
زمیں بھی ہم سے گریزاں ہے آسماں کی طرح

سمیع آلوری

ہماری آنکھ نم ہو بھی تو کیوں ہو
کوئی رنج و الم ہو بھی تو کیوں ہو

بہت دوری ہے تم میں اور ہم میں
یہ دوری آج کم ہو بھی تو کیوں ہو

ہوئی جب بے نیازِ آستانہ
جبیں پھر آج خم ہو بھی تو کیوں ہو

نہ ہو جب احترامِ آدمیت
کوئی پھر محترم ہو بھی تو کیوں ہو

جو مسلک تم نے اپنایا ہوا ہے
وہی میرا دھرم ہو بھی تو کیوں ہو

اکبرؔ معصوم

تِرے بدن کی کثافت تو چاٹ لیتا میں
پھر اس کے بعد مقدس تجھے سمجھتا میں

تو وہ کہ لوگوں کے معیار سے بھی اونچا تُو
میں وہ کہ اپنے ہی معیار پر نہ اترا میں

وہ روشنی میں مرے پاؤں کو لگی ٹھوکر!
کچھ اور زور سے گرتا اگر سنبھلتا میں

مرا رقیب بھی آئے مری حمایت میں
اب اپنے آپ سے کب تک لڑوں اکیلا میں

لگائے رہتیں مری سمت کان دیواریں
ذرا سی دیر بھی پھر خود سے بات کرتا میں

مجھے وہ صبح کا بھولا نہ کہہ سکے معصومؔ
جبھی تو شام سے پہلے ہی لوٹ آیا میں

شہنشاہ علی ساغر

یہ راہ نفس کس رہِ دشوار سے کم ہے
ہستی کا سفر کیا کسی آزار سے کم ہے

ہر لمحہ رہا کرتا ہے اک موت کا دھڑکا
زنداں کی فضا کیا رسن و دار سے کم ہے

یہ شب کی سیاہی تری زلفوں سے ہے محجوب
یہ حسن سحر کا ترے رخسار سے کم ہے

دیکھا ہے محبت کی کڑی دھوپ میں رہ کر
ہر سایۂ تر سایۂ دیوار سے کم ہے

کس واسطے حسرت ہو مجھے خلد بریں کی
جب خلد بریں کوچۂ دلدار سے کم ہے

ہر چند کہ ہم تیغ کے قائل سہی لیکن
یہ تیری نظر کیا کسی تلوار سے کم ہے

روٹھے ہوئے یاروں کو وہ کیوں روز منائے
ساغر بھی ترا کیا کسی خوددار سے کم ہے

زاہد راٹلوی

○

رنگ ہنسنے میں سنجیدگی کا
حسنِ اظہار ہے آگہی کا

میرا دل بھی ذرا دیکھ لینا
کام کرتے ہو شیشہ گری کا

کم نظر روشنی ڈھونڈتے ہیں
راستہ چھوڑ کر راستی کا

وقت تم پر بہت مہرباں ہے
امتحاں کیسے دوں دوستی کا

پہلے پُرپیچ راہوں سے گزرو
دینا الزام پھر کجروی کا

اک نظر آپ کا دیکھ لینا
کام کرتا ہے چارہ گری کا

میرے اعمال نامے نے زاہدؔ
نام چمکا دیا تیرگی کا

ماہ طلعت زاہدی

○

باقی کچھ بھی رہا نہیں ہے
اور یہ غم بھی نیا نہیں ہے
اُن آنکھوں میں خواب تھا میرا
بوجھ یہ دل سے ہٹا نہیں ہے
شوق کا دامن کیسے چھوڑوں
خون رگوں میں جما نہیں ہے
کتنی بار پکارا ـــــ کس کو!
سنّاٹے نے سُنا نہیں ہے
گزر گئی بے تابی حد ـــــ سے
اب ہونٹوں پہ دعا نہیں ہے
آنے والی کل کا دھڑکا
آج کا دن بھی کٹا نہیں ہے
دُکھ کی رات بھی کٹ جائیگی
سکھ کا دن بھی رکا نہیں ہے
ان دیکھی گردش میں سب ہیں
یوں ـ کچھ بھی ماورا نہیں ہے

ـــــ ⁖ ـــــ

ضمیر اظہر

○

اب یہ حال ہوا ہے غم سے
رک جاتا ہوں چلتے چلتے
چبھتی ہے گاہے دھوپ سہانی
ڈستے ہیں گاہے سائے شجر کے
سوچ سی دل میں بل کھاتی ہے
رہ جاتا ہے سر چکرا کے
یاد آتے ہیں الجھن بن کر
پیار کے بھولے بسرے لمحے
یاروں سے کچھ درد کی باتیں
کچھ شکوے مجبوریٔ دل کے
کھو گئے موت کی تاریکی میں
کتنے پیارے روشن چہرے
خاک ہوئیں کیسی تصویریں
مٹ گئے کیا کیا نقش سہانے
جاتے لوٹ کے کیوں نہیں آتے
جانے والے چھیل چھبیلے
یاد ہے غم ـ غم یاد ہے اظہر
سوجھ یہ آئی یاد میں ڈھل کے

— ∴ —

یعقوب غاؔور

بدلتے موسموں کا امتحاں ہے
یا میرے رتجگوں کا امتحاں ہے

مرے ساتھی نئے رستوں سے نا ڈر!
یہی تو حوصلوں کا امتحاں ہے

نہ گھبرانا اگر ہو سنگ باری
کشادہ آنگنوں کا امتحاں ہے

امیرِ شہر کی جاں پر بنی ہے
کہ اس کی لیاقتوں کا امتحاں ہے

نشاں کوئی بچا کے بھی نہ رکھا
پرانے دشمنوں کا امتحاں ہے

سمندر کی سطح سے ابر اٹھے
ہزاروں پانیوں کا امتحاں ہے

ابھی کچھ اور دے اے دینے والے
ابھی سے خواہشوں کا امتحاں ہے

بہت اے دوسروں پر ہنسنے والو
تمھارے آنسوؤں کا امتحاں ہے

رشید جمال

○

دیوانگی کی کوئی پذیرائی بھی نہیں
زنجیر میرے پاؤں میں پہنائی بھی نہیں

اس درجہ اپنی ذات میں محبوس ہو گیا
اب میرے ساتھ خود مری تنہائی بھی نہیں

جاؤں کہاں کہ ساری ہوائیں خلاف ہیں
اتروں کہاں کہ جھیل میں گہرائی بھی نہیں

تجھ سے جدا ہوا تو عجب حادثہ ہوا
اشکوں کے ساتھ آنکھ میں بینائی بھی نہیں

جس نے کہ میری روح کو پہنا دیا لباس
اس شخص سے تو میری شناسائی بھی نہیں

تنویر مشتاق

○

حرفِ زندہ مری زبان پہ ہے
یہ بھی احسان اک جہان پہ ہے

جستجو خود کی اور خیال ترا
بوجھ کتنا مرے دھیان پہ ہے

دھوپ کیسی ہے میرے ساتھ یہاں
کیسا سایا مرے مکان پہ ہے

جال پھیلے ہوئے ہیں چار طرف
نازہ پھر بھی اسے اڑان پہ ہے

موسمِ گل ہے کہ خزاں اے دل
درد کا ذائقہ زبان پہ ہے

رضوان قدیر

مکیں گھر میں عذابوں کی گھڑی ہے
محبت کی سزا کتنی کڑی ہے
چلا ہوں ڈھونڈنے صورت میں اپنی
مری تصویر کونے میں پڑی ہے
کہاں آتے ہیں لمحے مٹھیوں میں
اگرچہ ہاتھ میں پہنی گھڑی ہے
مسافر کو پتا کچھ بھی نہیں تھا
سڑک کن راستوں پر چل پڑی ہے
نہیں ہے کوئی بھی کردار جھوٹا
مصنف! داستاں اچھی گھڑی ہے
کسی کے سامنے رستہ نہیں ہے
کسی کے سامنے منزل کھڑی ہے
کہاں رضوان اب شکوے شکایت
مجھے اپنی اُسے اپنی پڑی ہے

ڈاکٹر عطاالرحیم

ہونٹوں کو سی لیں یہ آنکھوں سے کہنا
بڑی بات ہے سو یہ ہم جانتے ہیں
بگڑ جائے جب بات کیسے بنانا
نہ تم جانتے ہو نہ ہم جانتے ہیں

ہنسا کر رلانا رلا کر ہنسانا
یہی ہے بس اک کھیل ہم جانتے ہیں
مرا حال غیروں سے تم پوچھتے ہو
ادائے عداوت ہے ہم جانتے ہیں

ذرا تم پرسش کو آ جاؤ میری
زبانِ محبت بھی ہم جانتے ہیں
ذرا بات سنتے ہی فوراً بگڑنا
یہ بننا بگڑنا بھی ہم جانتے ہیں

سرور بجنوری

(۱)

بہارِ گل اضافہ کر رہی ہے اور الجھن میں
مناسب ہو تو دم بھر کیلیے آجاؤ گلشن میں

کہیں جلوہ، کہیں پردہ، ادھر محفل، اُدھر خلوت
زمانے کی ادائیں آگئی ہیں حُسنِ پُرفن میں

چمن والو مرے گریہ پہ تم دامن تو پھیلاؤ
مرے آنسو کھلا دیں گے ہزاروں پھول دامن میں

فضا رنگیں، ہوا میں تازگی، ماحول پُر رونق
بہاروں کی یہ آمد ہے کہ وہ آتے ہیں گلشن میں

سکون و امن کی گر جستجو ہے برق سوزاں میں
تکلّف بر طرف آکے رہے میرے نشیمن میں

یہاں تک آگیا بڑھ کر جنونِ شوقِ نظّارا
بیاباں ہی بیاباں دیکھتا ہوں صحنِ گلشن میں

کسی دلکش عمارت میں وہ حاصل ہو نہیں سکتا
طبیعت کو جو ملتا ہے سرورؔ اپنے نشیمن میں

رعنا ناہید رعناؔ

○

خوشبو ہو کہ تاروں کی ضیا ختم نہ ہوگی
دنیا سے کبھی رسمِ وفا ختم نہ ہوگی

لہرائے گی بے صوت سماعت کے اُفق پر
زندہ ہی رہے گی یہ صدا ختم نہ ہوگی

انسان کے احساس کو آتی ہی نہیں موت
دب جائے گی لیکن یہ انا ختم نہ ہوگی

ہم لوگ ضرورت ہی ضرورت ہیں بہر حال
مانگیں گے دُعا بھی تو دعا ختم نہ ہوگی

ماحول بدلتا ہے بدلتا ہی رہے گا
یہ ذہن کی تابندہ فضا ختم نہ ہوگی

اس دورِ پُر آشوب میں لینے دو ہمیں سانس
ہم سانس جو لیں گے تو ہوا ختم نہ ہوگی

یہ سانس بھی چلتی ہوئی تلوار ہے رعناؔ
کہتے ہیں جسے زیست وہ کیا ختم نہ ہوگی

شریف نیّر

مری وفاؤں کا ایسا بھی کیا صلہ دے گا
میں اس کو یاد رکھوں، وہ مجھے بھلا دے گا

گئے دنوں کو پکارے گا جب خیالوں میں
وہ میرا نام نہ لے گا مجھے صدا دے گا

میں اس کی یاد کے سب موسموں سے گزرا ہوں
ملا تو کون سی رُت کا مجھے مزا دے گا

وہ مجھ سے سارے تعلق بھی توڑ دے گا اگر
پھر اس کے بعد مجھے اور کیا سزا دے گا

مرے خیال کو وہ خال و خد عطا کر کے
مرے سخن کو بھی لہجہ کوئی نیا دے گا

رؤف امیر خانوی

○

بجھ گئے کوئے یار کے دیپک
جل اٹھے انتظار کے دیپک

رات بھر ٹمٹماتی ہیں آنکھیں
جیسے لوحِ مزار کے دیپک

سبز شاخوں پہ پھول جلتے ہیں
دیکھ فصلِ بہار کے دیپک

آؤ تاریک راستوں پہ رکھیں
طاقچوں سے اتار کے دیپک

نفرتوں کی ہواؤں کے آگے
ہم جلائیں گے پیار کے دیپک

مجھ کو کیا وہ رؤف ضو دیں گے
دور... دریا سے پار کے دیپک

اسلم شیخ

(۱)

دشمنوں کی بدظنی لطفِ عزیزاں میں ملی
تیرگی عفریت کی صورت چراغاں میں ملی

دل کو ہے مدت سے جس معراجِ فکری کی تلاش
رہبرِ جمہور میں پائی نہ سلطاں میں ملی

گھل گئی سیال ہو کر جسم میں وہ روشنی
جو بوقتِ میکشی تیرے شبستاں میں ملی

کسوتِ ثروت کی ساری دلربا شائستگی
فاقہ کش افراد کے چاکِ گریباں میں ملی

خوابِ ہستی میں سماعت کو تو کیا ملتا مگر
روح کی اک چیخ ماضی کے بیاباں میں ملی

اعجاز شاہد

(۱)

ہجر میں کیسی جاں پہ بنی ہے
سانس ہے یا نیزے کی انی ہے

اس کی گلی میں دل والوں کی
جاں دے کر ہی بات بنی ہے

یہ بھی کرم ہے اُس کی نظر کا
یوں مفلس دل میرا غنی ہے

ہم کو اپنے وطن میں یارو
کیوں احساسِ بے وطنی ہے

کس کی صورت ہے وہ شاہدؔ
دل پر جو تصویر بنی ہے

فراز صدیقی

کیا پوچھتے ہو دل میں میں کیا لیے پھرتا ہوں
ناکامیٔ حسرت کا لاشہ لیے پھرتا ہوں

کیا خوب صلہ بخشا مجھکو تری الفت نے
رسوائی کا دنیا میں تمغہ لیے پھرتا ہوں

اک زخم عطا کر کے تو بھول گیا مجھ کو
اب تک میں نگاہوں کو پیاسا لیے پھرتا ہوں

آتا ہے کہاں یارو بہروپ مجھے بھرنا
جیسا ہوں میں ویسا ہی چہرہ لیے پھرتا ہوں

ڈرتے تھے فرشتے بھی جس غم کو اٹھانے سے
کاندھوں پہ وہ بوجھ اپنے تنہا لیے پھرتا ہوں

اک روز گرا دوں گا میں رنگ محل تیرے
مزدور ہوں ہاتھوں میں تیشہ لیے پھرتا ہوں

نفرت کی چٹانوں کو رستے سے ہٹا دوں گا
تعمیر محبت کا نقشہ لیے پھرتا ہوں

اے کاش فراز اس کو کچھ ذوقِ سخن ہوتا
جس کے لیے غزلوں کا تحفہ لیے پھرتا ہوں

اختر سعیدی

۱

کیوں نہ چھیڑوں ذکر میں گزرے ہوئے لمحات کا
آگیا ہے پھر زمانہ موسمِ برسات کا
دوستو میں روشنی کو تیرگی کیسے کہوں
میری آنکھوں میں ہے منظر عرصۂ ظلمات کا
ڈس رہی ہے مدتوں سے میری تنہائی مجھے
تجھکو اندازہ نہیں شاید مرے جذبات کا
چھوڑ جائے تو مجھے سوداگروں کے بھیڑ میں
یہ تقاضا تو نہیں ہے گردشِ حالات کا
دوسروں پر خامہ فرسائی کروں ممکن نہیں
اب تلک ٹوٹا نہیں نشہ فریبِ ذات کا
یہ خبر شاید نہیں دیدہ ورانِ شہر کو
اس کا چہرہ آئینہ ہے میرے احساسات کا
خوش مزاجی سے گزارو زندگی کی ساعتیں
مانتے ہو کیوں برا اختؔر کسی کی بات کا

امجد قیصر

ہم ایسی آگ میں اتر کے کھڑے ہیں
جہاں شعلے تحفّظ چاہتے ہیں
گلی کے دو گھروں میں روشنی ہے
تو باقی چار گھر ویراں پڑے ہیں
وہیں تک ہے مقدر کی مسافت
جہاں تک دائرے کھینچے گئے ہیں
وہاں بودی گئیں لوہے کی کیلیں
جہاں نادار بچے کھیلتے ہیں
نظر چپ ہے زبانیں کٹ چکی ہیں
ہمارے ہاں کھلونے بولتے ہیں
محل کے حسن میں میرا لہو ہے
اگر نقشے سمندر پار کے ہیں
ذرا محتاط رہ معصوم تتلی
حسیں پودے لہو بھی چوستے ہیں
نئے موسم کی کلیوں کو نہ چومو
جڑوں میں زہر انڈیلے گئے ہیں
چمن میں اب بھی کوئل کوکتی ہے
مگر انسان پتھر ہو چکے ہیں

سیدہ علی اکبر نقوی

نحیف جسم، گھٹی سانس، ہڈیوں کے نشاں
یہی تو ہیں مرے گاؤں کے باسیوں کے نشاں

جوان بیٹی کی آنکھوں میں بے بسی کا لہو
ضعیف باپ کے ہاتھوں پہ پتھروں کے نشاں

نظر کے سامنے ہیں جس قدر اداس کھنڈر
یہی ہیں ماضی کی آباد بستیوں کے نشاں

دہک رہا ہے یہ سورج تو اس کی اندھی دھوپ
جلا نہ دے کہیں شاداب کھیتیوں کے نشاں

میں ڈوب کر ہی اجالوں سے ہمکنار ہوا
میں پا چکا ہوں تہِ آب گوہروں کے نشاں

کسی کا گرد میں لپٹا ہوا ضعیف بدن
بتا رہا ہے بہت سی مسافتوں کے نشاں

کچھ اس طرح تری یادوں کے عکس باقی ہیں
کہ جیسے ریت پہ رہ جائیں پانیوں کے نشاں

نصیر احمد نصیر

○

تیرے دوبارہ ملنے کا امکان سا رہا
جھوٹی تسلیوں پہ بھی ایمان سا رہا

اس کے شکست خوردہ چہرے کو دیکھ کر
میں جیت کر بھی دل میں پشیمان سا رہا

راستے نہ تیری مجھ سے کبھی مختلف ہوئی
تجھ سے کبھی الجھنے کا ارمان سا رہا

راہوں پہ لوگ لڑکھڑاتے ہیں آخر چراغ کیوں
وہ کور چشم سوچ کے حیران سا رہا

کوتاہیوں پہ اپنی مجھے فخر ہے نصیر
میرا طریقِ زندگی انسان سا رہا

سید فرحت عباس گیلانی

○

سوچ رہا ہوں تو اک بہتا دریا تھا
یا تو صبح کی کومل دھوپ کا چہرا تھا
کوئل گاتی تھی کلیاں مسکاتی تھیں
ویرانے میں یہ موسم بھی آیا تھا
شام ڈھلی تو سوچ زخمی زخمی تھا
شفق کا چہرہ سرخ لہو میں ڈوبا تھا
داناؤں کا قول ہے شوق کا مول نہیں
بھٹک رہا ہوں صحرا میں خود صحرا تھا
کس کی چاہت کھلتے پھولوں جیسی تھی
کون سحر کی مست پون کا جھونکا تھا
آ بیٹھے تھے ہر سو پنچھی دیوانے
میں نے مدھر سروں میں گیت الاپا تھا
لوگو میں تو چوری باندھ کے لائی تھی
بن کی کٹیا میں اک سادھو رہتا تھا

کاشف نعمانی

○

یونہی خلاؤں میں جھانکے گی یہ نظر کب تک
میں انتظار کروں بھی ترا مگر کب تک

جھلک رہا ہے افق سے وہ دیکھ صبح کا نور
مگر اے دردِ شب غم تری سحر کب تک

کبھی تو کام دکھائے گا زہر دوری کا
رکھے گا وہ تجھے پل پل سے باخبر کب تک

مفارقت کے زمانے بھی آئے جاتے ہیں
جدا نہ ہوں گے درختوں سے برگ و بر کب تک

نڈھال کر گئی خواہش افق کو چھونے کی
بدن کا ساتھ سنبھالے تو بال و پر کب تک

سراب شوق کی رہ پر چلے تو ہو کاشف
سفر سے لوٹ کے آؤ گے اپنے گھر کب تک

مقصود وفا

○

اب روٹھ کے جانے کی رتیں بیت چکی ہیں
اے دوست منانے کی رتیں بیت چکی ہیں

جو بھی ہے مرے دل میں مری آنکھ سے پڑھ لے
کچھ سننے سنانے کی رتیں بیت چکی ہیں

ہاں ڈھونڈ ہی لے کوئی بچھڑنے کا بہانہ
اب ساتھ نبھانے کی رتیں بیت چکی ہیں

گلشن میں ہر اک سمت ہی کانٹوں کو لگا دو
پھولوں کو اُگانے کی رتیں بیت چکی ہیں

کیوں میرے غموں کا ہی یہ موسم نہیں بیتا
باقی تو زمانے کی رتیں بیت چکی ہیں

تعبیر تو خیر اپنے مقدّر میں نہیں تھی
کیا خواب کے آنے کی رتیں بیت چکی ہیں!

آوارہ پھرو شہر کی سڑکوں پہ وفاؔ تم
گھر لوٹ کے جانے کی رتیں بیت چکی ہیں

عصری ادب

